قرآنی دعاؤں کی تشریح

حصہ اوّل

مفتی محمد تقی عثمانی
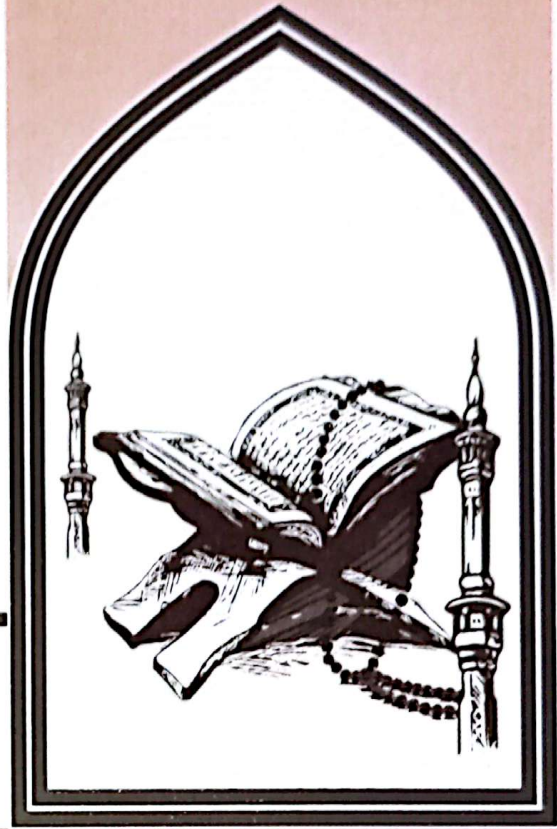
مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

قرآنی دعاؤں کی تشریح

جلد اوّل

مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی

نظر ثانی و تخریج

مولانا عنایت الرحمن

(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

باہتمام

ڈاکٹر مفتی محمد حسان اشرف عثمانی

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی، پاکستان- 75180

طبع جدید : محرم ۱۴۴۵ھ - جولائی ۲۰۲۴ء
ناشر : مکتبۂ معارف القرآن کراچی
فون : 92-21-35123130
35031565
0312-2592838
ای میل : info@mmqpk.com
mm.q@live.com
ویب سائٹ : www.mmqpk.com
www.maktabamaarifulquran.com

فیس بک سے خریداری کے لئے scan کریں
0300-2150304

ONLINE SHARIAH
www.SHARIAH.com
آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے

- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- دارالاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، کراچی / لاہور
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- فخر الدین کانچ والا، کراچی
- مکتبہ اصلاح وتبلیغ، حیدرآباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلیشرز، لاہور
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- دار الاخلاص، پشاور
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمرگرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- قرآن مجید محل، مردان

عرض ناشر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی اما بعد!

حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کو اللہ رب العزت نے ایک خاص ملکہ عطا فرمایا ہے کہ کسی بھی موضوع سے متعلق قرآن وسنت اور اکابر امت خصوصا علوم تھانوی وفیوض عارفی کا نچوڑ سامعین کے سامنے انتہائی سہل انداز میں پیش فرما دیتے ہیں جس سے ہر طبقہ بآسانی استفادہ کرسکتا ہے۔اور الحمد للہ حضرت والا دامت برکاتہم کی اصلاحی مجالس کا سلسلہ کافی مقبول ومفید عام وخاص ہے اوراس کی بدولت متعدد بھٹکے ہوئے راہ یاب ہوئے ہیں اور غفلت کی زندگی چھوڑ کر اللہ اوراس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے سایہ میں عافیت والی زندگی گزار رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب حضرت اقدس شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ کی ہفتہ وار اصلاحی مجالس کے بیانات پر مشتمل مجموعہ ہے جن میں حضرت والا دامت برکاتہم نے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب مناجات مقبول میں مذکور دعاؤں کی تشریحات وتطبیقات فرمائی ہیں۔مناجات مقبول کی تشریح کا یہ سلسلہ کافی عرصہ جاری رہا اور الحمد للہ اس کا معتد بہ حصہ مکمل ہو چکا ہے۔زیر نظر مجموعہ میں انہی قرآنی دعاؤں کی تشریح ہے۔

اس مجموعہ کا بیشتر حصہ جناب مولانا عبد اللہ میمن صاحب مدظلہ نے جمع کیا

ہے۔اور حضرت والا دامت برکاتہم کی ہدایت پر اس مکمل مجموعہ کی نظر ثانی ،تخریج وتحقیق کا کام مولانا عنایت الرحمن صاحب نے کیا ہے جس سے اس مجموعہ کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے۔اس مجموعہ کی تیاری میں حتی الامکان تصحیحات کا اہتمام کیا گیا ہے۔قارئین سے گزارش ہے کہ اگرانہیں اس کتاب میں کسی قسم کی کوئی غلطی یا قابلِ اصلاح امر نظر آئے تو وہ ادارہ مکتبہ معارف القرآن کومطلع فرمائیں۔اللہ تعالی آپ کواس کا اجرعظیم عطا فرمائے۔آمین

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کاوش کو قبول فرما کر امت مسلمہ کے لئے ذخیرہ آخرت بنادے اور حضرت اقدس شیخ الاسلام دامت برکاتہم کا سایہ عاطفت تادیر بخیر وعافیت ہم سب کے سروں پر سلامت رکھے اور آپ کے علوم ومعارف سے ہم سب کو زیادہ سے زیادہ بہرہ ور فرمائے۔آمین

مکتبہ معارف القرآن کراچی

اجمالی فہرست

دعاؤں کی اہمیت

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعاؤں کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا ہے اور یہ مبارک مہینہ صبر کا مہینہ ہے، یہ مہینہ مواسات کا ہے، ہم دردی اور غم خواری کا مہینہ ہے، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح یہ مہینہ صبر کا اور مواسات کا مہینہ ہے، ہم دردی اور غم خواری کا اور عبادت کا مہینہ ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہوگا کہ یہ مہینہ "دعا" کا مہینہ ہے، اور "دعا" کا مہینہ اس طرح ہے کہ عام دنوں میں تو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ہوتی ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں، لیکن اس مہینہ میں اللہ جلّ شانہ دعوت دے کر ہم سے منگوا رہے ہیں کہ ہمارے پاس آؤ اور ہم سے مانگو۔

ارحم الراحمین ایسا نہیں کر سکتے

اگر کوئی آدمی اپنے دروازے پر کھڑا ہو کر کسی نادار اور فقیر کو اپنے پاس اپنے کمرے میں بلائے کہ آؤ اور اس سے پوچھے کہ تم کیا مانگتے ہو، مانگو، اور جب وہ مانگے کہ فلاں چیز دے دو، تو وہ شخص اس سے کہے کہ جاؤ، باہر نکلو اور اپنا راستہ لو۔ کیا کوئی معمولی شریف انسان ایسا کرے گا؟ نہیں کرے گا، تو جب ایک معمولی شریف انسان ایسا نہیں کر سکتا تو وہ ربّ العالمین، وہ احکم الحاکمین، وہ ارحم الراحمین اور ''غیاث المستغیثین'' یہ کیسے کر سکتا ہے کہ کسی بندے کو اپنے دربار میں بلائے اور پھر اس کو رد کر دے۔

یہ دعا کا مہینہ ہے

اس اعتبار سے یہ مہینہ دعا کا مہینہ بھی ہے، اور دعا بڑی عجیب چیز ہے اور جتنا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، اتنا ہی اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں اور خوش ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنے قریب کر لیتے ہیں اور اس کے دل میں تعلق مع اللہ کا اضافہ کرتے ہیں۔

دعا کے لیے کوئی شرط نہیں

یہ "دعا" اللہ تعالیٰ نے ایسی رکھی ہے کہ اس لیے کوئی شرط نہیں، کوئی خاص طریقہ اس کے لیے مقرر نہیں، باوضو ہونا ضروری نہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی حالتِ جنابت میں ہو تو اس کے لیے بھی دعا کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی خاتون حیض کی حالت میں ہے تو یہ خاتون قرآنِ کریم نہیں پڑھ سکتی ہے، لیکن قرآنِ کریم

میں جو دعائیں ہیں ان دعاؤں کو دعا کی نیت سے پڑھنے کی اجازت ہے۔ دعا کے لیے قبلہ رُو ہونا شرط نہیں، بلکہ کھڑے ہوکر، چلتے چلتے اور بستر میں لیٹے لیٹے دعا کرنے کی بھی اجازت ہے۔ البتہ دعا کے آداب میں یہ بات داخل ہے کہ مصلی پر دوزانو ہوکر اور قبلہ رُو ہوکر دعا کرے۔

دل ہی دل میں مانگ لو

اور زبان سے بھی مانگنے کی شرط نہیں، دل سے بھی دعا کر سکتے ہیں۔ یعنی دعا کے لیے اللہ تعالیٰ نے زبان ہلانے کی بھی شرط نہیں رکھی، بلکہ دل سے مانگ لو کہ یا اللہ! مجھے یہ چیز دے دیجیے، یا اللہ! میری یہ حاجت پوری کر دیجیے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو اتنا سہل اور آسان کر دیا ہے کہ کوئی اور عبادت اس کے برابر سہل اور آسان نہیں ہے۔ مثلاً نماز ہے، اس کا ایک خاص طریقہ ہے، اس کی شرائط اور ارکان ہیں، لیکن دعا کے لیے نہ کوئی شرط ہے، نہ کوئی رکن، نہ کوئی خاص طریقہ، بلکہ جس طرح چاہو، مانگ لو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ الحمد للہ مجھے کبھی اس میں تخلف نہیں ہوتا تھا کہ جب میرے پاس کوئی آتا اور یہ کہتا کہ حضرت مجھے ایک مسئلہ پوچھنا ہے، تو بلا تاخیر فوراً دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ! پتہ نہیں یہ کیا مسئلہ پوچھے گا، اس مسئلہ کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجیے۔ اب دیکھنے والے کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کیا ہوا، لیکن دل کے اندر باتیں

ہوگئیں۔ بقول شخصے ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراما کاتبین را ہم خبر نیست

اس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرلیا جاتا ہے۔ بہرحال! اس دعا کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی شرط نہیں رکھی۔

بیت الخلاء کا وقت ضائع مت کرو

ایک طرف تو اس ماہِ رمضان کو دعا کا مہینہ قرار دیا جا رہا ہے، اور ہر رات کو اللہ تعالیٰ کا منادی آواز دے رہا ہے کہ مجھے پکارو، اور اس پکارنے پر کوئی شرط عائد نہیں فرمائی، بلکہ جس طرح چاہو پکارو۔ دیکھیے جب آدمی بیت الخلاء میں ہوتا ہے تو وہاں پر نہ تلاوت جائز، اور نہ زبان سے اللہ کا ذکر کرنا جائز ہے۔ اس وقت تو انسان اپنی گندگی کو باہر نکال رہا ہے۔ اس وقت زبان سے دعا کرنا جائز نہیں، لیکن دل دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو، اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو تو اس کی اجازت ہے۔

دنیاوی مقاصد کے لیے دعا کرنا

یہ دعا ایسی چیز ہے کہ اگر تم اپنے دنیاوی مقاصد کے لیے بھی مانگو گے، مثلاً اے اللہ! مجھے ملازمت مل جائے، اے اللہ! میرے رزق میں برکت دے دے، اے اللہ! مجھے کشادہ اور وافر رزق عطا فرمادے، مجھے صحت عطا فرمادے، میرے گھر والوں کو صحت عطا فرمادے، یہ سب دنیاوی حاجتیں ہیں، ان دنیاوی

حاجتوں کو مانگنا بھی عبادت اور ثواب کا عمل ہے۔ اس کریم کی بارگاہ ایسی ہے کہ پہلے تو ہمیں بلایا کہ آؤ اور ہم سے مانگو، اور جب مانگنے کے لیے بندے ان کے پاس پہنچے تو فرمایا کہ جو کچھ مانگ رہے ہو وہ تو ہم بعد میں دیں گے لیکن تمہارے اس آنے پر اور مانگنے پر تمہارے لیے فوراً عبادت کا اجر وثواب لکھ دیا، اور جتنی دعا کروگے اتنا ہی اجر وثواب، اور یہ تمہارے مانگنے کا انعام ہے جو فوراً تمہیں دے دیا گیا۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

کوئی ایسا کریم ہوگا جو صرف اس بات کا انعام دے کہ تم میرے پاس مانگنے آئے، لہٰذا اس دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے قرب پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھتا ہے۔ اس لیے دعا کو معمولی مت سمجھو۔ لہٰذا جس طرح یہ مہینہ دوسرے اعمال کا مہینہ ہے اسی طرح دعا کا بھی مہینہ ہے۔ ہمارے حضرت عارفی قدس اللہ سرہ کا معمول یہ تھا کہ رمضان المبارک میں عصر کے بعد سے لے کر مغرب تک مسجد میں رہتے تھے، اور اپنے جو معمولات ہوتے ان کو پورا کرتے۔ اس کے بعد سارا وقت دعا میں گذارتے تھے، افطار تک ہاتھ اٹھا کر مانگتے رہتے۔ اس دعا میں دنیا بھر کی حاجات، آخرت کی حاجات، اپنی حاجات، اپنے گھر والوں کی حاجات، اپنے عزیزوں کی حاجات، اپنے تعلق والوں کی حاجات ایک ایک کا نام لے کر مانگتے۔ اور جب ہم میں سے کوئی حضرت سے ملاقات کرتا تو حضرت فرماتے کہ بھائی میں تمہارا نام لے کر تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔

گھر والوں کی بات مان لو

ایک مرتبہ میں نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت ہم نے بھی آپ کی سنت پر عمل کرنے کی کوشش کی، لیکن گھر والوں کا کہنا یہ ہے کہ سارا دن تو آپ ہوتے نہیں، عصر کے بعد آپ ہمارے پاس گھر میں آجایا کریں۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ حضرت والا نے فرمایا کہ گھر والوں کی بات مان لو، اور معمولات اور دعا وغیرہ جتنی ہوسکے گھر میں کرلیا کریں۔ جو طبیب ہوتا ہے وہ مریض کو اس کے مزاج کے مطابق نسخہ دیتا ہے۔

بہرحال! یہ مہینہ دعا کا مہینہ ہے، اس لیے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے زبان پر ہر وقت اپنی حاجتیں رکھو، اور اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔ جو چیزیں تمہارے حق میں فائدہ مند ہوں گی وہ ضرور دے دی جائیں گی۔ بعض اوقات ہم اپنی نادانی سے اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز مانگ لیتے ہیں جو ہمارے حق میں اچھی نہیں ہوتی، جیسے کوئی بچہ ماں باپ سے کہے کہ مجھے چھری دے دو، وہ نادان بچہ یہ نہیں جانتا کہ جب یہ چھری مجھے مل جائے گی تو میں اپنا ہی کام تمام کرلوں گا۔ چنانچہ باپ اس کو چھری کے بجائے کوئی اور چیز دے دیتا ہے، اسی طرح ہمارا مالک بھی ہماری مانگی ہوئی چیز دینے کے بجائے کوئی اور چیز دے دیتا ہے، اس لیے جو چیز ہم مانگ رہے ہوتے ہیں وہ ہمارے لیے مضر ہوتی ہے، نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ یہ بات جانتے ہیں کہ یہ چیز اس کے لیے نقصان دہ ہوگی، اس لیے اللہ تعالیٰ وہ چیز نہیں دیتے، بلکہ اس کے بدلے کچھ اور دے دیتے ہیں۔

میں دوسری چیز دوں گا

کچھ اور دینے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی بندے نے دعا مانگی تو صرف مانگنے پر اجر وثواب لکھ دیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی چیز ہم نے اللہ تعالیٰ سے مانگی اور وہ چیز ہمارے حق میں مناسب نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے کو اس کے بدلے کچھ اور دے دیں گے، اور یہ "کچھ اور" دعا کا اجرِ اضافی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں کہ میرا بندہ مجھ سے ایک فضول چیز مانگ رہا تھا جو اس کے لیے مناسب نہیں تھی، بلکہ مضر تھی، میں نے اس کو وہ چیز نہیں دی، اب میں اس کو دوسری چیز دوں گا، اور وہ میں اپنی پسند سے دوں گا۔ اور اس نادان بندے کو جب اس کی مانگی ہوئی چیز نہیں ملے گی تو اس کا دل ٹوٹے گا، اس کے دل میں افسردگی پیدا ہوگی، کچھ غم ہوگا، اس غم اور افسردگی پر بھی اس کو اجر دوں گا۔ اس طرح میرے مالک نے اپنے سخاوت کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔

صدقہ وخیرات میں ریحِ مرسلہ کی طرح

لہٰذا رمضان کے مہینے میں اور عبادات تو کرنی ہیں، روزہ رکھنا ہے، تراویح پڑھنی ہے، تلاوت کی کثرت، ذکر واذکار، تسبیحات، صدقہ وخیرات وغیرہ۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ ویسے تو آپ ہر حالت میں ہر زمانے میں سخی تھے، گھر میں کچھ نہیں رکھتے تھے، سب کچھ ضرورت مندوں پر صرف کر دیا کرتے تھے، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ رمضان المبارک میں آپ ایسے ہوجاتے جیسے "ریحِ مرسلہ" یعنی اللہ تعالیٰ کی

طرف سے چلائی ہوئی ہوا کی طرح ہو جاتے تھے، اتنا آپ صدقہ وخیرات کیا کرتے تھے۔ [1]

ہم بے جھولی اور بے پیالے والے فقیر

لیکن رمضان المبارک میں دعا کا خاص اہتمام کریں، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتے رہیں، اور رات کا وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دینے کا خاص وقت ہے، ہم تو وہ لوگ ہیں جن کو مانگنا بھی نہیں آتا، دعا کرنی بھی نہیں آتی، ہماری حالت تو اس فقیر جیسی ہے جس کے پاس جھولی اور پیالہ بھی نہیں ہے، اور جس کو مانگنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔

مانگنے والا ہونا چاہیے

ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دعا کی فضیلت بیان فرما رہے تھے، اس وقت آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ مانگنے والا ہونا چاہیے، ورنہ دینے والے کے دینے میں کوئی کمی نہیں۔ اس وقت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ قریب میں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے سوال کیا کہ حضرت اگر کسی کے پاس جھولی نہ ہو تو کیا کرے یعنی مانگنا نہ آتا ہو تو کیا کرے؟ جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جھولی بھی انہی سے مانگے، کہ یا اللہ میرے پاس تو جھولی بھی نہیں ہے، یا اللہ! مجھے تو مانگنا بھی نہیں آتا، یا اللہ مجھے مانگنے کی توفیق بھی عطا فرما دیں، اور میرے پاس مانگنے کے الفاظ بھی نہیں ہیں، آپ الفاظ عطا

(۱) صحیح البخاری ۲۶/۳ (۱۹۰۲)

فرما دیں، اور مجھے کیا کیا مانگنا چاہیے میں اس سے ناواقف ہوں، اے اللہ مجھے وہ بھی سکھا دیجیے اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔

اچھی دعا کی توفیق بھی انہی سے مانگو

ایک دعا میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَسْئَلَةِ وَخَيْرَ الدُّعَآءِ وَخَيْرَ النَّجَاحِ (۱)

اے اللہ! میں آپ سے اچھی دعا مانگنے کی توفیق چاہتا ہوں، اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اچھی دعا کون مانگ سکتا ہے، اے اللہ! میں آپ سے اچھی دعا کی توفیق چاہتا ہوں، اور دعا کی اچھی کامیابی آپ سے مانگتا ہوں، لہٰذا جس شخص کو دعا کرنی نہیں آتی، وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگے اور یہ کہے کہ یا اللہ! مجھے دعا کرنی بھی نہیں آتی، مجھے دعا کرنا بھی سکھا دیجیے۔

سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں

ہمارے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ سرہ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میں بیت اللہ شریف کے بالکل قریب بیٹھا ہوا تھا، اس زمانے میں حرم کے

---

(۱) المعجم الكبير للطبرانی،۲۳ /۳۱٦ (۷۱۷) والمعجم الاوسط للطبرانی ٦ /۲۱٤(٦۲۱۸) وقال الهيثمی فی "مجمع الزوائد" ۱۰ /۲۷۸ (۱۷۳۸۰) ورجاله رجال الصحيح غير محمد بن زنبور وعاصم بن عبيد وهما ثقتان، والمستدرك للحاكم ۱ /۷۰۱ (۹۱۱) وقال هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه، وقال الذهبی: صحيح.

اندر اتنا ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بھی ایک زمانے میں اس طرح طواف کیا ہے کہ ہر چکر میں حجرِ اسود کا بوسہ مل جاتا تھا، صرف ۲۵-۳۰ آدمی بیت اللہ کے گرد طواف کر رہے ہیں، حطیم میں آدمی اکیلا میزابِ رحمت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت والا بھی اسی طرح اکیلے کسی جگہ بیت اللہ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے، حضرت والا بیان فرماتے ہیں کہ میں نے دعا کے لیے ہاتھ تو اٹھا لیے، اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دعا کروں۔ جو دعائیں عام اوقات میں کیا کرتا تھا وہ یاد نہیں آ رہی تھیں، ادعیہ ماثورہ کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ یاد نہیں آ رہی ہیں۔ اپنی حاجتیں اور ضرورتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ بھی یاد نہیں آ رہی ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں۔

ساری کائنات ہاتھوں کے نیچے ہے

میں نے دل میں کہا کہ یا اللہ! آپ نے مجھے مقبولیت کی جگہ پر بلایا، اور آپ نے مجھے دعا کرنے کی توفیق بھی عطا فرما دی، اور میں نے ہاتھ بھی اٹھا لیے، لیکن اب میرا یہ حال ہے کہ دعا سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ کیا دعا کروں؟ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کیا مانگے گا، ارے تو نے ہمارے سامنے جو ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں، یہ ہاتھ تمام حاجتوں کے نمائندے ہیں، تو زبان سے کچھ مانگے یا نہ مانگے، لیکن تیرے ہاتھ ہمارے سامنے پھیلے ہوئے ہیں تو اب ساری کائنات ان ہاتھوں کے نیچے ہے، اس لیے کہ یہ ہاتھ ہمارے سامنے پھیلے ہوئے ہیں۔

بعض اوقات بے زبانی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے، یعنی زبان سے تو آدمی

کچھ نہیں کہہ رہا ہے لیکن اس کی جو مجموعی حالت ہے اور اس کا جو سراپا ہے وہ بذاتِ خود دعا کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے، ایسے موقع پر بعض اوقات آدمی کی سٹی گم ہو جاتی ہے، وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ بے زبانی خود ایک زبان ہے۔

بے زبانی کی زبان اللہ کو پسند ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری اَن کہی باتوں کو بھی سن لیتے ہیں، بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

ما نبودیم و تقاضہ ما نبود
لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

یعنی ہم بھی نہیں تھے، اور ہماری طرف سے کوئی تقاضا بھی نہیں تھا، لیکن اس کے لطف وکرم نے ہماری اَن کہی باتیں بھی سن لیں، انسان کے اوپر بعض اوقات ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ آدمی کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہیں اور زبان سے کچھ نکل نہیں رہا، حیران و پریشان ہے۔ اور یہ حالت خاص طور پر اس وقت طاری ہوتی ہے جب انسان بیت اللہ کے سامنے ہوتا ہے، اس لیے وہاں ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے برستے ہوئے انوار ہوتے ہیں، اور دوسری طرف اپنی سیاہ کاری اور اپنی ناکاری کا احساس کرتا ہے تو کچھ متحیر ہو جاتا ہے اور کچھ پریشان ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں زبان سے الفاظ نہیں نکلتے، بندے کی یہ حالت بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اور یہ بے زبانی کی زبان بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

ہماری اَن کہی باتیں بھی سُن لیتے ہیں

اور یہ حالت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے میرے اوپر جو قاتلانہ حملے کا جو حادثہ پیش آیا تھا، اس وقت میرے اوپر چاروں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں، میری اہلیہ تو قرآنِ کریم کی یہ آیت بار بار پڑھنے لگیں:۔

وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۱)

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں اس وقت متحیر ہو کر سوچتا رہا کہ ایسے موقع پر کیا دعا پڑھنی چاہیے، لیکن ذہن بالکل خالی اور سپاٹ ہو گیا۔ عام حالات میں ہر وقت کچھ نہ کچھ دل ہی دل میں دعا کرنے کی توفیق رہتی ہے، لیکن اس وقت ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ حالانکہ کوئی گھبراہٹ اور پریشانی بھی نہیں تھی۔ بات وہی ہے جو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی کہ

ما نبودیم وتقاضہٴ ما نبود
لطفِ تو ناگفتہٴ ما می شنود

یعنی میرے مالک نے ہماری اَن کہی باتیں بھی سُن لیں۔

آپ نے ہمیں دعا کرنا سکھایا

بہرحال! میرا مالک دعا کو بہت پسند کرتا ہے اور یہ رمضان المبارک خاص

(۱) سورۃ یس: آیت (۹)

طور سے دعا کا مہینہ ہے، اور ہمیں دعا کرنی بھی نہیں آتی، اس لیے دعا کرنے کا سلیقہ اور طریقہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہیے۔ اور ہمیں اس کی بھی تمیز نہیں کہ کیا چیز مانگیں اور کیا چیز نہ مانگیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان جائیے کہ آپ نے ہمیں دعا کرنا سکھا دیا، فرمایا کہ اچھا تمہیں دعا کرنا نہیں آتی، چلو میں تمہیں بتا دیتا ہوں، اور آپ نے ہمیں ایسی ایسی دعائیں سکھا دیں کہ ان دعاؤں میں دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیاں مضمر ہیں، یہ دعائیں ایک پیغمبر ہی مانگ سکتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے وہ دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی ہیں۔ اور قرآنِ کریم میں جو دعائیں آئی ہیں وہ تو وحیِ الٰہی ہیں۔

دعاؤں کے مختلف مجموعے

وحیِ الٰہی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درخواست کا مضمون خود مدوّن فرما دیا کہ ارے تم اپنے الفاظ سے کیا مانگو گے، ہم ہی تم کو بتا دیتے ہیں کہ اس طرح اور ان الفاظ کے ذریعہ ہم سے مانگو۔ لہٰذا ہمارے یہاں دعاؤں کے مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہوتے ہیں، جیسے "الحزب الاعظم" ہے۔ ان میں سب سے زیادہ جامع مجموعہ "الحصن الحصین" ہے۔ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا مرتب کردہ مجموعہ "مناجاتِ مقبول" کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس میں آپ نے وہی دعائیں جمع فرمائی ہیں جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگیں۔

"مناجاتِ مقبول" کی دعاؤں کی تشریح

میرا دل چاہتا تھا کہ کسی وقت ان دعاؤں کی تشریح کا سلسلہ شروع کروں،

چنانچہ ایک ساتھی نے یہ فرمائش بھی کی کہ اس مرتبہ رمضان المبارک کے بیانات میں "مناجاتِ مقبول" کی دعاؤں کی تشریح فرمادیں۔ میں خود سے کیا تشریح کروں گا، لیکن اللہ تعالیٰ دل میں جو بات ڈالیں گے اس کو بیان کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ ان دعاؤں کی قدر دل میں پیدا ہو، اور ان دعاؤں کو مانگنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اللہ جل جلالہ سے کس طرح مانگا جائے، وہ طریقہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دعاؤں میں سکھایا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ اتوار سے توفیقِ الٰہی سے اس سلسلہ کو شروع کریں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں منگتا بنا دے

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں مانگنے والا بنا دے، منگتا بنا دے۔ منگتا اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر وقت مانگتا رہتا ہے، اور عام حالات میں یہ لفظ اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شخص منگتا ہے، یعنی اس کو ہر وقت مانگنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اور ہر ایک سے مانگتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے "منگتا" بن جانا بہت بڑا اعزاز ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ. (۱)

یعنی جو اللہ تعالیٰ سے مانگتا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

---

(۱) سنن ابن ماجه ٥ / ٣٥٣ (٣٨٢٧) وسنن الترمذی ٥ / ٣٨٧ (٣٣٧٣) والأدب المفرد للبخاری ٢٢٩ (٦٥٨)

اس لیے اس ماہِ مبارک میں خاص طور پر دعاؤں کو اپنے معمولات میں شامل فرمائیں اور مناجاتِ مقبول کی ایک منزل روزانہ پڑھ لیا کریں، اور پڑھنے سے آگے بڑھ کر وہ دعائیں مانگ لیا کریں۔ اس لیے کہ دعائیں پڑھنے کے لیے نہیں ہوتیں، دعائیں مانگنے کے لیے ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دعا نمبر ۱

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

فہرستِ مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعا نمبر ۱

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

گذشتہ اتوار کو میں نے عرض کیا تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ خاص طور پر دعاؤں کا مہینہ ہے، یوں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہر زمانے میں اور ہر جگہ بندے کی دعا سنتے ہیں اور قبول فرماتے ہیں۔ لیکن رمضان المبارک کے مہینے میں خاص طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت بندوں کو نوازنے کے لیے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ روزہ رکھو تو گناہ معاف، افطار کے وقت دعا کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں، روزہ کی حالت میں دعا کرلو، اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں، رات کو اٹھ کر دعا کرلو، اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ غرض قدم قدم پر اللہ تعالیٰ نے اس ماہ میں مقاماتِ اجابت رکھے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ دعا کا مہینہ ہے۔

ہمیں مانگنا بھی نہیں آتا

حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو دعا مانگنا آتا ہی نہیں ہے، جس شخص کو دعا مانگنا آجائے، بس یہ سمجھ لو کہ اس کو دنیا اور آخرت کی کامیابی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ دعا کرنے کا سلیقہ عطا فرما دے، اور دعا کرنے کی اہمیت دل میں ڈال دے، اور اللہ تعالیٰ دعا کرنے کا ذوق پیدا فرما دے، تو سمجھو کہ سب کچھ حاصل ہوگیا۔ ہمارے کچھ احباب نے یہ فرمائش کی تھی، اور میرا بھی دل چاہتا تھا کہ جو دعائیں قرآنِ کریم میں وارد ہوئی ہیں اور جو دعائیں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور اور منقول ہیں، ان کی ایک ایک کر کے تھوڑی سی تشریح پیش کروں۔

مناجاتِ مقبول

"مناجاتِ مقبول" در حقیقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دعاؤں کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا تھا اور یہ دعائیں در حقیقت "الحزب الاعظم" کا خلاصہ ہیں، اور "الحزب الاعظم" حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے۔ اس میں انہوں نے قرآنِ کریم کی دعائیں اور احادیثِ مبارکہ کی دعائیں جمع کی تھیں۔ وہ ذرا مفصل اور طویل ہے، اور ہم جیسے کم ہمت لوگوں کے لیے اس کے اختصار کی ضرورت تھی۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "مناجاتِ مقبول" کے نام سے دعاؤں کا یہ مجموعہ جمع فرمایا۔ اس کو سات حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ "منزل" کا دے دیا، اور ہر دن کی ایک "منزل" مقرر فرما دی کہ یہ "ہفتہ کی منزل"، یہ "اتوار کی منزل" وغیرہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ منزل میں آنے والی

دعاؤں کا اس میں اس دن سے کوئی خاص تعلق ہے، بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ایک آدمی پورے ہفتے میں یہ ساری دعائیں مانگ لے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعائیں مانگنا سکھا دیا

حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو دعا مانگنا آتا نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان جایئے کہ آپ ہمیں مانگنا بھی سکھا گئے کہ کیا مانگنا چاہیے؟ اور کس طرح مانگنا چاہیے؟ اور کن الفاظ میں مانگنا چاہیے؟ وہی "مناجاتِ مقبول" کا کل حاصل ہے۔ بہر حال! اس کی پہلی منزل میں حضرت والا نے وہ دعائیں جمع فرمائی ہیں، جو قرآنِ کریم میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اس کے بعد وہ دعائیں جمع فرمائی ہیں، جو احادیث میں آئی ہیں، ان میں ہر ایک دعا ایسی ہے کہ اگر ایک دعا بھی قبول ہوجائے تو انسان کا بیڑا پار ہوجائے۔

پہلی جامع ترین دعا

بہر حال! حضرت والا نے "مناجاتِ مقبول" کو اس دعا سے شروع فرمایا ہے کہ:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱)

عام طور پر یہ دعا ہر مسلمان کو اکثر وبیشتر یاد ہوتی ہے، اور جن لوگوں کو جنازہ کی دعا یاد نہیں ہوتی وہ نمازِ جنازہ کی تیسری تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۱)

افسوس ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو نمازِ جنازہ کی وہ دعا جو تیسری تکبیر کے بعد پڑھی جاتی ہے، یاد نہیں ہوتی۔ کیا مشکل ہے کہ جو دعا رسول کریم ﷺ سے منقول ہے، آدمی اس دعا کو یاد کرلے۔ جن لوگوں کا مدرسہ سے یا مکتب سے تعلق رہا ہے، ان کو وہ دعا یاد ہوتی ہے، لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات جو کالجوں اور اسکولوں میں پڑھے ہوئے ہیں، ان کو یہ دعا یاد نہیں ہوتی۔

نمازِ جنازہ میں اس دعا کا پڑھنا

چنانچہ مجھ سے کئی لوگوں نے پوچھا کہ ہمیں تو جنازہ کی دعا یاد نہیں ہے، ہم اس کی جگہ ''رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ'' والی دعا پڑھ لیتے ہیں، میں ان کو یہ جواب دیتا ہوں کہ چلو، یہی پڑھ لو۔ لیکن اس دعا کو یاد کرنے کی کوشش تو کرو۔ ایک مسلمان کو اگر نمازِ جنازہ نہ آئے تو یہ کتنی سبکی کی بات ہے! حرمِ مکی میں تقریباً ہر نماز کے بعد نمازِ جنازہ ہوتی ہے، جو عرب لوگ وہاں کے باشندے ہیں، وہ نمازِ جنازہ میں دعائیں پڑھتے ہیں، اور حضورِ اقدس ﷺ سے جنازہ کی کئی دعائیں منقول ہیں، وہ سب دعائیں پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے پاکستانی بھائی یا تو خاموش کھڑے رہتے ہیں یا رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ والی دعا پڑھتے ہیں، بہرحال! نہ پڑھنے سے یہ دعا پڑھ لینا بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی دعا

حدیث شریف [1] میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر وبیشتر دعا یہی:

(۱) صحیح للبخاری ۸ / ۸۳ (۶۳۸۹)

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہوتی تھی۔ اور یہ دعا درحقیقت قرآنِ کریم ہی کی سکھائی ہوئی ہے۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ [1]

یعنی: جب تم عرفات سے واپس آؤ "مشعرِ حرام" یعنی "مزدلفہ" کے پاس تو اللہ کا ذکر کرو، "وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ" اور ذکر بھی اس طرح جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، اور جس طریقہ سے ذکر کرنے کی ہدایت کی ہے، اس طریقہ سے ذکر کرو۔ یہ نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ لیا، اور اس پر عمل کرنا شروع کردیا۔

زمانۂ جاہلیت کا رواج

زمانۂ جاہلیت میں لوگ حج ادا کیا کرتے تھے، اور جب مزدلفہ پہنچتے تو اپنے آباء واجداد کے مناقب اور فضائل بیان کرنا شروع کردیتے کہ ہمارے باپ نے فلاں جنگ لڑی۔ اور اس کو فتح نصیب ہوئی، قرآنِ کریم میں ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا

یعنی تم اللہ تعالیٰ کا ذکر اسی طرح کرو جس طرح اپنے آباء واجداد کا کیا

---

(۱) سورة البقرة: آیت (۱۹۸)

کرتے تھے، یا اس سے بھی اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔

صرف دنیا مانگنے والے

آگے فرمایا کہ:

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ [1]

یعنی کچھ لوگ وہ ہیں جو اس مقامِ مقدس پر پہنچنے کے بعد صرف دنیا کی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں کہ ہمیں اولاد دے دے، ہمیں رزق زیادہ دے دے، ہمارا گھر اچھا بن جائے، اور ہمارے قبیلے کو فتح نصیب ہو جائے، ہمارے دشمن نامراد ہو جائیں وغیرہ۔ یہ وہ شخص ہے کہ آخرت میں اس کے لیے کچھ حصہ نہیں ہے۔

دنیا اور آخرت دونوں کی حسنۃ مانگنے والے

آگے ارشاد فرمایا کہ:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ [2]

اور کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار: ہمیں

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۰)

(۲) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۱)

دنیا میں بھی اچھائی عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرمائیے؛ اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لیجیے۔

أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا۟ ۚ وَٱللَّهُ سَرِيعُ ٱلْحِسَابِ [1]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو کمائی کا حصہ آخرت میں عطا فرمائیں گے، یعنی اچھے اعمال کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔

صرف دنیا مانگنے والے احمق ہیں

ان آیات میں اللہ تعالیٰ یہ بیان فرما رہے ہیں کہ وہ بندہ انتہائی بے وقوف اور احمق ہے کہ جب بھی دعا مانگتا ہے، صرف دنیا کے لیے مانگتا ہے کہ مجھے ملازمت مل جائے، مجھے رزق مل جائے، میرا گزارہ اچھا ہوجائے، میرا مکان اچھا ہوجائے، مجھے گاڑی اچھی مل جائے، مجھے امتحان میں کامیابی مل جائے۔ گویا کہ ساری سوچ کا محور دنیا ہی دنیا ہے۔ آخرت کی دعا کہ یا اللہ! آخرت میں ہمارا انجام اچھا کر دیجیے، ہمارے گناہ معاف کر دیجیے، اس کی طرف دھیان ہی نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے جب بھی مانگیں گے، صرف دنیوی اشیاء ہی مانگیں گے۔ یہ لوگ احمق اور تنگ نظر لوگ ہیں، ان لوگوں کی سوچ کا دائرہ صرف دنیوی لذتوں تک اور دنیا کے اسباب تک محدود ہے بس، اور یہ اگر مل جائے تو گویا سب کچھ مل گیا۔ چاہے قبر میں جا کر پٹائی ہو۔ نعوذ باللہ۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۲)

ہم سب کا یہی حال ہے

میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بزرگ آیا کرتے تھے، بڑے عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ تھے۔ تہجد گزار تھے، بڑے تاجر تھے، کچھ عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ یہ وظیفے پڑھتے ہیں، اور وظیفہ کے بعد یہ دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ، سٹہ میں میرا نمبر نکل آئے۔ اب دیکھیے کہ آدمی کی سوچ صرف دنیا کی طرف لگی ہوئی ہے۔ ہم بھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ہمارے خواہشات، ہماری امنگیں، ہمارے خیالات، زیادہ تر دنیا ہی کی طرف چلتے ہیں کہ دنیوی نعمتیں ہمیں زیادہ سے زیادہ حاصل ہوجائیں، لذتیں مل جائیں، شہرت اور مقبولیت حاصل ہوجائے۔ یہ تصور کہ وہ جنت مل جائے جس کے بارے میں فرمایا کہ وہاں جو تم چاہو گے، وہ ملے گا، وہاں پر نہ خوف ہوگا، نہ غم ہوگا۔ اس جنت کا خیال، اس کی فکر، اس کی سوچ اور اس کی امنگ، اس کا شوق، یہ شاذ ونادر ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل نہ فرمائے۔ آمین۔

دنیا کو دماغ پر سوار مت کیجیے

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا [1]

---

(۱) سنن الترمذی ۵ / ۴۸۱ (۳۵۰۲) وقال: هذا حديث حسن غريب.

اے اللہ! ایسا مت کیجیے کہ ہر وقت ہمارے دماغ پر دنیا ہی سوار رہے۔

اے اللہ! ایسا مت کیجیے گا کہ ہمارے علم کی انتہا دنیا پر ہو جائے اور ہماری ساری رغبت اور شوق کا مرکز صرف دنیا ہی بنی رہے۔ ایسا مت کیجیے گا۔

ان لوگوں کی مذمت بیان فرمائی جن کے دل و دماغ پر ہر وقت دنیا ہی مسلط ہے۔ اسی دنیا ہی کی خواہش ہے، اسی کی امنگ ہے، اسی کا شوق ہے۔

لفظ "حسنة" کا مفہوم

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ [1]

اے اللہ، دنیا میں بھی اچھائی عطا فرمائیے، اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرمائیے، یعنی دنیا میں اچھی چیزیں دیجیے اور آخرت میں بھی اچھی چیزیں دیجیے۔

"حسنة" ایک چھوٹا سا لفظ ہے، جو چار حرفوں پر مشتمل ہے، "ح س ن ۃ"، جس کے معنی ہیں "اچھائی"۔ لیکن اس چھوٹے سے لفظ میں ساری کائنات پوشیدہ ہے، دنیا کے اندر انسان کو "حسنة" مل جائے، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ رزق اچھا مل رہا ہو، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ صحت اچھی ہو، اچھائی یہ ہے کہ اولاد ہو، یہ بھی اچھائی ہے کہ گھر والے مطمئن ہوں، یہ بھی اچھائی ہے کہ

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۱)

دوست احباب اچھے ہوں، اچھائی یہ بھی ہے کہ آدمی کو علم حاصل ہو، اچھائی میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا کے اندر عمل صالح کی توفیق عطا فرما دے۔ یہ سب اچھائی میں داخل ہیں۔

پہلی دعا میں ”حسنة“ نہیں

ذرا اس بات پر غور کرو کہ جب قرآنِ کریم نے ان لوگوں کی دعا کا ذکر فرمایا جن کی نگاہ دنیا کی حد تک محدود رہتی ہے، اس جگہ یہ فرمایا کہ:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (1)

اس جگہ پر لفظ ”حسنة“ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ لوگ دنیا کے اندر اپنی مطلوبہ چیزیں مانگتے ہیں کہ ہمیں یہ چیز مل جائے، ہمیں فلاں چیز مل جائے، ہمیں اچھا گھر مل جائے، ہماری آمدنی بڑھ جائے، ہمارا بینک بیلنس زیادہ ہوجائے، اس دعا میں اچھائی اور برائی کا کوئی تصور نہیں ہے کہ جو ملے وہ حقیقت میں اچھائی ہو، بلکہ انہوں نے اپنے ذہنوں میں جو مطلوبہ چیزیں گھڑ رکھی ہیں، وہ ملنی چاہئیں۔ چاہے وہ حلال ہو یا حرام ہو۔ جائز ہو یا ناجائز ہو، ہو حقیقت میں مفید ہوں یا نہ ہوں، چاہے سٹے کی رقم مل جائے یا سود کے ذریعہ رقم مل جائے، لیکن مل جائے۔

دنیا میں بھی ”حسنة“ مانگو

لیکن قرآنِ کریم نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ تم بیشک اللہ تعالیٰ سے دنیا بھی

(۱) سورة البقرة: آیت (۲۰۰)

مانگو، لیکن دنیا میں "حسنۃ" مانگو، اچھائی مانگو، یعنی اے اللہ! مجھے مال دیں تو حلال مال دیں، رزق عطا فرمائیں تو حلال رزق عطا فرمائیں، صحت عطا فرمائیں تو وہ صحت آپ کی اطاعت میں استعمال ہو۔ اے اللہ! علم عطا فرمائیں تو علم کی حقیقت اور اس پر عمل بھی عطا فرمائیں۔ ایک مختصر لفظ میں دنیا کی ساری اچھائیاں جمع کر دیں۔

اگر یہ ایک دعا قبول ہو جائے؟

ذرا اس بات کو سوچیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہماری یہ دعا

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ

قبول فرمالیں تو باقی کیا رہ جائے گا؟ اس لیے کہ دنیا کے اندر جتنی اچھی چیزیں ہیں، وہ سب اس کے اندر آئیں۔ اور جس طرح اس کے اندر مادّی چیزیں آگئیں، اسی طرح اس کے اندر روحانی چیزیں بھی آگئیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا میں "حسنۃ" عطا فرمائے اور نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنی ذات کے ساتھ تعلق عطا فرمائے اور اپنا قرب عطا فرمائے، اور اپنی دھن میں لگے رہنے کا جذبہ عطا فرمائے۔ یہ سب چیزیں اس لفظ "حسنۃ" میں آگئیں۔

آخرت کی "حسنۃ" میں سب کچھ داخل

وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً اے اللہ! آخرت میں اچھائی دے دیجیے، یعنی دنیا میں آپ نے جن نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائی، اس کا صلہ آخرت میں دینے کا

جو وعدہ کیا ہے، وہ عطا فرمائیے، اور آخرت میں جنت عطا فرمائیے اور اپنا دیدار عطا فرمائیے۔ اور آپ نے پیغمبروں کے ذریعہ جو وعدے فرمائے ہیں کہ آخرت اور جنت میں فلاں نعمت دی جائے گی، فلاں نعمت دی جائے گی، اے اللہ! ہم آپ سے وہ سب نعمتیں مانگتے ہیں؛ لہٰذا یہاں بھی لفظ "حسنة" میں آخرت کی ساری نعمتیں شامل ہوگئیں۔

جنت کی نعمتیں

ذرا سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں جتنی چیزیں رکھی ہیں، ان نعمتوں کے بارے میں حدیثِ قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَعْدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ.(١)

یعنی میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے جنت میں جو نعمتیں تیار کر کے رکھی ہیں، ان کو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھا، نہ کسی کان نے کبھی اس کے بارے میں سنا، اور نہ کسی بشر کے قلب پر اس کا خیال گزرا۔

اب اگر ان نعمتوں کو یہاں بیٹھ کر مانگیں تو اپنی محدود سوچ کے مطابق جو اچھی چیزیں ہمیں سمجھ میں آئیں گی، وہ ہم مانگ لیں گے کہ یا اللہ! ہمیں کھانا اچھا دے دیجیے گا، ہمیں رہنے کے لیے مکانات جن کے بارے میں آپ نے

---

(١) صحيح البخاری ٤ / ١١٨ (٣٢٤٤)

فرمایا کہ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ وہ ہمیں عطا فرمادیجیے گا۔

کچھ اور بھی دیا جائے گا

لیکن جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے چھپا کر رکھی ہیں، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا کہ:

لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَزِيَادَةٌ [1]

یعنی نیک عمل کرنے والوں کو ایک طرف تو حُسنیٰ دیا جائے گا اور اُوپر سے کچھ اور بھی دیا جائے گا۔

لفظ ﴿زِيَادَةٌ﴾ لاکر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ "کچھ اور" کو تم کیا سمجھو گے کہ وہ کیا چیز ہے؟ بس ہم ہی جانتے ہیں کہ اور کیا دیں گے؟ ایک اور جگہ فرمایا:

لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ فِيۡهَا وَلَدَيۡنَا مَزِيۡدٌ [2]

یعنی ان کو جنت میں جو وہ چاہیں گے، وہ ملے گا۔ اور ہمارے پاس کچھ اور بھی ہے۔

کیا مطلب؟ یعنی ایسی چیز ہے جو تمہارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں گزری۔ تم اپنی طرف سے کیا چاہو گے؟ تمہاری چاہت تو صرف مادی لذتوں کی طرف چلی جاتی ہے، کہ جب جنت میں جائیں گے تو بڑا مزہ آئے گا، اور وہاں

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۲۶)

(۲) سورۃ ق: آیت (۳۵)

اچھے باغات ہوں گے، وہاں پر اچھے مناظر ہوں گے، اور وہاں مختلف نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہاں شہد کی نہریں ہوں گی، دودھ کی نہریں ہوں گی، ان کو ہم پئیں گے، اور مزے اڑائیں گے۔

ہمارے پاس کچھ اور بھی ہے

اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ہمارے پاس ان چیزوں کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، وہ کچھ اور "حسنة" میں داخل ہے، جس کا اس دعا میں ذکر ہے کہ

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً

اے ہمارے رب! ہم آپ سے دنیا میں بھی "حسنة" مانگتے ہیں اور آخرت میں بھی "حسنة" مانگتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ ہماری اس دعا کو قبول فرمالیں، اور ہمیں دنیا میں بھی "حسنة" دے دیں اور آخرت میں بھی "حسنة" دے دیں، تو پھر کیا باقی رہ گیا، دنیا اور آخرت کی کوئی حاجت ایسی نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ بہر حال! قرآنِ کریم نے ہمیں ایسی جامع دعا سکھا دی۔

یہ دعا کبھی رد نہیں ہوگی

اور جب وہ خود سکھا رہے ہیں کہ اس طرح مجھ سے مانگو، کیا وہ ہمیں محروم کر دے گا؟ اور فرما رہے ہیں کہ وہ لوگ بہت اچھے ہیں جو اپنی دعا میں یہ کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی حسنہ دے، اور آخرت میں بھی حسنہ دے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا [1]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی کمائی کا حصہ عطا فرمائیں گے۔

لہٰذا یہ دعا کبھی رد نہیں ہوگی، بس تم اخلاص کے ساتھ مانگو۔

دوسروں سے دنیوی دعائیں کرانا

اس دعا کے ذریعے ہمیں یہ سبق دے دیا کہ صرف دنیا کی حد تک محدود نہ رہو، آج اگر دوسرے سے دعا کے لیے کہتے ہیں تو وہ دعا بھی دنیوی مقاصد کے لیے ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ میرے بیٹے کے امتحان ہو رہے ہیں، دعا کریں کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوجائے، اور اس کو اچھی ڈگری مل جائے، علماء کے پاس یا اور اللہ والوں کے پاس جائیں گے تو ان سے درخواست کریں کہ یہ دعا کر دیں کہ میرا گرین کارڈ امریکہ کا بننے والا ہے، اس کے بننے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوجائیں، اور ہمیں امریکہ کی نیشنیلٹی مل جائے، یا برطانیہ کی نیشنیلٹی مل جائے، فلاں ڈگری حاصل ہوجائے۔

دنیوی مقاصد کے لیے وظیفے

اور اگر کسی بزرگ سے وظیفہ پوچھیں گے تو اس چیز کا وظیفہ پوچھیں گے کہ ہمارے بیٹے کی نوکری اچھی لگ جائے، اس کا وظیفہ بتا دو، اس کو ڈگری اچھی مل

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۲)

جائے، سارے وظیفے اپنی دنیوی مقاصد کے لیے پوچھے جا رہے ہیں کہ کس مقصد کے لیے کیا وظیفہ پڑھا جائے؟ بزرگوں سے دنیوی مقاصد کے لیے تعویذ مانگیں گے کہ کوئی تعویذ دے دو، کچھ پڑھنے کو بتا دو، حالانکہ جو وظیفے دنیوی مقاصد کے لیے پڑھے جاتے ہیں، چاہے وہ آیاتِ قرآنیہ ہی ہوں، اس کے پڑھنے پر کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔ ان کا پڑھنا تو جائز ہے اور جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں، لیکن اس کی تلاوت پر کوئی اجر وثواب نہیں؛ اس لیے کہ وہ تلاوت تو دنیوی کام کے لیے اور جو وظیفہ تم نے پڑھا اپنے دنیوی مقصد کے لیے پڑھا، ثواب تو اس تلاوت پر ملتا ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کی گئی ہو۔

تمہیں تو اچھائی کا بھی علم نہیں

بہر حال! آج ہماری ساری تگ ودو صرف دنیوی مقصد کے لیے ہوکر رہ گئی ہے۔ اس دعا کے ذریعہ قرآنِ کریم نے اس کی مذمت کی ہے، کہ ہم تمہیں یہ نہیں کہتے کہ تم ہم سے دنیا نہ مانگو، بیشک دنیا مانگو، لیکن کم از کم آخرت کے مانگنے کے برابر تو مانگو کہ: اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی اچھائی دے دیجیے اور آخرت میں بھی اچھائی دے دیجیے، لہٰذا دنیا میں ہم سے اچھائی مانگو، اور تم اتنے بے وقوف ہو کہ تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ "اچھائی" کیا چیز ہے؟ بعض اوقات تم ہم سے ایسی چیزیں مانگتے ہو جو حقیقت میں تمہارے لیے مضر ہوتی ہیں۔ اور مضر ہونے کی وجہ سے ہم تمہیں وہ چیزیں نہیں دیتے، اس لیے کہ انجام کار وہ تمہارے لیے اچھی نہیں تھی۔

دعا کرنے پر فوراً اجر وثواب

البتہ ایک چیز ہم فوراً دے دیتے ہیں، وہ یہ کہ جونہی تم نے دعا کی، اسی وقت تمہارے نامۂ اعمال میں ایک زبردست نیکی کا اضافہ ہوگیا۔ اس لیے کہ دعا بذاتِ خود عبادت ہے، چاہے وہ دعا دنیوی مقاصد کے لیے کی جا رہی ہو، مثلاً یہ دعا کہ یا اللہ! مجھے اولاد دے دے، یا اللہ! مجھے روزی دے دے، یا اللہ! مجھے ملازمت دے دے، ان دعاؤں پر بھی تمہیں اجر وثواب ملے گا۔ اور تمہیں "حسنة" فوراً مل جائے گا، اور جو چیز مانگ رہے ہوتے ہو، وہ بعض اوقات حقیقت میں حسنہ نہیں ہوتی، اس لیے ہم اس کے بدلے کچھ اور دے دیتے ہیں۔

دنیا کے لیے اتنا مانگو جتنا دنیا میں رہنا ہے

لہٰذا کم از کم دنیا اور آخرت کو مُساوی سطح پر تو مانگو۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ دنیا کے لیے اتنا مانگو جتنا عرصہ تمہیں دنیا میں رہنا ہے، اور آخرت کے لیے اتنی مانگتے، جتنا آخرت میں رہنا ہے۔ لیکن چونکہ تم بے وقوف لوگ ہو، اور تمہیں اندازہ نہیں ہے، اس لیے چلو، برابری کی سطح پر مانگ لو، اور یہ کہو کہ یا اللہ! ہمیں دنیا میں اچھائی عطا فرما، اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما، لیکن صرف دنیا کے گرد گھومتے رہنا، اور صرف دنیا ہی مانگتے رہنا، یہ چیز اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

لوگوں کی تین قسمیں

یہیں سے یہ بات بھی پتہ چلی کہ لوگوں کی تین قسمیں ہوگئیں، ایک قسم تو وہ ہے جو صرف دنیا مانگتے ہیں، اور آخرت کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں، ان لوگوں

کی تو قرآن نے ان الفاظ سے مذمت فرمائی کہ:

وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۱)

دوسرے لوگ وہ ہیں جو دنیا بھی مانگتے ہیں اور آخرت بھی مانگتے ہیں، قرآنِ کریم نے اس کی توثیق اور تعریف فرمائی کہ:

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا (۲)

تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو صرف آخرت مانگتے ہیں، دنیا نہیں مانگتے، اور یہ کہتے ہیں کہ مجھے دنیا میں کچھ نہیں چاہیے، جو دینا ہو، وہاں آخرت میں دے دینا، ان کا قرآنِ کریم نے نہ ذکر کیا اور نہ ان کی تعریف کی۔

دنیا بھی اسی سے مانگیں

اس لیے کہ دنیا بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہیے، اس لیے کہ یہ دنیا آخرت تک پہنچنے کی سیڑھی ہے، لہٰذا صرف آخرت مانگنا اور دنیا کی نعمتیں نہ مانگنا بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، اس لیے بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے دنیا کی چیزیں بھی مانگے، اور یوں کہے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، میں فقر وفاقہ برداشت نہیں کرسکتا، اس لیے مجھے رزق دیجیے، اور میں بیماری کو برداشت نہیں کرسکتا، اے اللہ! مجھے صحت عطا فرمایئے۔ لہٰذا صرف آخرت مانگنا اور دنیا نہ مانگنا عبدیت اور بندگی کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ بندہ تو وہ ہے کہ ہر چیز کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۰)
(۲) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۰۲)

دنیا نہ مانگنے کا مطلب

اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے صرف آخرت مانگے اور دنیا نہ مانگے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے دنیا میں آپ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں، آپ مجھے جس حال میں رکھیں گے، میں اسی حال میں رہوں گا۔ ارے تم اتنے بہادر مت بنو، اللہ تعالیٰ بچائے، اگر کسی وقت آزمائش آگئی تو پتہ چل جائے گا، اس لیے اللہ تعالیٰ سے دنیا بھی مانگو۔

آپ کا عیادت کے لیے جانا

ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی صحابی (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بہت بیمار ہیں، چنانچہ آپ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اب دیکھیے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ مصروف کون ہوگا۔ جن کے کندھوں پر پوری امت کی ذمہ داری ہے، امت کو تعلیم دینی ہے، امت کو تربیت دینی ہے، جہاد اس کو کرنا ہے، ریاست کا انتظام کرنا ہے:

اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (۱)

یعنی دن میں آپ کی طویل مشغولیت رہتی ہے، جس میں مصروف رہتے ہیں۔ اتنی مصروفیت کے باوجود اتنے صحابہ کا اور اپنے دوستوں کا حق ادا کرنے کے لیے عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔

(۱) سورۃ المزمل: آیت (۷)

تم نے ایسی چیز کیوں مانگ لی؟

آپ نے ان صحابی کو دیکھا کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکے ہیں، اور بری حالت میں ہیں۔ آپ نے ان صحابی سے پوچھا کہ تم کیا دعا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ! آخرت میں مجھے جو کچھ عذاب دینا ہے، وہ عذاب مجھے دنیا ہی میں دے دے، اس لیے کہ آخرت کا عذاب برداشت نہیں کر سکوں گا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ سے ایسی چیز مانگ لی جو تمہاری طاقت سے باہر ہے، تم کہاں وہ آخرت کا عذاب دنیا کے اندر برداشت کر سکو گے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرو:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ

یہ دعا مانگو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر مت بنو۔ یہ نہ ہو کہ بیماری آ گئی تو اب اللہ تعالیٰ سے اس کے دور کرنے کی دعا نہ مانگیں۔ [1]

دعا مانگنا رضا بالقضا کے خلاف نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا "رضا بالقضاء" کے خلاف ہے، یعنی بندہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی نہیں ہے، اس لیے دعا کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہے۔ یاد رکھیے دعا کرنا اور مانگنا "رضا بالقضاء" کے بالکل خلاف نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ نہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے

(۱) صحیح مسلم ٤ / ٢٠٦٨ (٢٦٨٨)

بہادری دکھائے، بلکہ "رضا بالقضاء" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان کسی پریشانی میں، کسی مصیبت میں ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ سے کوئی شکوہ اور گلہ نہ ہو، باقی اس مصیبت اور پریشانی کے دور ہونے کے لیے دعا کرے تو یہ "رضا بالقضاء" کے خلاف نہیں۔

اللہ تعالیٰ کیا چاہتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ بندہ مجھ سے مانگے، مجھ سے صحت مانگے، رزق مانگے، اور جو دنیوی حاجات ہیں، وہ مجھ سے مانگے۔ لیکن بہادری دکھانا اچھی بات نہیں۔

اس دعا میں دنیا اور آخرت کی تمام بھلائی داخل ہے

حقیقت یہ ہے کہ اس دعا کے یہ دو جملے ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ اس میں دنیا و آخرت کی کوئی بھلائی ایسی نہیں جو اس میں نہ آئی ہو، اور جب یہ دعا مانگو تو ذرا سوچ کر مانگو کہ دنیا کے حسنہ میں "صحت" بھی ہے، "مال" بھی ہے، "اولاد" بھی ہے، "گھر والے" بھی ہیں، اور "نیک اعمال" بھی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ تعلق بھی ہے۔ ارے! اس شخص کی دنیا سے زیادہ اچھی دنیا کس کی ہوگی، جس کا اللہ تعالیٰ سے تعلق جڑا ہوا ہو، اور جس کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے آباد ہو۔ اس کی یاد سے آباد ہو، لہٰذا یہ باتیں "حسنة" کے اندر داخل ہیں۔

آخرت کی "حسنة" کیا ہیں؟

آخرت کی "حسنة" جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ذکر فرمایا ہے، وہ صرف جنت کی حسنہ کی جھلک دکھانے کے لیے ذکر فرمایا ہے، ورنہ اصل حسنہ کا پتہ وہاں جا کر ہوگا۔ مثلاً یہ ذکر فرمادیا کہ وہاں پر پھل ہوں گے، وہاں پر پرندوں کا گوشت ہوگا، وہاں پر جو تم چاہو گے وہ ملے گا، وہاں پر دودھ کی، شراب کی اور شہد کی نہریں ہوں گی، وہاں پھلوں کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہوں گی، اس میں پھل لگے ہوئے ہوں گے، جب چاہو گے توڑ لوگے وغیرہ۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ تم ان نعمتوں کو ابھی سمجھ نہیں سکو گے، جب تک تم وہاں پہنچ نہیں جاؤ گے۔ لہٰذا یہ دعا کرتے وقت دل میں ان سب چیزوں کا تصور کرلیا کرو۔

دعا کا آخری جملہ

اس دعا کے آخر میں ایک جملہ فرمادیا کہ:

وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اے اللہ! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لیجیے گا۔ آگ کے عذاب سے بچا لیجیے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا میں بھی اچھائی مل گئی اور آخرت میں بھی اچھائی مل گئی، تو پھر اس جملہ کی کیا ضرورت؟ اس لیے کہ آخرت کی اچھائی تو اس وقت ملے گی جب جہنم کے عذاب سے بچاؤ ہوجائے، تو پھر وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کہنے کی کیا ضرورت؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چلو، دنیا میں بھی اچھائی مل گئی اور آخرت میں بھی اچھائی مل گئی، یعنی جنت مل گئی، لیکن کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس سے کبھی نہ کبھی کوئی غلطی، کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو، کبھی آنکھ بہک گئی، کبھی زبان بہک گئی، کبھی اعضاء اور جوارح بہک گئے، اگر بالفرض بحیثیت مجموعی کسی آدمی نے ایک مؤمن کی زندگی گذاری، تو اصل اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ پہلے ان گناہوں کی سزا جہنم میں بھگتو، پھر تمہیں جنت میں بھیجیں گے۔ لہٰذا اس اعتبار سے تمہارے آخرت میں حسنۃ یعنی بالآخر جنت تو ہے۔ جس کے بارے میں حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ جس نے ایک مرتبہ "لا إله الا الله" دل سے کہہ دیا، وہ جنت میں داخل ہوگا،[1] یہ "حسنة" ہے۔

جہنم میں صفائی کے لیے ڈالا جائے گا

لیکن اگر دنیا میں غلط کام کیے ہوں گے، تھوڑے یا زیادہ تو اصل قانون یہ ہے کہ آگ کے ذریعہ تمہاری صفائی ہوگی۔ اس کے بعد تمہیں جنت میں بھیجا جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بچانے کا یہ جملہ سکھادیا کہ یہ کہو وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یا اللہ! جہنم میں جانے سے بچا لینا۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ پہلے جہنم میں بھیج دیا جائے، اور بعد میں جنت میں بھیجا جائے، بلکہ یا اللہ! مجھے ڈائریکٹ اور سیدھا جنت بھیج دیجیے گا۔ بہرحال! جہنم میں بھیجے جانے کا جو تھوڑا سا اندیشہ تھا، وہ بھی ﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ کے ذریعہ دور کردیا۔

---

(۱) صحيح البخاری ۷ / ۱۴۹ (۵۸۲۷)

مسلمانوں پر جہنم میں نیند اور غشی طاری ہوجائے گی

اگرچہ بعض احادیث[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی مسلمان کو اس کے برے عمل کی وجہ سے جہنم میں ڈالا جائے گا تو مسلمان کو کافروں کی طرح جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا، بلکہ جیسے ہی جہنم میں ڈالا جائے گا اور وہاں پر وہ چیخ وپکار کرے گا، اس وقت اس پر نیند اور غشی طاری کردی جائے گی۔ مسلمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ یہ معاملہ کریں گے۔ لیکن یا اللہ! وہ تھوڑی دیر کی چیخ وپکار بھی مجھ سے برداشت نہیں۔ اے اللہ! جہنم کے عذاب سے اپنی رحمت سے ہماری مکمل حفاظت فرمادیجیے گا۔

دعا قبول اور بیڑا پار

غور کیجیے، جتنے امکانات کسی غلط انجام کے ہوسکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے تین جملوں کے ذریعہ دعا سکھا کر دور کردیئے۔ لہٰذا یہ دعا بکثرت مانگو:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ

اگر صرف یہ ایک دعا ہماری قبول ہوجائے اور کیوں قبول نہیں ہوگی؟ وہ خود کہہ رہے ہیں کہ ہم سے مانگو تو ضرور یہ دعا قبول ہوگی تو ان شاء اللہ، دنیا کا بھی بیڑا پار ہوجائے گا اور آخرت کا بھی بیڑا پار ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کی حقیقت سمجھ کر مانگنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ۱۷۲ (۱۸٤)

دعاؤں کی تلاوت نہیں کرنی

یاد رکھیے، دعاؤں کی تلاوت نہیں کرنی، بلکہ دعاؤں کو مانگنا ہے، بغیر سوچے سمجھے دعاؤں کو پڑھتے چلے گئے تو یہ دعا کرنا نہ ہوا، بلکہ یہ تلاوت ہوئی، لہٰذا جب دعا مانگو تو یہ سوچ سمجھ کر مانگو کہ میں کیا مانگ رہا ہوں، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کیا عطا فرمانے والے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہماری تمام دعاؤں کو قبول فرمائے۔ آمین۔

دعا نمبر ۲

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

فہرستِ مضامین

دعا نمبر ۲

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ، وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنۡ تَبِعَهُمۡ بِاِحۡسَانٍ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ اَمَّا بَعۡدُ!

تمہید

گذشتہ اتوار سے "مناجات مقبول" کی دعاؤں کی کچھ تشریح شروع کی تھی، اور جو اس کی پہلی قرآنی دعا ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّ فِي الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ[1]

اس دعا کے بارے میں کچھ گذارشات پیش کی تھیں، اللہ تعالیٰ یہ دعا مانگنے اور مانگتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس دعا کو ہمارے حق میں قبول فرمائے اور دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

---

(۱) سورة البقرة :آیت (۲۰۱)

دوسری دعا

دوسری دعا بھی قرآنِ کریم کی دعا ہے، اور "مناجاتِ مقبول" میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے جو دعائیں جمع کی ہیں، اور وہ قرآنی ترتیب سے جمع کی ہیں، وہ دعا یہ ہے:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱)

اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دیجیے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں صبر دے دیجیے، بلکہ یہ فرمایا کہ ہم پر صبر انڈیل دیجیے، اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرمایئے، اور کافر قوموں کے مقابلے میں ہماری امداد اور نصرت عطا فرمایئے۔ اور ان پر فتح یاب فرمایئے۔

اس دعا کا پسِ منظر

اس دعا کا خاص پسِ منظر ہے، جو قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے کہ یہ دعا کب مانگی گئی تھی؟ اور کس نے مانگی تھی؟ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قرآنِ کریم میں نازل فرما کر ہمیشہ کے لیے اور رہتی دنیا تک اس کو اہم دعا قرار دے دیا۔ اس دعا کا پسِ منظر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات دے دی، اور آپ بنی اسرائیل کو لے کر سمندر کے پار آ گئے، تو بنی اسرائیل اصل میں "فلسطین" کے رہنے والے اور وہیں پلے بڑھے تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے والد تھے، وہ بھی وہیں رہتے تھے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۵۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا حکم

حضرت یوسف علیہ السلام کا مشہور واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مصر کا بادشاہ بنا دیا، ان کے بادشاہ بننے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد بنی اسرائیل "فلسطین" سے مصر منتقل ہوگئے، اس لیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام یہ چاہتے تھے کہ ان کا خاندان یہاں مصر میں آ کر آباد ہوجائے، کچھ عرصہ تک ان کی اچھی زندگی گزری، بعد میں مصر پر "فرعون" کی حکومت ہوگئی اور انہوں نے "بنی اسرائیل" کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان کے اوپر یہ ذمہ داری سونپی کہ آپ ایک طرف تو لوگوں کو ہدایت دیں اور دوسری طرف بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلا کر واپس ان کو اپنے اصل وطن "فلسطین" میں آباد کریں۔

عمالقہ سے جہاد کا حکم

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو شکست دی، اور وہ دریا میں غرق ہوگیا۔ اور یہ دریا کے پار "صحرائے سینا" میں اتر گئے، اور "صحرائے سینا" سے فلسطین کی طرف راستہ جاتا تھا۔ اب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسی علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب ان کو "فلسطین" لے جاؤ اور وہاں پر ان کو آباد کرو۔ اور اس دوران "فلسطین" پر ایک بہت طاقتور قوم جو "عمالقہ" کہلاتی تھی، وہ قابض تھی۔ جب وہاں جانے کا وقت آیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "بنی اسرائیل" سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ تم "فلسطین" چلو، اور وہاں پر تمہیں "عمالقہ" سے جہاد کرنا پڑے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کا جواب

چونکہ بنی اسرائیل کی طبیعت میں نافرمانی تھی، اس لیے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں مانی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دیا کہ:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (۱)

تم اور تمہارا "اللہ" جا کر لڑیں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔

اور کہا کہ:

اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا (۲)

وہاں پر بہت طاقتور قسم کے لوگ آباد ہیں۔ "عمالقہ" بہت طاقتور لوگ تھے۔ اور جب تک وہ لوگ وہاں سے نکل نہیں جاتے، اس وقت تک ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے، اور جب وہ وہاں سے نکل جائیں گے، تب ہم داخل ہوجائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ سے فریاد

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ (۳)

---

(۱) سورۃ المائدہ: آیت (۲٤)

(۲) سورۃ المائدہ: آیت (۲۲)

(۳) سورۃ المائدہ: آیت (۲۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ یا اللہ! میں تو صرف اپنی جان کا مالک ہوں، اور اپنے بھائی حضرت ہارون پر اختیار ہے، اور یہ لوگ نافرمان ہیں۔ میری بات نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا جب یہ لوگ وہاں نہیں جانا چاہتے تو اس کی سزا میں ان کو اس "میدانِ تیہ" میں بھٹکنا پڑے گا، اور ان کو کسی شہر میں داخل ہونا نصیب نہ ہوگا۔ "میدانِ تیہ" کو "صحرائے سینا" بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ چالیس سال تک اس "صحرائے سینا" میں بھٹکتے رہے۔

حضرت یوشع علیہ السلام کا غیرت دلانا

اسی دوران اس "صحرائے سینا" میں موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہوگیا۔ ان کے نائب حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے، یہ وہی یوشع ہیں جنہیں ساتھ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تیار کیا، اور کہا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا بڑی نعمت ہے۔ اور اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی، تم اللہ کے راستے میں جہاد شروع کرو، اور چنانچہ جہاد شروع ہوا، اور کچھ بستیاں حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں فتح ہوگئیں۔

طالوت کو بادشاہ بنایا جانا

لیکن فلسطین کا بہت بڑا حصہ اس طاقتور قوم "عمالقہ" کے ہاتھ میں تھا، جن سے یہ لوگ بہت ڈرتے تھے۔ جب ان بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اب تم اس

"عمالقہ" سے جہاد کر کے ان سے یہ علاقے واپس لو تو انہوں نے جواب دیا کہ اچھا تو آپ ہمارے درمیان کوئی بادشاہ بنادیں، پھر ہم اس بادشاہ کے زیرِ نگرانی جہاد کریں گے۔ چنانچہ اس وقت کے پیغمبر حضرت شموئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اس دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو ان کا بادشاہ بنادیا، اور حکم دیا کہ اب تم ان کی سرکردگی میں جہاد کرو، جس کا ذکر سورۂ بقرۃ میں آیا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا

طالوت کے بادشاہ بننے پر اعتراض

لیکن چونکہ ان کے مزاج میں نافرمانی تھی، اس لیے شروع میں ان پر بھی اعتراض کیا کہ:

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ [1]

کہنے لگے کہ یہ طالوت ہم پر کیسے بادشاہ بن سکتا ہے؟ ہم اس کے مقابلے میں سلطنت کے زیادہ حق دار ہیں۔ لیکن بالآخر حضرت شموئیل علیہ السلام نے ان کو آمادہ کیا، اور ان سے کہا کہ تم طالوت کے زیرِ نگرانی "عمالقہ" سے جہاد کرو۔

دریا سے پانی نہ پینے کا حکم

جب وہاں سے روانہ ہوئے تو اب دیکھنا یہ تھا کہ ان میں سے کون دشمن

---

(۱) سورة البقرة: آیت (۲۴۷)

کے مقابلے میں ثابت قدم رہے گا؟ اس لیے کہ دشمن بڑے طاقتور اور قدآور لوگ تھے، پہلوان قسم کے لوگ تھے۔ چنانچہ ان کی آزمائش کے لیے حضرت شموئیل علیہ السلام نے پورے لشکر میں یہ اعلان کیا کہ اب ہم دریائے اردن کے اوپر سے گزریں گے۔ اس لیے کہ دریائے اردن کے پار فلسطین کا علاقہ آتا ہے، اور وہ اب بھی یہودیوں کے قبضے میں ہے، اور اس وقت عمالقہ کے قبضہ میں تھا، جب یہ لوگ دریائے اردن پر پہنچے تو حضرت شموئیل علیہ السلام نے لوگوں سے کہا کہ تم دریائے اردن سے پانی مت پینا، ایک دو چلّو پانی پینے کی اجازت ہے، لیکن پیٹ بھر کر پانی پینے کی اجازت نہیں، اور نہ اس پانی کا ذخیرہ کرنے کی اجازت ہے۔

پانی سے منع کرنا ایک آزمائش تھی

اور پانی نہ پینا، اور میری بات مان لینا، یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ وہ میرا ہے، یعنی میرے لشکر میں رہنے کا حق دار ہے، اور میرا ہونے کی وجہ سے میں اس کے حق میں دعا کروں گا، اور وہ اس جہاد کے اندر میرا ساتھی بنے گا۔ اور جو میرے اس حکم کی نافرمانی کرے گا اور اس دریا سے پیٹ بھر کر پانی پی لے گا تو وہ میرا آدمی نہیں ہے۔ درحقیقت حضرت شموئیل علیہ السلام پانی پینے کو اس بات کی علامت مقرر فرمائی کہ کون میری اطاعت کرتا ہے اور کون میری نافرمانی کرتا ہے۔ اس لیے کہ جنگ اور جہاد میں صبر اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے، اور امیر کی اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا دیکھنا یہ تھا کہ کون اطاعت کرنے والا ہے؟ اور کون ثابت قدم رہنے والا ہے؟

جو پانی نہیں پیے گا وہ میرا ہے

وہ علاقے ایسے ہیں کہ وہاں پانی کم یاب ہے۔ اب سفر کر رہے ہیں، جہاد کے لیے جا رہے ہیں، پیاس بھی شدت سے لگی ہوئی ہے، اور درمیان میں دریا آ گیا، اور دریا پار کر کے دشمن سے مقابلہ ہونے والا ہے، لہٰذا کچھ پانی پی کر تازہ دم ہو جائیں۔ لیکن حکم یہ آ گیا کہ تمہیں دریا سے پانی نہیں پینا، اور یہ ایک کڑی آزمائش تھی۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت شموئیل علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ

یعنی جو شخص اس دریا سے پانی نہیں پیے گا، وہ میرا ہے، اور میرے لشکر میں ہے، الّا یہ کہ ایک آدھ چلّو پیاس بجھانے کے لیے پی لیا۔

اکثر لوگوں نے پانی پی لیا

اللہ بچائے، ان بنی اسرائیل کی سرشت میں نافرمانی تھی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ:

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ [1]

کہ سب لوگوں نے اس دریا سے خوب پانی پیا، البتہ کچھ لوگ ایسے تھے جو نبی (علیہ السلام) کی اس ہدایت پر ثابت قدم رہے، اور انہوں نے پانی نہیں پیا۔ درحقیقت یہ نبی کی طرف سے ایک آزمائش بھی تھی، اور ایک تعلیم بھی تھی کہ

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۴۹)

بندے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں لگا رہے، چاہے اس کی نفسانی خواہشات اس کو کسی طرف بھی بلا رہی ہوں، وہ ان خواہشات کو کچل کر، ان کو پامال کر کے، ان کو پیچھے ڈال کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کی پیروی کرے۔ جو یہ کرے گا اس کو فتح نصیب ہوگی۔

پانی پینے کا نتیجہ

نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان میں سے اکثر لوگ اسی دریا کا پانی پی کر وہاں سے آگے بڑھے تو ان کے سامنے "عمالقہ" کا زبردست لشکر نظر آیا۔ اور ان کا جو سردار تھا، اس کا نام "جالوت" تھا۔ جو بڑا قوی ہیکل تھا، اور بڑا طاقتور تھا۔ اور وہ مسلسل لوگوں کو چیلنج دے رہا تھا کہ: هل من مبارز؟ کوئی مقابل ہو تو وہ میرے مقابلے پر آئے۔ جب بنی اسرائیل کے لشکر نے یہ منظر دیکھا تو جن لوگوں نے دریا سے پانی پیا تھا، وہ کہنے لگے:

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ [1]

آج ہمارے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم جالوت اور اس کے لشکر سے ٹکرائیں۔

جنہوں نے پانی نہیں پیا تھا، ان کی کیفیت

لیکن جن لوگوں نے دریا سے پانی نہیں پیا تھا، بلکہ حضرت شموئیل علیہ السلام کے

---

(۱) سورة البقرة: آیت (۲۴۹)

حکم کی اطاعت کی تھی، انہوں نے جب یہ منظر دیکھا کہ سامنے اتنا بڑا لشکر موجود ہے، وہ قوی ہیکل لوگ ہیں اور ہتھیاروں سے مسلح ہیں، جب کہ دوسری طرف ہمارے لشکر کے بہت سے ساتھی پھسل گئے ہیں، اور اب ہم تھوڑے آدمی ان کا مقابلہ کرنے کے لیے رہ گئے ہیں، لیکن انہوں نے یہ کہا کہ:

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (١)

ارے! تم ڈرتے کیوں ہو؟ فتح اور نصرت انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں، جنہوں نے بہت سی بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے فتح پائی ہے۔ فتح دینے والا، نصرت کرنے والے اور دشمن سے بچانے والے، یہ ہتھیار نہیں ہوتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی فتح دینے والے، اور دشمن سے بچانے والے ہیں۔

دوسروں کی ہمت افزائی کرنے لگے

بہر حال! ایک طرف تو ان لوگوں نے یہ جملہ کہہ دیا کہ اگر تمہارے دلوں میں دشمن کا ڈر اور خوف پیدا ہو رہا ہے تو اس ڈر اور خوف کو نکال دو، اس لیے کہ تم اللہ کے نام پر نکلے ہو۔ اور اللہ کے لیے نکلے ہو، اگر چہ تمہاری جماعت چھوٹی ہے، اور تمہاری تعداد کم ہے۔ تو ڈرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعتیں بھی بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں۔ ایک طرف لوگوں کو یہ حوصلہ دیا۔

---

(١) سورة البقرة: آیت (٢٤٩)

اللہ تعالیٰ سے دعا

اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے مانگا، اور کہا:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ (1)

یعنی اے اللہ! ہم یہ بات تو کہہ رہے ہیں کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں، لیکن یہ اس وقت غالب آتی ہیں، جب آپ کی طرف سے صبر کرنے کی توفیق ملتی ہے، اور ثابت قدمی کی توفیق ملتی ہے۔ پھر آپ مدد فرماتے ہیں، پھر آپ کی طرف سے کافروں کے مقابلے میں نصرت آتی ہے۔

ہمارے اوپر صبر انڈیل دیجیے

یہاں جو لفظ لائے ہیں، وہ یہ ہے کہ:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا

اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر صبر انڈیل دیجیے۔

دیکھیے! یہاں یہ الفاظ بھی کہے جاسکتے تھے کہ ہمیں صبر عطا فرمادیجیے، ہمیں صابر بنا دیجیے۔ ان کے بجائے یہ فرمایا کہ ہم پر صبر انڈیل دیجیے۔ گویا کہ صبر ایک مشروب ہے، پینے کی چیز ہے۔ اور پینے کی جو چیز ہوتی ہے، اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ مثلاً گلاس رکھا ہے، اور اس میں پانی موجود ہے، اور آدمی اٹھا

(1) سورۃ البقرۃ :آیت (۲۵۰)

کر وہ پانی پی لیتا ہے، اس عمل میں اختیار ہے، اس لیے کہ جب گلاس میں پانی موجود ہے، تو آپ اس وقت اس پانی کو پی سکیں گے، جب آپ اپنے اختیار سے اس گلاس کو اٹھائیں۔ اور منہ سے لگائیں، اور گھٹ گھٹ کر کے پی جائیں۔

صبر انڈیل دینے کا مطلب

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی وہ پانی پینا ہی نہیں چاہتا، جیسے چھوٹے بچے ہوتے ہیں، جب ان کو دوا پینے کا کہو تو وہ نہیں مانتے۔ اب وہ بچہ اپنے اختیار سے تو دوا نہیں پیے گا۔ اب اس دوا کو زبردستی اس کو پکڑ کر اس بچے کے منہ میں انڈیلنا پڑے گا۔ بالکل یہی معاملہ اس دعا کے اندر مانگا جارہا ہے کہ یا اللہ! ہم کمزور ہیں، اور ہمارے بہت سارے ساتھی پیچھے ہٹ رہے ہیں، اے اللہ! آپ ہم پر زبردستی صبر انڈیل دیجیے۔ اس لیے ہم اپنے اختیار سے صبر کا گھونٹ نہیں پینا چاہ رہے ہیں، کیوں کہ سامنے کا منظر بڑا ہولناک نظر آرہا ہے، اور بڑی طاقتور اور قدآور قوم ہمارے سامنے ہے، اور ہم میں مقابلہ کرنے والے تھوڑے لوگ رہ گئے ہیں۔ اور ہمیں خود سے تو صبر نہیں آرہا ہے، لیکن آپ ہم پر صبر انڈیل دیجیے۔

صبر کیا چیز ہے؟

وہ صبر کیا چیز ہے؟ جس کو جنگ سے پہلے مانگا کہ ہم پر انڈیل دیجیے گا، عام طور پر صبر کے معنی یہ کیے ہیں کہ جب انسان پر کوئی مصیبت آجائے، تو انسان اس پر کوئی جزع فزع نہ کرے، گھبراہٹ کا اظہار نہ کرے وغیرہ۔ لیکن

قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "صبر" بہت وسیع چیز ہے، وہ یہ کہ انسان اپنی نفسانی خواہش اور نفسانی جذبات سے لڑ کر زبردستی ان پر قابو پائے۔ اس کا نام صبر ہے۔ مثلاً دل میں یہ خواہش پیدا ہورہی ہے کہ فلاں ناجائز چیز کو دیکھوں، لیکن زبردستی اس پر روک عائد کر کے یہ تہیہ کرلیا کہ میں اس کو نہیں دیکھوں گا، یہ صبر ہے۔

نیک بندوں کا صبر

جیسا کہ اوپر بنی اسرائیل کے واقعہ میں آپ نے دیکھا کہ بنی اسرائیل سفر کی حالت میں ہیں، پیاس شدید لگ رہی ہے، دشمن سے مقابلہ ہونے والا ہے۔ اس وقت دل کی خواہش یہ تھی کہ خوب جم کر پانی پیو، لیکن جن لوگوں کو روکا گیا تھا، اور جو اللہ کے نیک بندے تھے، انہوں نے اپنی نفسانی خواہش کو پامال کر کے اور اس کو روند کر اپنے آپ کو پانی پینے سے روکا، یہ ان کا صبر تھا۔

دشمن کے مقابلے میں صبر عطا فرما

اسی طرح جب ہم دشمن کے مقابلے میں آرہے ہیں تو "نفس" تو یہ کہہ رہا ہے کہ ان سے ٹکر لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ یہ لوگ بڑے طاقتور، قوی ہیکل لوگ ہیں، یہ تو ہمیں مار ڈالیں گے۔ اور اس وقت "جالوت" میدان میں چیلنج دیتا پھر رہا ہے کہ کوئی ہے جو میرا مقابلہ کرے، لیکن کوئی بھی اس کے مقابلے کے لیے نہیں آرہا ہے۔ ایسی حالت میں عافیت اسی میں ہے کہ واپس چلے جاؤ، لیکن اے اللہ! نفس کی اس خواہش کے مقابلے میں اس کو پامال کر کے

ڈٹ جانے کی ہمیں طاقت دیجیے، اور صبر ہم پر انڈیل دیجیے۔

صبر کے نتیجے میں ثابت قدم رہیں گے

اور یہ جب آپ ہم پر صبر انڈیل دیں گے، اور زبردستی ہم پر صبر ڈال دیں گے، اس کے نتیجے میں ﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ ہمیں دشمن کے مقابلے کے وقت ثابت قدم رکھیے۔ اس لیے کہ جب صبر آئے گا، اور اپنی نفسانی خواہشات کچلنے کا جذبہ پیدا ہوگا، تو ثابت قدمی آئے گی، اور جب ثابت قدمی آئے گی تو پھر دشمن چاہے کتنا بڑا طاقتور رہو، ہم اس کا مقابلہ کرسکیں گے۔ اور جب ہم ثابت قدم ہوں گے تو اے اللہ! آپ کی مدد آئے گی۔

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

آپ ان کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرمائیے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا ان کے دلوں میں ڈالی اور انہوں نے اس کے ذریعہ سے اللہ سے مانگا۔

پھر ہم نے دشمن کو شکست دے دی

اور جب ایک طرف انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کیا، اور نہر سے پانی نہیں پیا، اور دشمن سے مقابلے کے لیے آ کھڑے ہوئے، اور ہم سے مدد مانگی، ہم سے صبر مانگا، ہم سے ثابت قدمی مانگی، اور ہم سے نصرت مانگی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ [1]

تو انہوں نے اللہ کے حکم سے اتنے بڑے طاقتور دشمن کو شکست دے دی، اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔

عام جنگ سے پہلے "جالوت" کی مبارزت طلبی

"جالوت" کو کس طرح قتل کیا؟ قرآنِ کریم نے یہاں اس کی تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ البتہ روایات [2] میں آتا ہے کہ یہ "جالوت" بہت بڑا پہلوان تھا۔ اور تین دن سے "مبارز" طلبی کے لیے میدانِ جنگ میں چکر لگا رہا تھا۔ یعنی اپنے مقابلے کی دعوت دے رہا تھا کہ کوئی میرے مقابلے کے لیے آئے۔

پہلے زمانے میں جو جنگ ہوتی تھی، اس میں عام جنگ شروع ہونے سے پہلے انفرادی مقابلے ہوتے تھے، ایک آدمی لشکر سے نکلتا، اور دوسرے لشکر کو مقابلے کی دعوت دیتا کہ میرے مقابلے کے لیے کوئی آئے، اس کو "مبارزت" کہا جاتا ہے، بہرحال! تین دن سے یہ "مبارزت" کر رہا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی میدانِ جنگ میں آمد

لیکن یہ اتنا قوی ہیکل آدمی تھا، اتنا زبردست تھا، اور اس کے پاس جو ہتھیار تھے، وہ دیکھنے میں اتنے قاتل لگ رہے تھے کہ اس کو دیکھ کر کسی کی ہمت

---

(۱) سورۃ البقرۃ :آیت (۲۵۱)

(۲) تفسیر طبری ٤ / ٤٦٢ و ٤ / ٤٧٨ و تفسیر البغوی ١ / ٣٠٤

نہیں ہو رہی تھی کہ آگے جا کر اس کا مقابلہ کرے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس وقت نوجوان تھے، اور "بیت المقدس" سے کچھ فاصلے پر ایک بستی میں رہتے تھے، ان کے تین بڑے بھائی بنی اسرائیل کی طرف سے اس جنگ میں شریک تھے، اور یہ چونکہ نوعمر تھے، اس لیے اپنے والد کی خدمت کے لیے گھر میں مقیم تھے، اور جب جنگ کو تین دن گزر گئے، تو ان کے والد صاحب نے ان سے کہا کہ تمہارے تین بھائی لڑنے کے لیے گئے ہوئے ہیں، تم جاؤ، اور ان کی خبر لے کر آؤ کہ ان کا کیا حال ہے؟ چنانچہ یہ اپنے بھائیوں کی خبر لینے کے لیے وہاں پہنچے، لڑنے کے ارادے سے نہیں گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا

جب وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ جالوت میدان میں چکر لگا رہا ہے، اور مبارزت طلب کر رہا ہے، اور بھڑکیاں مار رہا ہے کہ کوئی آئے میرے مقابلے کے لیے۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ کوئی شخص اس کے مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا ہے تو ان کو غیرت آئی کہ اتنی دیر سے یہ آوازیں لگا رہا ہے، لیکن کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ تو "طالوت" جو بادشاہ تھے، ان کے پاس گئے، اور ان سے جا کر کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کے مقابلے کے لیے چلا جاؤں؟ "طالوت" نے ان سے کہا کہ تم نوجوان آدمی ہو، اور یہ پرانا گھاگ ہے، دیکھ لو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا کہ نہیں، بس آپ اجازت دے دیں۔ چنانچہ طالوت نے اجازت دے دی۔ اور یہ بڑا سا پتھر اٹھا کر "جالوت" کے مقابلے کے لیے گئے۔ اور "بسم اللہ" پڑھ کر وہ پتھر زور سے "جالوت" کو مارا، اور اس

زور سے مارا کہ اللہ تعالیٰ نے "جالوت" کو وہیں ڈھیر کردیا۔ وہ پتھر جالوت کے سر پر لگا، اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس وجہ سے قرآنِ کریم نے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا کہ

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ [1]

بس جالوت کا قتل ہونا تھا کہ اس کی پوری فوج میں سراسیمگی پھیل گئی، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت شموئیل عَلَیْہِ السَّلَام اور طالوت کو عمالقہ پر فتح عطا فرمادی۔

پہلے اپنے حصے کا کام کرو، پھر مدد آئے گی

بہر حال! یہ وہ دعا ہے جو سارے اس پسِ منظر میں سکھائی گئی تھی کہ:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

اور اس کے ذریعہ بتایا جارہا ہے کہ جب بندہ اپنے حصے کا کام کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو رَدّ نہیں فرماتے۔ ہوتا یہ ہے کہ بندہ اپنے حصے کا کام نہیں کرتا، بلکہ الٹ کررہا ہوتا ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ مجھے نجات دے دو۔ حالانکہ بندہ کا کام یہ ہے کہ جتنی اس کی طاقت ہے وہ صَرف کرلے، اور وہاں طاقت یہ تھی کہ دریا سے پانی نہ پیتے، اور دریا پار کرکے دشمن کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ لہٰذا قدم آگے بڑھائے، اور ایک منزل کی طرف چلے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگا کہ:

---

(۱) سورۃ البقرۃ :آیت (۲۵۱)

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم نے اپنے حصے کا کام کرلیا، اور اب میں اپنے حصے کا کام کرتا ہوں۔

آج کل کی حالت اور ہمارا طرزِ عمل

یہ تو جنگ اور جہاد کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی جہاد کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ آج کل "عمالقہ" سے زیادہ طاقتور لوگ پوری دنیا میں ہم پر مسلط ہیں، اور ہم نے ان کے آگے ہتھیار ڈالے ہوئے ہیں۔ اور ہم کچھ کر بھی نہیں رہے ہیں، لیکن بس بیٹھے ہوئے مانگ رہے ہیں۔ تو اپنے حصے کا کام کیے بغیر بندہ اللہ سے مانگے، تو اللہ بچائے۔ یہ ایک طرح سے اللہ تعالیٰ سے مذاق ہے۔ عمل ایسا ہے جیسے ایک آدمی دوڑتا ہوا مغرب کی طرف جا رہا ہے، اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ یا اللہ! مجھے مشرق میں پہنچا دیجیے۔ یہ دعا نہیں، بلکہ مذاق ہے۔

اپنے نفس سے جہاد کرو

اس پورے واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ سکھا دیا کہ تم اپنے حصے کا کام کرلو، اور پھر مجھ سے مانگو۔ بہرحال! یہ تو جہاد کے کا موقع تھا، اور ایک جہاد وہ ہے جو ہم ہر وقت اپنے نفس سے کرتے ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ:

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ.[1]

مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے۔

یہ نفس ہمارا بہت موٹا ہو چکا ہے، یہ نفس "جالوت" بنا ہوا ہے، یہ ہمیں حرام اور ناجائز کاموں کی طرف ابھار رہا ہے، یہ نفس ہماری نظروں کو خراب کر رہا ہے، یہ ہماری زبانوں کو خراب کر رہا ہے، ہمارے کانوں کو خراب کر رہا ہے، یہ ہمارے دلوں کو خراب کر رہا ہے، ہمارے دلوں میں خواہش پیدا کر رہا ہے، خراب جذبات ابھار رہا ہے، آنکھیں غلط استعمال ہو رہی ہے، زبان غلط استعمال ہو رہی ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ہم نے نفسانی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈالے ہوئے ہیں۔

ہم معاشرے سے کیسے لڑیں؟

جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے بندو! اپنی نگاہ کو بچاؤ، اپنی زبانوں کو بچاؤ، گالی گلوچ نہ کرو، دشنام طرازی نہ کرو، غیبت نہ کرو، جھوٹ نہ بولو۔ تو جواب یہ ملتا ہے کہ صاحب ہم تو اسی معاشرے میں رہنے والے ہیں، یہ معاشرہ ان چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم اس معاشرے سے کیسے لڑیں؟ گویا کہ وہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ:

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ

یعنی اس جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی ہمیں طاقت نہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی ۳ / ۲٦٤ (۱٦۲۱) و قال حدیث حسن صحیح، ومسند أحمد ۳۹/ ۳۸٦(۲۳۹٦٥)

گناہوں سے بچنے کا ارادہ تو کرلو

ارے بھائی! اگر تمہارے اندر طاقت نہیں ہے تو کیا تم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے؟ کیا تم یہ ارادہ بھی نہیں کر سکتے کہ آج سے میں اپنی نگاہوں کو اور اپنی زبان کو، اپنے کانوں کو، اپنے اقدامات کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی سے بچانے کا ارادہ کرتا ہوں۔ ارادہ تو کرلو، اور ارادہ کر کے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لو کہ یا اللہ! ماضی میں جو ہوا، وہ ہوگیا، اس کو معاف کردیجیے۔ آئندہ کے لیے ارادہ کرتا ہوں کہ میں یہ نافرمانی نہیں کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو اور کہو:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا

اے پروردگار! ہمیں صبر عطا فرما۔ یعنی نفسانی خواہشات سے جنگ کرنے کی طاقت عطا فرما، اور ہم نے یہ ارادہ تو کرلیا کہ ہم ان نفسانی خواہشات کے پیچھے نہیں چلیں گے۔ اور گناہ نہیں کریں گے، اور لیکن جب نفس وشیطان کے لشکر سے مقابلہ ہوا، اور اس ماحول میں پہنچے جہاں نگاہوں کو پناہ نہیں، کانوں کو پناہ نہیں تو ڈگمگا گئے۔

ہم پر صبر انڈیل دیجیے

اس لیے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہم سے یہ دعا مانگو کہ:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا

اے اللہ! ہم پر ایسے ماحول میں صبر انڈیل دیجیے، اور ہمیں ثابت قدمی عطا

فرمایئے کہ ہم نفس وشیطان کے لشکروں سے گھبرا کر کہیں پھسل نہ جائیں۔ اور یہ نفسِ امارہ وشیطان در حقیقت کافر قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرمایئے کہ ہم ثابت قدم رہیں!

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱)

اللہ سے مدد طلب کرنے کا نتیجہ

اور جب تم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کروگے، اور قدم آگے بڑھاؤ گے تو پھر یہ کہ تم اللہ کے حکم سے نفس کے تقاضوں کو بھی شکست دوگے، اور شیطان کو بھی شکست دوگے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ

اور پھر داؤد جالوت کو قتل کردے گا، یعنی یہ شیطان اور نفس کی خواہشات جو تمہیں بھاری بھر کم نظر آرہی ہیں، یہ سب ڈھیر ہوجائیں گی۔

بہر حال! یہ اس دعا کا پسِ منظر تھا، جو آپ حضرات کے سامنے تفصیل سے عرض کردیا۔

جانے سے پہلے دعا مانگ لو

بہر حال! میں یہ عرض کرتا ہوں کہ جب انسان کو کسی ایسی جگہ پر جانے کا یا بازار میں جانے کا ارادہ ہو، جہاں اس کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ میں کہیں پھسل

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۵۰)

نہ جاؤں، تو جانے سے پہلے یہ دعا مانگے، اور راستے بھر مانگتا جائے، مثلاً! وہ ایک ایسے مجمع میں جا رہا ہے جہاں اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہاں میری نگاہیں بھٹک جائیں گی۔ اور میری زبان پھسل جائے گی۔ تو جانے سے پہلے اور سارے راستے میں یہ دعا مانگتے چلے جاؤ کہ:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ

ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ صبر عطا فرمائیں گے، اور ثابت قدمی عطا فرمائیں گے۔ اور جب یہ عمل کروگے تو اس کے نتیجے میں یا تو اس گناہ سے نجات مل جائے گی، یا اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دے دیں گے، یا مغفرت فرمادیں گے، ان تینوں باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوجائے گی۔

جنت صبر کے نتیجے میں ملے گی

بہر حال! یہ صبر بڑی زبردست چیز ہے، آخرت میں ایمان والوں کو جو جنت ملنے والی ہے، وہ صبر ہی کے نتیجے میں ملنی ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَزٰىهُمۡ بِمَا صَبَرُوۡا جَنَّةً وَّحَرِيۡرًا (۱)

لہٰذا اللہ تعالیٰ سے اس صبر کو مانگتے رہنا چاہیے کہ ہم نفس وشیطان کے مقابلے میں ڈٹ جائیں، اور اپنے نفس پر زبردستی کرنے کا نام "صبر" ہے، یہ

---

(۱) سورة الدهر: آیت (۱۲)

رمضان کا مہینہ ہے، اس کو حدیث شریف میں "شہر الصبر" [1] کہا ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، یعنی صبر کی ٹریننگ کا مہینہ ہے۔ اور جس طرح وہاں بنی اسرائیل کو یہ کہا گیا تھا کہ "دریا" سے پانی مت پینا، اسی طرح رمضان المبارک میں تم سے کہا جا رہا ہے کہ صبح صادق سے غروب آفتاب تک پانی مت پینا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بندہ اطاعت کرتا ہے یا نہیں؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے صبر، استقامت اور گناہوں سے بچنے کی ہمت اور حوصلہ مانگتے رہیں۔

پوری امتِ مسلمہ کے لئے دعائیں کریں

اور صرف اپنے لیے نہ مانگیں، بلکہ اپنے ملک کے لیے، پوری امت کے لیے مانگیں کہ یا اللہ! جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب ہماری شامتِ اعمال کا نتیجہ ہے، اپنی رحمت سے اس کو ہم سے دور فرمادیں، یا اللہ! پاکستان کے حالات بہتر کر دیجیے، شام کے حالات بہتر کر دیجیے، لیبیا اور سعودی عرب کے حالات، کشمیر اور فلسطین کے حالات بہتر کر دیجیے۔ اس وقت پوری دنیا کے مسلمان طرح طرح کے مصائب اور آلام کا شکار ہیں۔ اگر ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم ہم ان مسلمانوں کو اپنی دعاؤں میں تو یاد رکھ سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ دل کھول کر اللہ تبارک تعالیٰ سے وہ بات کہہ دو جو بات حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی تھی کہ:

أنت أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ! إِلَى مَنْ تَكِلُنِي إِلَى عَدُوٍّ

---

(۱) صحیح ابن خزیمه ۳ / ۱۹۱ (۱۸۸۷) وانظر سنن النسائی ٤ / ۲۱۸(۲٤۰۸)

يَتَجَهَّمُنِي أَمْ إِلَى قَرِيبٍ مَلَّكْتَهُ أَمْرِي.[1]

یا اللہ! آپ ہمیں کس کے حوالے کر رہے ہیں؟ ایک مرتبہ دل سوزی کے ساتھ دردمندی کے ساتھ دعا کرلو، کیا بعید ہے کہ تمہاری دعائیں بھی امتِ مسلمہ کی نجات اور فلاح کا ذریعہ بن جائے۔ اے اللہ! ہماری تمام دعائیں قبول فرما۔ آمین۔

---

(۱) المعجم الكبير للطبرانی ١٤/ ١٣٩ (١٤٧٦٤) وقال الهيثمی فی "المجمع" ٦/ ٣٧ (٩٨٥١): وفيه ابن اسحاق، وهو مدلس ثقة، وبقية رجاله ثقات.

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ
عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا
تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا
اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

فہرستِ مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعا نمبر ۳

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ اِنۡ نَّسِيۡنَآ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعۡفُ عَنَّا وَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا اَنۡتَ مَوۡلٰٮنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ، وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنۡ تَبِعَهُمۡ بِاِحۡسَانٍ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ اَمَّا بَعۡدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! "مناجاتِ مقبول" کی دعاؤں کی کچھ تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اب تک دو دعاؤں کا بیان ہو چکا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان دعاؤں کو خوب سمجھ کر مانگنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ تیسری دعا جو "مناجاتِ مقبول" میں بیان ہوئی ہے وہ بھی قرآنِ کریم کی دعا ہے، اور سورۃ البقرۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے وہ دعا بیان فرمائی ہے:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ اِنۡ نَّسِيۡنَآ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ

عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱)

اللہ کے نیک بندوں کا قول

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کے آخر میں نیک بندوں کے حوالے سے بیان فرمائی ہے کہ اللہ کے نیک بندے یہ دعا کرتے ہیں، اور اس دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب نازل ہوئی ہے اس کتاب پر رسول بھی ایمان لائے اور مؤمن بھی ایمان لائے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

یہ سب (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) اللہ پر ایمان لائے، اللہ کے تمام فرشتوں پر ایمان لائے، اللہ کی تمام کتابوں پر ایمان لائے، اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

وہ سب یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۲۸۶)

ہے، اس پر کوئی عُجب اور اِترانا نہیں ہے، بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! اس عبادت کا جو حق تھا وہ تو مجھ سے ادا نہیں ہوسکا، لہٰذا میں آپ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ نیک بندوں کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ عمل بھی کررہے ہیں اور ساتھ میں ڈر بھی رہے ہیں، چنانچہ ایک اور جگہ فرمایا کہ:

يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (۱)

جو عمل بھی کرتے ہیں، اسے کرتے وقت ان کے دل اس بات سے سہمے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے۔

یعنی عمل کرتے ہوئے ان کے دل میں ڈر ہوتا ہے کہ پتہ نہیں یہ عمل جیسا ہونا چاہیے ویسا ہوا یا نہیں؟ لہٰذا وہ لوگ اللہ سے مغفرت مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری مغفرت کردیجیے اور ہمیں بخش دیجیے۔

سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں

دوسری جگہ فرمایا کہ:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ (۲)

یعنی وہ اللہ کے نیک بندے رات کو بہت کم سوتے ہیں اور

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۶۰)

(۲) سورۃ الذاریات: آیت (۱۷)

ہے، اس پر کوئی عُجب اور اِترانا نہیں ہے، بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! اس عبادت کا جو حق تھا وہ تو مجھ سے ادا نہیں ہوسکا، لہٰذا میں آپ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ نیک بندوں کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ عمل بھی کررہے ہیں اور ساتھ میں ڈر بھی رہے ہیں، چنانچہ ایک اور جگہ فرمایا کہ:

يُؤْتُونَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ [1]

جو عمل بھی کرتے ہیں، اسے کرتے وقت ان کے دل اس بات سے سہمے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے۔

یعنی عمل کرتے ہوئے ان کے دل میں ڈر ہوتا ہے کہ پتہ نہیں یہ عمل جیسا ہونا چاہیے ویسا ہوا یا نہیں؟ لہٰذا وہ لوگ اللہ سے مغفرت مانگتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری مغفرت کردیجیے اور ہمیں بخش دیجیے۔

سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں

دوسری جگہ فرمایا کہ:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ [2]

یعنی وہ اللہ کے نیک بندے رات کو بہت کم سوتے ہیں اور

---

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۶۰)

(۲) سورۃ الذاریات: آیت (۱۷)

سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں۔

استغفار اس بات سے کرتے ہیں کہ یا اللہ! رات میں جو عبادت ہم سے بن پڑی، وہ تو کرلی، لیکن اس عبادت میں نہ جانے کتنی خطائیں اور کتنی لغزشیں ہوئیں، اور پتہ نہیں کہ ہم سے عبادت کا حق ادا ہوا یا نہیں؟ لہٰذا ہم اس عبادت سے استغفار کرتے ہیں۔ یہی ایک بندے کا کام ہے کہ کرتا بھی رہے اور ڈرتا بھی رہے۔

یہ عبادات "علامتی افعال" ہیں

اگر کسی بندے کو اپنے کسی عمل پر گھمنڈ ہوگیا العیاذ باللہ اپنے عمل پر ناز ہوگیا کہ میں نے تو بڑا تیر مار لیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وہ عمل بیکار ہوگیا۔ ارے جو کوئی بھی عمل تم سے ہو رہا ہے چاہے وہ نماز ہو، چاہے زکاۃ ہو، چاہے تلاوت ہو، چاہے ذکر ہو، یہ سب درحقیقت علامتی افعال ہیں، جس کو آج کل کی اصطلاح میں "ٹوکن" کہا جاتا ہے، یعنی اپنی محبت کے اظہار کی علامت کے طور پر، یا اپنے تعلق کی علامت کے طور پر کوئی شخص کوئی چیز پیش کردیتا ہے۔

محبت کے اظہار کی علامت

مثلاً کوئی بہت بڑا بادشاہ ہے، اب کوئی معمولی آدمی جاکر اس بادشاہ کو ایک روپیہ بطور ہدیہ کے دیتا ہے، وہ آدمی جانتا ہے کہ یہ ایک روپیہ اس بادشاہ کی نظر میں کیا حقیقت رکھتا ہے، اس لیے کہ وہ بادشاہ تو لاکھوں اور کروڑوں کا مالک ہے، لیکن یہ ایک روپیہ محبت کے اظہار کی علامت ہے کہ ہمیں تم سے محبت ہے، اس

لیے یہ ایک روپیہ پیشِ خدمت ہے۔

رب العالمین کا حق ادا نہیں ہوسکتا

بالکل اسی طرح ہمارے اعمال، چاہے وہ نماز ہو، روزہ ہو، تلاوت ہو، ذکر ہو، یہ سب "علامتی" اعمال ہیں، ان میں سے ایک عمل بھی اللہ جلّ شانہ کے شایانِ شان نہیں، اگر ساری زندگی انسان سجدہ میں پڑا رہے، اور ساری زندگی اللہ کا ذکر کرتا رہے، تب بھی اس کی عظمت اور جلال کا حق ادا نہیں ہوسکتا، اس کے رب العالمین ہونے کا حق ادا نہیں ہوسکتا، اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہوسکتا، لہٰذا یہ سب علامتی اعمال ہیں جن کے ادا کرنے کی اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ اگر وہ ان اعمال کی توفیق نہ دیتے تو ہم سے یہ بھی ادا نہ ہوتے۔

ہر طاعت کے بعد استغفار کرو

لہٰذا ہر طاعت کے بعد استغفار کرو، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے سلام پھیرنے کے بعد پہلا کام یہ کرتے کہ تین مرتبہ پڑھتے "اَسْتَغْفِرُ اللہَ، اَسْتَغْفِرُ اللہَ، اَسْتَغْفِرُ اللہَ"[1]۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق نہیں تھا، لہٰذا اس عمل میں ہم سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان سے ہم استغفار کرتے ہیں، اس لیے فرمایا:

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ٤١٤ (٥٩١)

ہمارا مواخذہ نہ کیجیے گا

اس کے بعد پھر وہ دعا ہے جو میں نے پڑھی تھی کہ:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا.... الخ

اے ہمارے پروردگار! ہمارا مواخذہ نہ کیجیے گا، ہماری گرفت نہ کیجیے گا۔ اگر ہم سے بھول ہوگئی ہو، یا ہم سے چوک ہوگئی ہو۔

یہاں دو لفظ آئے ہیں، ایک "نسیان" یعنی بھول، اور دوسرے "خطا"، اردو میں ان دونوں کا ترجمہ ملاکر "بھول چوک" سے کر سکتے ہیں۔

بھول اور خطا میں فرق

"بھول" یہ ہوتی ہے کہ آدمی کوئی چیز بھول گیا، اس کو یاد نہ رہی، مثلاً نماز کا وقت تھا اور وہ کسی کام میں ایسا مشغول ہوا کہ وہ نماز پڑھنے کو بھول گیا، یہ "نسیان" ہے۔ دوسری چیز "خطا" ہے، یعنی غلطی سے کوئی کام کرلینا، مثلاً وہ یہ چاہ رہا تھا کہ میں کوئی کام کروں، لیکن کچھ اور کرلیا۔ مثلاً چار رکعتیں ادا کرنے کی نیت سے کھڑا ہوا، اور تین رکعت پر سلام پھیر دیا، یہ "خطا" ہے۔ اس دعا میں یہ کہا جارہا ہے کہ یا اللہ! اگر ہم سے بھول ہوجائے تو اس کو بھی معاف کردیجیے، اور اگر کوئی خطا اور غلطی ہوجائے تو اس کو بھی معاف کردیجیے، اس پر بھی گرفت نہ فرمائیے۔

میری امت سے خطا اور نسیان اٹھا لیا ہے

چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث شریف میں ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِيْ الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ. (۱)

میری امت سے اللہ تعالیٰ نے خطا اور نسیان کا گناہ اٹھا لیا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ نماز جیسی اہم عبادت، جس کو کوئی انسان ادا کرنے سے بھول گیا، جب بعد میں اس کو یاد آجائے تو وہ اس کو قضا کرے گا، اس لیے کہ حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ نَامَ عَنْ صَلَاةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ ذٰلِكَ وَقْتُهَا. (۲)

یعنی جو شخص نماز کا ادا کرنا بھول جائے، یا سو جائے اور کوئی نماز قضا ہو جائے تو جونہی اس کو یاد آئے یا جونہی وہ بیدار ہو

---

(۱) سنن ابن ماجه ۳ / ۴۴۵ (۲۰۴۵) من حديث عبد الله بن عباس وقال البوصيری فی مصباح الزجاجة ۲ / ۱۲۶: هذا اسناد صحيح إن سلم من الانقطاع، والظاهر أنه منقطع...الخ و۳ / ۴۴۴(۲۰۳۴) من حديث أبی ذر الغفاری وقال البوصيری فی "مصباح الزجاجة" ۲ / ۱۵۲: هذا اسناد ضعيف لاتفاقهم على ضعف أبی بكر الهذلی. والمعجم الأوسط للطبرانی ۸ / ۱۶۱ (۸۲۷۴) من حديث عبدالله بن عمر وقال الهيثمی فی "المجمع" ٦ / ۳۷۹ (۱۰۵۰٦) وفيه محمد بن مصفى وثقه ابوحاتم وغيره وفيه كلام لايضر و بقية رجاله رجال الصحيح.

(۲) ماخوذ از صحيح البخاری ۱ / ۱۲۲ (۵۹۷) ومصنف ابن ابی شيبة ۳ / ۵۱۴ (۴۷۷۰) والمعجم الأوسط للطبرانی ۸/۳۴۹ (۸۸۴۰)

تو وہ اس کو ادا کرلے۔

اگرچہ نماز کو وقت پر ادا کرنا فرض تھا، لیکن بھول کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وقت پر نماز ادا نہ کرنے کے گناہ کو معاف کردیا۔ اسی طرح نماز کے اندر کوئی غلطی ہوگئی، اگرچہ اس کی غلطی کی وجہ سے سجدہ سہو کرنا ہو، یا اس نماز کو لوٹانا پڑے، لیکن اس غلطی کی وجہ سے گناہ نہیں ہوگا۔

ہم پر ایسا بوجھ مت ڈالیے گا

آگے اس دعا میں فرمایا:

رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا

اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں سے یہ دعا بھی کرائی کہ:

اے اللہ! ہمارے اوپر ایسا بوجھ مت ڈالیے گا جیسا بوجھ ہم سے پہلی امتوں پر ڈالا گیا تھا۔

اس لیے پچھلی امتوں کے لیے جو احکام تھے وہ بہت سخت احکام تھے، مثلاً یہ کہ ان کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتی تھی جب تک کہ وہ انسان اپنے آپ کو قتل نہ کردے، چنانچہ جب بنی اسرائیل نے عبادت کے لیے بچھڑا بنا لیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا کے طور پر ان سے فرمایا تھا کہ تمہارا یہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوگا جب تک کہ تم ایک دوسرے کو قتل نہیں کروگے۔ اسی طرح پاکی اور طہارت کے بارے میں بھی بہت سخت احکام تھے۔ اور اسی زمانے میں جس میں یہ سخت احکام تھے اسی زمانے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی پیشین گوئی فرمادی تھی کہ جب وہ تشریف لائیں گے تو:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱)

جو بوجھ ان پر پڑا ہوا ہے، اور ان کی گردنوں میں جو طوق پڑے ہوئے ہیں وہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاکر اٹھائیں گے، اس لیے یہ دعا مانگی جارہی ہے کہ جس طرح پچھلی امتوں پر سخت احکام نازل ہوئے تھے، اس طرح کے سخت احکام ہم پر نافذ مت کیجیے گا۔

ایسا بوجھ جس کو اٹھانے کی ہمارے اندر طاقت نہ ہو

آگے فرمایا:

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ

اے پروردگار! ہم پر وہ بوجھ مت ڈالیے جس کو اٹھانے کی ہمارے اندر طاقت نہ ہو۔

اس دعا سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کردیا کہ:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا

اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جو انسان کی وسعت سے باہر ہو، اور جو وہ برداشت نہ کرسکے، یا وہ اتنا شدید ہو کہ عادۃً وہ انسان کے بس سے باہر ہو، ایسا کوئی حکم اللہ تعالیٰ نہیں دیتے۔

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۱۵۷)

عبادت میں حلاوت محسوس نہیں ہوتی

یہیں سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے، اللہ تعالیٰ وہ بات ہمارے دلوں میں اتار دے، آمین - وہ یہ کہ ہم جو تھوڑی بہت عبادت اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انجام دے دیتے ہیں، مثلاً نماز پڑھ لیتے ہیں، تلاوت کر لیتے ہیں، تسبیحات پڑھ لیتے ہیں، ذکر کر لیتے ہیں، ان عبادات کے سلسلے میں اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ اشکال رہتا ہے کہ ہم یہ عبادت انجام تو دے رہے ہیں، لیکن ان عبادات میں حلاوت محسوس نہیں ہوتی، اور ان عبادات میں دل نہیں لگتا۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات انسان مایوس ہونے لگتا ہے، اور وہ یہ سوچتا ہے کہ عبادات انجام دیتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا لیکن حلاوت محسوس نہیں ہو رہی، کوئی مزہ نہیں آرہا ہے۔

عبادت کا مقصد حلاوت نہیں

خوب سمجھ لیجیے کہ عبادات کا مقصود مزہ لینا نہیں ہے، بلکہ عبادات سے مقصود اللہ جل شانہ کی اطاعت ہے۔ دل چاہ رہا تھا یا نہیں چاہ رہا تھا، لیکن آ کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا، اب اگر غیر اختیاری طور پر خیالات آ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان خیالات کو معاف فرما دیا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

ہاں! اپنے اختیار سے دل لگانے کی کوشش کرو، اور جو الفاظ زبان سے نکال رہے ہو، ان الفاظ کی طرف دھیان لگاؤ، مثلاً جب تم ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ

﴿ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ پڑھو تو اس کی طرف دھیان ہو کہ میں ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ پڑھ رہا ہوں۔

غیر اختیاری خیالات معاف ہیں

کوشش کے باوجود اگر غیر اختیاری طور پر اِدھر اُدھر سے کچھ خیالات آ گئے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں۔ پھر جب یاد آ جائے تو دوبارہ دھیان کو لے آؤ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو بار بار وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ لوگ غیر اختیاری کاموں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اختیاری کام نہیں کرتے، بعض کام جو اپنے اختیار سے باہر ہے، مثلاً یہ دعا کرنا کہ یا اللہ! مجھے تو نماز میں مزہ بھی نہیں آتا، ہماری نماز کیا ہے، وہ تو خالی اٹھک بیٹھک ہوتی ہے، پیشانی تو زمین پر ٹیک رہے ہیں لیکن کچھ حقیقت حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز میں ہمیں وہ حلاوت اور مزہ آئے جو اپنے اختیار سے باہر ہے، ارے بھائی! یہ حلاوت نہ تو اختیار میں ہے اور نہ یہ مقصود ہے۔

"اللہ اکبر" کہتے ہی عبادت شروع

جب تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں آ کر کھڑے ہو گئے، اور "اللہ اکبر" کہہ کر ما سوا اللہ سے دست برداری اختیار کر لی تو بس سمجھو کہ تمہارا کام شروع ہو گیا۔ الحمدللہ! اب تم اس بات کی کوشش ضرور کر لو کہ ادھر ادھر کے خیالات نہ آئیں۔ لیکن اگر خیالات خود سے آ جائیں تو اس پر مت گھبراؤ، بلکہ دوبارہ نماز کی طرف آ جاؤ، لہٰذا غیر اختیاری چیز کے پیچھے پڑنا شریعت نے ہمیں نہیں بتایا،

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ جتنی عبادت بن پڑ رہی ہے اس پر شکر ادا کرو، اور مزید اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو، پھر رونا دھونا مت کرو۔

سجدہ سے زیادہ اونچا مقام کوئی نہیں

ارے! جب سجدہ کے اندر زمین پر اپنی پیشانی رکھ دی تو اس سے پھر اونچا مقام کوئی نہیں ہے، لہٰذا تھوڑا سا دھیان کرنے کی کوشش کرلو، اور "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" ذرا دل سے کہہ لو، اس کے باوجود بھی اگر اِدھر اُدھر کے خیالات آتے ہیں تو آنے دو، اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ دعا کرلی کہ:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا

آگے فرمایا:

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے اللہ! ہم پر کوئی ایسا بوجھ مت ڈالیے جو ہماری طاقت سے باہر ہو۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

معاف کرنا اور ہے، بخشنا اور ہے

اے اللہ! ہمیں تو پہلے معاف کردیجیے جو ہم سے غلطیاں ہوئی ہیں، زبان سے بھی اگر کوئی یہ کہہ دے کہ میں نے تمہیں معاف کیا تو بھی معافی ہوجاتی ہے، لیکن آگے فرمایا: ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ ہماری مغفرت فرمائیے، یعنی ہمیں بخش دیجیے۔

معاف کرنا ایک چیز ہے اور "بخشنا" دوسری چیز ہے۔ مثلاً آپ نے کوئی غلط کام کیا، دوسرے نے کہا کہ ہم نے تمہیں معاف تو کر دیا لیکن تمہارے اس عمل پر تھوڑی سی سزا ملے گی، چنانچہ اس سزا کے طور پر اس نے دو تھپڑ بھی لگا دیئے۔

جہنم کی سرسراہٹ سے بھی بچالے

اس لیے فرمایا کہ "معاف بھی کر دیجیے" اور ساتھ میں "بخش بھی دیجیے"، یعنی اے اللہ! ہمیں تھوڑی بہت سزا کا بھی تحمل نہیں ہے، اگر تھوڑی دیر کے لیے اگر جہنم کی بُو بھی سونگھا دی، اس کی آواز بھی سنا دی، وہ بھی ہمارے تحمل سے باہر ہے، اور یا اللہ! اپنی رحمت سے ہم سب کو ان لوگوں میں داخل فرما دیجیے جو جہنم کی سرسراہٹ بھی نہیں سنیں گے:

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا [1]

اور ہماری مغفرت فرما، اور ہمیں کوئی چھوٹی موٹی سزا بھی نہ دیجیے گا۔ اگرچہ ہم علامتی عبادت کرتے رہے، لیکن اے اللہ! آپ ہمیں علامتی سزا بھی مت دیجیے گا۔

علامتی سزا سے بھی بچالے

"علامتی سزا" یہ ہوتی ہے کہ جیسے بعض اوقات جج فیصلہ کرتا ہے کہ یہ مجرم عدالت برخواست ہونے تک اس جگہ بیٹھا رہے گا، اس کو "تا برخواستِ عدالت" سزا کہا جاتا تھا، یعنی اس شخص کا جرم تھا، اور ہم نے اس کو معاف بھی کر دیا، لیکن

(۱) سورۃ الانبیاء: آیت (۱۰۲)

علامتی طور پر "تا برخواستِ عدالت" یہاں بیٹھا رہے گا، تاکہ پتا رہے کہ اس کو اس کے جرم پر سزا ملی تھی۔ اور جب جج صاحب یہاں سے جائیں گے اور عدالت برخواست ہوگی تو یہ بھی چلے جائیں گے۔ یا اللہ! ہمیں "علامتی سزا" کا بھی تحمل نہیں ہے، وہ بھی معاف فرما۔

معاف بھی فرما، رحم بھی فرما

آگے فرمایا: ﴿وَارْحَمْنَا﴾. اور صرف معاف نہیں فرمایئے بلکہ رحم بھی فرمایئے۔ معافی کا مطلب تو یہ ہے کہ جہنم سے نکال دیا، اور کوئی چھوٹی موٹی سزا بھی نہیں دی، اور ایسی جگہ پر پہنچا دیا جہاں جہنم کی آواز اور سرسراہٹ بھی نہیں آرہی ہے۔ لیکن جنت میں داخلہ بھی نہیں ہورہا ہے، بلکہ "اعراف" میں بیٹھے رہو، جو نہ جہنم کا حصہ ہے اور نہ جنت کا حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں معافی تو ہوگئی اور سزا بھی نہیں ملی، اس لیے یہ دعا کرو:

وَارْحَمْنَا

اے اللہ! ہم پر رحم بھی کر دیجیے۔

یعنی اب اپنی رحمت سے جنت میں داخل بھی فرما دیجیے۔

آپ بھی ہمارے مولیٰ ہیں

آگے فرمایا: ﴿اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ یعنی اے اللہ! ہم کہاں جائیں؟ اگر کوئی ہماری حاجت ہے تو اے اللہ! آپ کے علاوہ کس کے پاس وہ حاجت لے کر جائیں؟ اس لیے کہ ہمارے "مولیٰ" تو آپ ہی ہیں۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ لہٰذا کافر قوم پر ہماری مدد کیجیے۔ ان دعاؤں میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا کیا سکھا دیا، کیسے کیسے حقائق واضح فرما دیے، بس مانگنے والا ہونا چاہیے۔

ان کی نوازشوں میں کوئی کمی نہیں

آپ نے قرآنِ کریم میں دیکھا ہوگا کہ اس دعا کے الفاظ کے درمیان "وقفہ" متعدد بار لکھا ہے۔ چنانچہ ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ کے بعد وقفہ ہے، ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ کے بعد وقفہ ہے، پھر ﴿وَارْحَمْنَا﴾ کے بعد وقفہ ہے، اور "وقفہ" بڑے "سکتہ" کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس جگہ تھوڑی دیر ٹھہرو۔ یہ نہ ہو کہ روانی کے ساتھ ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا﴾ پڑھتے چلے جاؤ، بلکہ ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ پر سانس توڑے بغیر تھوڑا سا ٹھہرو، اور اتنا ٹھہرو جو "سکتہ" سے زیادہ ہو، تاکہ ان الفاظ کے پیچھے معانی کی جو کائنات ہے اس کا تصور کر سکو۔ اس انداز سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے تو دینے والے کے دینے میں کوئی کمی نہیں۔

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

اللہ تعالیٰ ہمیں مانگنے والا اور منگتا بنا دے، آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ۴ حصہ اوّل

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ
لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا نمبر ۴ حصہ اوّل

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو دعائیں سکھائی ہیں ان میں سے ہر دعا ایسی ہے کہ ہم سب اس کے محتاج ہیں۔ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "مناجاتِ مقبول" کی پہلی منزل میں انہی دعاؤں کو جمع فرمادیا ہے جو قرآنِ کریم میں آئی ہیں۔ وہ دعائیں یا تو اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سکھائی ہیں کہ مجھ سے ان الفاظ میں مانگو، یا ان دعاؤں کی تعریف کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ان الفاظ سے دعائیں کرتے ہیں۔

چوتھی دعا

مناجاتِ مقبول میں چوتھی دعا یہ ذکر کی ہے کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۱)

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں اور علم وعقل والے بندوں کی زبان سے کہلوائی ہے۔ اس دعا کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں میں کجی اور ٹیڑھ پیدا نہ ہونے دیجیے، جبکہ آپ اس سے پہلے ہمیں ہدایت دے چکے، اب اس کے بعد ہمارے دلوں میں ٹیڑھ نہ ہونے دیجیے، اور اپنی طرف سے ہمیں رحمت عطا فرمائیے۔ یقیناً آپ بہت عطا کرنے والے ہیں۔

اکثر آیات محکم اور واضح ہیں

یہ بڑی معنی خیز دعا ہے، اور قرآنِ کریم میں یہ دعا جس سیاق میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا سے پہلے یہ بتایا کہ قرآنِ کریم میں اکثر آیات تو ایسی ہیں جو محکم ہیں، یعنی ان کے معنی بالکل واضح ہیں، اس میں کسی تامّل اور غور کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جس شخص کو عربی زبان آتی ہو وہ فوراً اس آیت کا مطلب سمجھ جائے گا، ایسی آیات کو "محکمات" کہا جاتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (۲)

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۸)

(۲) سورۃ ھود آیت (۱)

اور قرآنِ کریم کی اکثر آیات محکم ہیں اور ان کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے، اس کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

بعض آیات "متشابہات" ہیں

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کو قرآنِ کریم نے "مُتَشَابِهَات" کہا ہے۔ "متشابھات" ان آیات کو کہا جاتا ہے جن کا لفظی ترجمہ تو چاہے سمجھ میں آجائے، لیکن ان آیات کی حقیقت اور ان کی "کُنہ" انسان کی سمجھ سے بالا تر ہے۔ انسان کے اندر اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ ان کی حقیقت کو پوری طرح سمجھ سکے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اپنی قدرت کا اور اپنی حکمت کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، اور وہ کائنات کا خالق ہے، اس نے سارے انسانوں کو پیدا کیا، یہ بات جگہ جگہ پر قرآنِ کریم نے بیان کی ہے، اور اس کے معنی سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔

بعض آیات کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا

لیکن قرآنِ کریم میں بعض آیات ایسی آتی ہیں کہ ان کا ظاہری ترجمہ تو سمجھ میں آجاتا ہے، لیکن اس کی حقیقت کا پتہ نہیں چلتا، اور وہ انسان کے بس سے باہر ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے:

إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ [1]

یعنی اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ﴿كُنْ﴾ فرما دیتے

---

(۱) سورۃ یس آیت (۸۲)

ہیں، وہ ہو جاتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ ﴿ کُنْ ﴾ کس طرح فرماتے ہیں، اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اور وہ چیز کس طرح عدم سے وجود میں آجاتی ہے، یہ بات ہماری اور آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

عرش پر بیٹھنے کی حقیقت معلوم نہیں

اسی طرح قرآنِ کریم کی آیت ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (۱)

کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پیدا فرمائے، زمین پیدا فرمائی، اور اس کے بعد عرش پر بیٹھ گئے۔ اب عرش کیا چیز ہے؟ اور عرش پر بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو جسم سے پاک اور منزہ ہے۔ اب اس آیت کا لفظی ترجمہ تو ہماری سمجھ میں آ گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہو گئے، لیکن اس کی حقیقت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر کیسے بیٹھے؟ آیا اس طرح بیٹھے جس طرح ہم اور آپ کرسی پر یا تخت پر بیٹھتے ہیں؟ العیاذ باللہ! یہ تو نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے ماوراء ہے، وہ کوئی جسم نہیں ہے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲)

وہ جسم نہیں ہے، بلکہ وہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک ہماری اور

---

(۱) سورۃ یونس آیت (۳)

(۲) سورۃ النور آیت (۳۵)

آپ کی سمجھ سے باہر ہے، بقول کسے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

انسان کا دل گواہی دیتا ہے

ہر ہر قدم پر انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ میرا کوئی خالق اور مالک ہے، اور یہ جو میرے جسم کے اندر ایک پورا کارخانہ بنا دیا ہے، جس سے اس کی نشو ونما ہو رہی ہے، یہ ضرور کسی کاریگر کی کاریگری ہے، لیکن اس نے یہ کارخانہ کس طرح بنایا ہے؟ یہ بات ہماری اور آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے، لہٰذا دل میں تو آتا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ تو نے کس طرح یہ کام کیا۔

بہر حال! ایسی آیات کو "متشابہات" کہا جاتا ہے۔ جن آیات میں ایسی باتیں ہوتی ہیں ان کے بارے میں حکم یہ ہے کہ تم ان کی حقیقت جاننے کے پیچھے مت پڑو، اس لیے کہ تمہاری عقل محدود ہے، جو ان کا تصور کرنے سے عاجز ہے۔

دل میں کجی والے لوگ یہ کرتے ہیں

اسی وجہ سے قرآنِ کریم نے اس سے پہلے بیان فرمایا:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ (۱)

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۷)

یقیناً ہم نے دو قسم کی آیات نازل کی ہیں، ایک ان میں سے متشابہات ہیں، اور جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے، وہ لوگ "محکم" آیات کی طرف تو خاص توجہ نہیں دیتے، جن میں بالکل صاف اور سیدھی سیدھی باتیں قرآنِ کریم میں آئی ہیں، اور جن میں صاف صاف احکام ہیں کہ یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو، اور یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، ان احکام پر تو عمل نہیں کرتے، اور جو آیاتِ متشابہات ہیں، جو ہماری عقل اور سمجھ سے ماوراء ہیں ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں، ان پر بحثیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بچائے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جو لوگ ان چیزوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں ان کے دلوں میں کجی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ فتنہ پیدا کرتے ہیں۔

ان باتوں پر ایمان کا دار و مدار نہیں

ایسی باتیں جن پر ایمان کا کوئی دار و مدار نہیں، اور نہ ان کی حقیقت معلوم ہونا ہمارے لیے کوئی ضروری ہے، اور نہ ممکن ہے۔ ایسی باتوں کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟ اور جو لوگ ان آیات کی تاویل کے پیچھے پڑتے ہیں، وہ درحقیقت فتنہ پیدا کرتے ہیں، یہاں پاکستان میں اس کا اندازہ نہیں ہوتا، لیکن یہ سلفی حضرات جہاں جہاں گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے۔ آمین، ان کے یہاں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے معنی بتاؤ، یعنی عرش پر اللہ تعالیٰ کے بیٹھنے کے معنی حقیقی ہیں یا مجازی ہیں؟ اگر مجازی کہتے ہو تو تم "اہلِ سنت" سے خارج ہو، بلکہ اس کو کافر تک کہہ دیتے ہیں۔ لہٰذا تم یہ کہو کہ اس آیت میں حقیقی معنیٰ مراد ہیں، العیاذ باللہ!

لوگوں کو اس عقیدے میں الجھانا گمراہی ہے

میں ایک مرتبہ امریکہ گیا، جس جگہ قیام تھا وہاں فجر کی نماز کے بعد روزانہ بیان ہوتا تھا، لوگ دور دور سے بیان سننے کے لیے آتے تھے اور اس بیان میں شریک ہوتے تھے۔ چند لوگوں نے مجھ سے وہاں یہی سوال کیا کہ قرآنِ کریم میں یہ جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہیں، تو کیا یہ حقیقت ہے یا مجاز ہے؟ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہیں کس نے یہ سوال بتایا ہے؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ سعودی عرب سے ایک صاحب آتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ پہلے تم لوگ اپنا عقیدہ درست کرو، نماز روزہ کی بات بعد میں ہے، پہلے عقیدہ درست ہونا چاہیے۔ اور عقیدہ اس وقت درست ہوگا جب تم یہ مان لوگے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ "وہ عرش پر بیٹھا" تو ہاں بیٹھا، یعنی حقیقی معنیٰ میں بیٹھا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ "اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں" تو حقیقی معنی میں اللہ کے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں، اور جب تک تم لوگ یہ عقیدہ درست نہیں کروگے اس وقت تک مسلمان نہیں ہوگے۔ اور جب ان سے کوئی بات کرتا تو وہ جواب میں یہ کہتے کہ قرآنِ کریم میں تو یہ ہے اور حدیث شریف میں تو یہ ہے۔

ان کو نماز اور روزے کے مسائل بتاؤ

اب امریکہ میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کا صحیح طریقہ نہیں آتا، ان کو حلال وحرام کے مسائل کا پتہ نہیں ہے، ان کو نکاح اور طلاق کے مسائل کا پتہ نہیں ہے، ان کو آداب، مستحبات اور سنن کا پتہ نہیں ہے، ایسے لوگوں کو اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے مسئلے میں مبتلا کر دیا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ آئندہ جب وہ آئیں تو

ان سے میری ملاقات کرادینا۔ چنانچہ ایک دن فجر کے بعد ان سے ملاقات ہوئی، میں نے ان سے بڑی دردمندی سے کہا کہ بھائی! آپ یہاں پر لوگوں میں اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا مسئلہ پھیلائے ہوئے، حالانکہ ان کو تو نماز صحیح طریقے سے پڑھنی نہیں آتی، اور سنن اور مستحبات کا ان کو پتہ نہیں، نکاح اور طلاق کے مسائل ان کو نہیں معلوم، حلال وحرام کے مسائل ان کو معلوم نہیں، کیا آپ کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر کس طرح بیٹھیں گے؟

اس عقیدے کے بارے میں کہیں سوال نہ ہوگا

وہ کہنے لگے کہ یہ تو "عقیدہ" ہے، اور عقیدہ پر ایمان لانا اعمال سے مقدم ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ ایسا عقیدہ ہے کہ جس کے بارے میں کسی سے بھی نہ قبر میں سوال کیا جائے گا، نہ حشر میں حساب کتاب کے وقت پوچھا جائے گا، کیا تم سے اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم پہلے یہ بتاؤ اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے بارے میں تم کیا عقیدہ رکھتے تھے؟ بس وہ خاموش ہوگئے۔

عقیدہ کی دو قسمیں

پھر میں نے ان کو بتایا کہ "عقیدہ" کی دو قسمیں ہیں، ایک "عقیدہ" وہ ہے جس پر ایمان لائے بغیر انسان کی نجات نہیں ہوسکتی، اور دوسرا عقیدہ وہ ہے کہ "عقیدہ" تو ہے لیکن وہ ایسا نہیں ہے کہ اس پر ایمان لانے پر انسان کی نجات موقوف ہو، لہٰذا آپ نے کس بحث میں ڈال رکھا ہے؟ کافی دیر تک سمجھانے کے بعد۔الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں بات ڈال دی، لہٰذا آپ ان کو

سیدھی سیدھی دین کی بات سکھائیں۔ خدا کے لیے ان کو اس بحث میں مت ڈالیں، اس کے نتیجے میں یہاں فرقے بن جائیں گے، اور سوائے فتنہ کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

راسخین فی العلم کا عقیدہ

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚۘ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘؔ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا

کہ جو متشابہات والی آیات ہیں ان کی تاویل اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ علم کے اندر رسوخ والے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان آیات پر ایمان لائے ہیں اور یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔

اس کی تفصیل اور اس کی حقیقت اور اس کی کنہ کو سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں اور ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

"حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا عقیدہ مدارِ ایمان نہیں

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ میں نے اپنی آنکھ کے نیچے تمہاری پرورش کی، اب اللہ تعالیٰ کی آنکھ کا کیا مطلب؟

اللہ تبارک وتعالیٰ ہی اس کی حقیقت جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔ اسی طرح "حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کا مسئلہ کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قبر میں حیات ہیں یا نہیں؟ ان بحثوں پر ہزاروں صفحات متکلمین نے، اشاعرہ نے، غامدیہ نے لکھے ہیں، قبر میں نبیِ کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو حیات حاصل ہے، اس کی کنہ کیا ہے؟ وہ حیات کون سی ہے؟ وہ حیات برزخی ہے؟ وہ حیات عنصری ہے؟ اس پر لمبی لمبی بحثیں لوگوں نے لکھی ہیں۔ ان حضرات سے پوچھا جائے کہ کیا قبر میں تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ بتاؤ، حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقت کیا تھی؟ اب بحث کے اندر لگے رہنا اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا، اور ایک دوسرے کی تکفیر کرنا، یہ دین کا مزاج نہیں۔

قرآنِ کریم کے مخلوق ہونے کا عقیدہ

دین کا مزاج یہ ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں سوال کے جواب میں صرف یہ کہہ دو کہ:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ

کہ ان کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، بس انسان کا کام یہ ہے کہ اس پر ایمان لے آئے، بس بات ختم۔ کسی زمانے میں یہ مسئلہ اٹھا کہ قرآنِ کریم مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اس مسئلہ پر معتزلہ کی حکومت کے زمانے میں لوگوں کی گردنیں اڑا دی گئیں۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر کوڑے کھائے۔

خلقِ قرآن پر مناظرہ

آخر میں یہ فتنہ اس طرح ختم ہوا کہ "معتصم" بادشاہ کے دربار میں ایک عالم آئے، اور انہوں نے آکر کہا کہ معتزلہ کے جو سردار ہیں "احمد بن ابی داوٗد" ان کا میرے ساتھ ایک مکالمہ کرا دیجیے۔ بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ ان کو بلایا گیا۔ ان عالم نے ان سے کہا کہ یہ جو آپ کہہ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم مخلوق ہے، اور اس پر عقیدہ رکھنا بھی ضروری ہے، تو کیا قرآنِ کریم میں کہیں آیا ہے کہ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے؟ انہوں نے کہا کہ قرآن میں تو نہیں آیا؟ اچھا تو کیا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی حدیث میں اس کے بارے میں بتایا ہے کہ قرآنِ کریم مخلوق ہے، اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اس نے کہ کہا کہ ایسا بھی نہیں ہے۔ اچھا تو کیا کسی صحابی نے کہا ہے کہ اس پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ اللہ کے بندے! تم ایسی بات پر لوگوں کی گردنیں اڑا رہے ہو جس کا ذکر نہ تو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا ہے، اور نہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث میں اس کا ذکر فرمایا ہے، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سوال نے اس کو لاجواب کر دیا، اس دن سے پھر یہ فتنہ ختم ہو گیا۔[1]

راسخین فی العلم کا قول

بہر حال! قرآنِ کریم یہ کہہ رہا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ ایسے مسئلوں میں لوگوں کو الجھاتے ہیں جن کا سمجھ میں آنا ممکن نہیں، اور نہ ہی ان کا سمجھنا ضروری ہے۔ آگے فرمایا کہ جو لوگ علم کے اندر رسوخ رکھنے والے ہیں

---

(۱) اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: كتاب ذكر محنة الامام أحمد بن حنبل رحمه الله.

وہ یہ کہتے ہیں کہ:

اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا

کہ ہم ان باتوں پر ایمان لے آئے، یہ سب ہمارے
پروردگار کی طرف سے ہے۔

اور ہم ان کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں، وہ جانے۔ ہمیں ان باتوں کو نہ تو جاننے کی ضرورت ہے، نہ ہم جاننے کے قابل ہیں۔

راسخین فی العلم کی دعا

پھر وہ علم میں رسوخ والے یہ دعا کرتے ہیں کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (1)

یعنی وہ راسخین فی العلم جو علم میں پختگی رکھنے والے ہیں، جن کے اندر علم کا رسوخ ہے وہ ایک طرف ایمان لاتے ہیں، اور دوسرے وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہمارے دلوں میں ٹیڑھ نہ پیدا کیجیے، یہ ٹیڑھ انسان کو ان باتوں کی طرف لے جارہی ہے جو انسان کی سمجھ سے باہر ہے، جبکہ آپ نے ہمیں ہدایت بھی دے دی ہے، اور ہم ایمان بھی لے آئے ہیں، الحمد للہ! اور ایمان کی حقیقت بھی ہمیں بتادی اور اس اوپر عمل کی توفیق بھی ہوگئی، اب اے اللہ! ہمارے دلوں میں کجی مت پیدا کیجیے گا۔

(1) سورۃ آل عمران آیت (۸)

دلوں میں کجی کا نتیجہ

اللہ بچائے! جب دلوں میں کجی اور ٹیڑھ پیدا ہوجاتی ہے تو اچھا خاصا پڑھا لکھا عالم بھی گمراہ ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں رکھے، آمین۔ لہٰذا یہ بہت زبردست دعا ہے، اور خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو علم کے کاموں میں لگے رہتے ہیں، اس لیے کہ دلوں میں ٹیڑھ پیدا ہوجانے کے نتیجے میں اچھا خاصا پڑھا لکھا انسان گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔

ایک عالم عیسائی مبلغ بن گئے

دار العلوم دیوبند کے ایک فارغ التحصیل عالم تھے، ان کا علم بھی مستحکم تھا، اللہ بچائے، ان کے دل میں ٹیڑھ پیدا ہوئی اور وہ عیسائی بن گئے، اور عیسائیوں کے مبلغ اور داعی بن گئے، اللہ بچائے۔ جب ٹیڑھ پیدا ہوجاتی ہے تو وہ انسان کو کہیں سے کہیں لے جاتی ہے، اس کی ایک دو مثالیں نہیں، بلکہ بہت ساری مثالیں ہیں۔

کجی کی خوبصورت مثال

ہمارے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ریل گاڑی کی جو پٹڑی ہوتی ہے، تو جس جگہ دو پٹڑیاں جدا ہوتی ہیں، مثلاً ایک پٹڑی لاہور جارہی ہے اور دوسری پٹڑی کوئٹہ جارہی ہے، اور جس جگہ جدا ہورہی ہوتی ہیں وہاں پر زیادہ فرق نظر نہیں آتا، ایک انچ کا فرق ہوتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ آگے جاکر سینکڑوں میل کا فرق پڑ جاتا ہے، اسی طرح انسان کے اندر ابتداء میں تھوڑی سی ٹیڑھ بھی ہو تو وہ آگے چل کر انسان کو بڑے طوفان میں مبتلا کردیتی ہے۔

اپنی صحبت درست رکھو

اس لیے بزرگوں نے ایک بات فرمائی ہے، جو بڑے کام کی بات ہے کہ اپنا اٹھنا بیٹھنا ان لوگوں کے ساتھ رکھو جن کے بارے میں آپ اجمالی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ متبعِ سنت ہیں، اور الحمد للہ! وہ دین کی فہم رکھتے ہیں، اور اہلِ علم ان پر اعتماد کرتے ہیں، اور کسی اللہ والے کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں، ایسے لوگوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا رکھو، اور پھر ادھر ادھر نہ بھاگو، مثلاً کسی کے بارے میں آپ نے سنا کہ فلاں صاحب کا آج کل بہت چرچا ہے، یا فلاں صاحب کے یہاں درسِ قرآن بہت زبردست ہوتا ہے، اور ان کے حلقے میں بہت مخلوق جمع ہوتی ہے، اور لوگوں کو ان سے بہت فائدہ ہوتا ہے، یہ سب دیکھنے پر خیال آتا ہے کہ اچھا، چلو ہم بھی وہاں جاکر ان کو دیکھیں، چنانچہ ان کو دیکھنے کے لیے پہنچ گئے۔

اور لائن تبدیل ہوگئی

اب وہاں پر جو لوگ جمع ہیں، وہ ان کی فصاحت اور بلاغت سے، ان کے طرزِ تکلم سے متاثر ہیں، اور ان کی تقریر سن کر لوگ سر دھن رہے ہیں، اب وہ صاحب کس حد تک صحیح ہیں اور کس حد تک غلط ہیں اس کو جانچنے کا نہ اِن کو پتہ اور نہ اُن کو پتہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں جاکر ایک ٹیڑھ پیدا ہوگئی اور دوسروں سے کہنے لگے کہ یہاں آکر تو بہت مزہ آتا ہے، اور یہاں بہت پبلک آتی ہے اور ہم تو پہلے غلط جگہ چلے گئے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پٹڑی بدل گئی اور لائن تبدیل ہوگئی، اور وہاں کی باتیں دل کو لگنے لگیں، اور رفتہ رفتہ وہ ٹیڑھ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

یک در گیر، محکم گیر

اسی لیے بزرگوں نے فرمایا کہ "یک در گیر، محکم گیر"، یعنی ایک در پکڑو لیکن اس کو مضبوطی سے پکڑو، اور پھر ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہا گیا ہے کہ جب کسی شیخ سے اصلاحی تعلق قائم ہوجائے اور اس سے بیعت ہوجائے تو اس کے بعد کسی دوسرے کی مجلسوں میں جانا بھی اچھا نہیں، کبھی کبھار چلا جائے تو کوئی گناہ کی بات نہیں، کوئی ناجائز کام نہیں، بشرطیکہ وہ بھی متبعِ سنت ہو، لیکن دوسرے کے پاس جانے سے فائدہ نہیں ہوگا، اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں "توحیدِ مطلب" کہتے ہیں، یعنی جس سے تعلق قائم ہوگیا بس اس سے جڑے رہو۔

متبعِ سنت اور مُجازِ بیعت ہونے کی تحقیق کرلو

البتہ یہ ضروری ہے کہ تعلق جوڑنے سے پہلے دیکھ لے کہ وہ متبعِ سنت ہے، اور وہ اللہ والے کی صحبت میں رہے ہیں، اور کسی اللہ والے نے اس بات کا مُجاز بنایا ہے، اور عام طرزِ عمل ان کا سنت کے مطابق ہے، اور علماء اور اہل اللہ ان کو پسند کرتے ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہیں، اور یہ باتیں ان کے اندر موجود ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں پہلے اطمینان کرلو، اور جب اطمینان کرلیا تو پھر ان کو اس طرح پکڑلو کہ "یک در گیر و محکم گیر"، کہ اب ایک در کو پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور اسی کو مضبوطی سے تھام لو۔

مزہ چکھنے کے لیے بھی نہ جائیں

اب اگر ادھر جاؤ گے تو دل میں یہ تشویش پیدا ہوگی، اس لیے کہ مزاجوں

میں فرق ہوتا ہے، ذوق میں فرق ہوتا ہے، یہاں تک کہ اہلِ حق علماء اور اہل اللہ کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ بہت زیادہ ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں، لہٰذا جب اہلِ حق کے بارے میں یہ کہا گیا ہے تو آپ مزہ چکھنے کے لیے اہلِ باطل کے پاس جائیں گے کہ چلو ذرا فلاں کے پاس چلیں، ان کا آج کل بڑا شہرہ ہے، اب یہ دیکھے بغیر کہ اس کا پسِ منظر کیا ہے، اس کا علمی مقام کیا ہے؟ اس کا ذہنی جھکاؤ کس طرف ہے، ان سب چیزوں کو دیکھے بغیر اس کے پاس چلے گئے کہ سب مخلوق جارہی ہے، تو ہم بھی چل کر ذرا دیکھیں۔

عوام میں شہرت حقانیت کی دلیل نہیں

خوب سمجھ لو کہ عام لوگوں کا کسی کی طرف زیادہ رجوع کرنا، یہ آدمی کے صحیح ہونے کی علامت نہیں ہوتی۔ ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ شہرت کی دو قسمیں ہیں، ایک شہرت وہ ہے جو عوام میں کسی شخص کی شہرت ہوگئی، مثلاً عوام اس کے بارے میں یہ کہنے لگے کہ یہ بڑے مقرر ہیں، یہ بہت اچھا بولتے ہیں وغیرہ، جبکہ علماء میں اس کا کوئی خاص ذکر نہیں، لہٰذا جو شہرت عوام سے چلتی ہے، اور رفتہ رفتہ علماء تک بھی پہنچ جاتی ہے، ایسی شہرت حقانیت کی علامت نہیں ہوتی۔

اہلِ علم میں شہرت حقانیت کی دلیل ہے

حقانیت کی علامت یہ ہے کہ کسی شخص کی شہرت اور مقبولیت پہلے اہلِ علم میں ہو، اہلُ اللہ میں ہو، اور پھر ان کے واسطے سے عوام کے اندر اس کی شہرت آئے، لہٰذا اگر کسی جگہ پر آپ دیکھیں کہ عوام کا بہت بڑا مجمع وہاں جارہا ہے، تو

محض "مجمع" کا وہاں جانا یہ حقانیت کی علامت نہیں، بلکہ یہ دیکھو کہ اہلِ علم اور اہلُ اللہ بحیثیتِ مجموعی اس شخص کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟

زیادہ اِدھر اُدھر مت جاؤ

بہرحال! عرض کرنے کا منشا یہ ہے کہ دل میں ٹیڑھ پن پیدا ہوجانا بڑی خطرناک بات ہے۔ اس لیے یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ کہیں ہمارے دلوں میں ٹیڑھ نہ پیدا ہوجائے۔ اور اس ٹیڑھ کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک فکر اور سمجھ کی ٹیڑھ، اور دوسری "عملی ٹیڑھ"۔ اب تک جو کچھ عرض کیا، وہ پہلی قسم کے بارے میں ذکر کیا، یعنی فکر کی ٹیڑھ اور کج فہمی، اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، اور کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے وہ ٹیڑھ پیدا ہو۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ زیادہ ادھر ادھر نہیں جانا چاہیے۔

ہر مصنف کی کتاب مت پڑھو

ہر شخص کی لکھی ہوئی کتابیں بھی مت پڑھو، بعض اوقات کسی کے بارے میں خیال آتا ہے کہ فلاں اچھا آدمی ہے، اور اچھا مصنف ہے، لوگوں میں اس کی کتابوں کی بہت شہرت ہے کہ یہ بہت اعلیٰ قسم کی باتیں لکھتے ہیں۔ چلیں ان کی کتابیں پڑھ کر ذرا دیکھیں۔ اب اتنی عقل نہیں، اتنا علم نہیں، سمجھ نہیں، لہٰذا جب اس کی کتابیں پڑھیں تو اس کا کوئی فقرہ اور جملہ دل لبھا گیا، اور ان کی بات دل کو لگ گئی، اور اس کے نتیجے میں لائن ٹیڑھی ہوگئی، اور آگے چل کر خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچے گا۔

ورنہ گمراہ ہوجاؤ گے

لہٰذا یہ ذائقہ چکھنے والی بات نہیں کہ آج اس کا ذائقہ چکھا، کل دوسرے کا ذائقہ چکھا، ارے! ایک مرتبہ تحقیق کرکے دیکھ لو کہ کون اللہ والا ہے، اور صحیح علم رکھتا ہے؟ اور کون تمہیں صحیح راستہ بتا سکتا ہے؟ اب اس کے بعد ادھر ادھر جانے سے پرہیز کرو، نہ ان کی کتابیں پڑھو، نہ ان کے درس میں جاؤ، نہ ان کے حلقوں میں جاؤ، تاکہ یکسوئی کے ساتھ تم دین کے راستے پر چل پڑو۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا:

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ (۱)

یعنی مختلف راستوں کے پیچھے مت جاؤ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا راستہ گم ہوجائے گا، اور تمہیں پتہ نہیں چلے گا کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں پہنچ گئے۔

یہ فکری کجی تھی

بہرحال! فکری گمراہی اور فکری کجی سے بچنے کے لیے یہ عمل کرے، اور ہر وقت یہ دعا کرے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا

اے اللہ! ہمیں ان میں داخل مت فرمایئے جن کے عقائد خراب ہوجاتے ہیں، ان کی سوچ خراب ہوجاتی ہے۔

---

(۱) سورۃ الانعام: آیت (۱۵۳)

دوسری کجی ہے "عمل کی کجی"، یعنی عمل میں ٹیڑھ پیدا ہوجانا، زندگی رہی تو اس پر کل عرض کروں گا، ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

دعا نمبر ۴ حصہ دوم

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ
لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۴ حصہ دوم

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم کی اس دعا پر بیان چل رہا تھا جو اللہ کے نیک بندوں اور راسخین فی العلم کی طرف سے مانگی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۱)

اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں میں ٹیڑھ پیدا نہ کیجیے، جبکہ آپ نے ہمیں ہدایت عطا فرمادی ہو، اور خاص اپنے پاس سے رحمت عطا فرما دیجیے، بے شک آپ بہت

(۱) سورۃ آل عمران: آیت (۸)

عطا اور بخشش کرنے والے ہیں۔

پہلی قسم کی کجی

جیسا کہ گذشتہ کل میں نے عرض کیا تھا کہ اس دعا میں جس ٹیڑھ سے پناہ مانگی گئی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک سمجھ اور فکر کی کجی، اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے، آمین۔ بعض اوقات شیطان ایسے ایسے مسئلوں میں انسان کو الجھا دیتا ہے، جس میں اس کو پڑنے کی ضرورت نہیں تھی، اور اس کی وجہ سے وہ انسان بعض اوقات گمراہی کا شکار ہوجاتا ہے، گذشتہ کل میں نے اس کے بارے میں تھوڑی تفصیل سے گذارشات کی تھیں۔

دوسری قسم کی کجی

کجی کی دوسری قسم "عملی کجی" ہے، یعنی کوئی بھی انسان، کوئی بھی مسلمان اپنے آپ کو اس بات سے مامون اور محفوظ نہ سمجھے کہ کس وقت اچانک اس کے عمل میں کجی پیدا ہوجائے، راستہ بدل جائے، اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار، پابندِ صوم وصلوٰۃ اور گناہوں سے بچنے والے، متقی، پرہیزگار بھی اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے اس بات سے مامون نہ سمجھے کہ کہیں وہ عمل کی ٹیڑھ کا شکار نہ ہوجائے۔ اللہ بچائے! انسان کا نفس جو ہر وقت انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان جو ہر وقت نیک کام کررہا ہوتا ہے، لیکن اچانک اس کا رخ بدل جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان گناہوں میں، نافرمانیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

اچانک عمل میں تبدیلی

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے انسان مسلسل نیک عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اچانک اس کے عمل میں تبدیلی آجاتی ہے، وہ پھر جہنمیوں والے کام شروع کردیتا ہے، العیاذ باللہ، پھر اس کا خاتمہ جہنم والے اعمال پر ہوتا ہے۔[1] یا اللہ! ہم سب کی حفاظت فرما، اور ہمیں اس انجام سے محفوظ فرما، آمین۔ لیکن ایسا ہوتا ہے، اور تاریخ میں دیکھو تو ایسے ایسے عبرت انگیز واقعات ملتے ہیں کہ آدمی سب کچھ کرنے کے بعد، ساری عبادات کرنے کے بعد، گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنے کے بعد، اچانک بھٹک جاتا ہے۔

شیخِ طریقت کا عبرتناک واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو "درسِ عبرت" کے نام سے ہے، اس رسالہ میں ایک شیخِ طریقت کا واقعہ لکھا ہے، جس کے بے شمار مرید تھے، اور وہ باقاعدہ اصلاح اور ارشاد کی گدی پر بیٹھا ہوا تھا، بس کسی وقت ابتلاء آیا اور ایک عیسائی عورت کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر مرتد ہوگیا، اس عورت کے خنزیر چَرانے پر لگ گیا، وہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ کچھ نیک بندے اس کے حلقۂ ارادت میں تھے، انہوں نے جب یہ حالت دیکھی تو اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دعائیں کیں، روئے اور گڑگڑائے تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اس کی اصلاح فرمادی۔

---

(۱) صحیح البخاری ۹ / ۱۳۵ (۷٤٥٤)

شیطان کا کید کمزور ہے

اس سے پتہ چلا کہ ایک شیخِ طریقت بھی اس طرح غلط راستے پر پڑ جاتا ہے، لہٰذا یہ محض ایک مفروضہ نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے واقعات بھی ہیں کہ آدمی کا دل بدل جاتا ہے، اور دل میں ٹیڑھ پیدا ہوجاتی ہے، اس لیے یہ دعا سکھائی جارہی ہے کہ اے اللہ! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کیجیے گا۔ شیطان تو انسان کا دشمن ہی ہے، لیکن شیطان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ:

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا(١)

کہ شیطان کی کید کمزور ہے، اس لیے کہ یہ "کمینہ" ہے، کمینہ آدمی کی خاصیت اور پہچان یہ ہے کہ اگر دوسرا آدمی اس کے سامنے ڈھیلا پڑ جائے تو وہ شیر ہوجاتا ہے، اور اگر کوئی اس کے سامنے ڈٹ جائے تو وہ ڈھیر ہوجاتا ہے۔

کمینے انسان کی تکریم اس کو سرکش بنا دیتی ہے

جیسے کسی عربی شاعر کا شعر ہے کہ:

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهُ
وَإِنْ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا(٢)

یعنی اگر تم کسی شریف آدمی کی تکریم اور عزت کروگے تو تم اس کے مالک بن جاؤ گے اور اگر تم کسی کمینے انسان کی تکریم اور عزت کروگے تو وہ اور زیادہ

---

(١) سورة النساء آیت (٧٦)

(٢) دیوانِ متنبي، قافية الدال، مدح سيف الدولة، ص ١٩٤، مكتبة البشرىٰ.

سرکش ہوجائے گا۔ بس یہی کیفیت شیطان کی ہے، اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمادیا کہ شیطان کا مکر کمزور ہے۔

ہمارے اندر کا شیطان "نفس" ہے

لیکن ایک شیطان خود ہمارے اندر بیٹھا ہوا ہے، وہ ہے "نفسِ امّارہ"، یہ بڑی خطرناک چیز ہے، حالانکہ اس کی تربیت کی گئی، اور مشقتیں برداشت کرکے اس کو اس بات کا عادی بنایا گیا کہ یہ انسان کو غلط کاموں کی طرف نہ لے جائے، اور گناہوں سے پرہیز کرنے کی اس کو مشق کرائی گئی، اور اس کے لیے اپنے آپ پر زبردستی کرنے کا اہتمام کیا گیا، اور ذرا مشق اور محنت کے بعد یہ نفس قابو آجاتا ہے۔ شیطان جلدی قابو میں آجاتا ہے، لیکن نفس کو قابو میں لانے کے لیے کچھ دیر لگتی ہے، اس کو عادی بنانا پڑتا ہے، اس کے لیے مشق کرنی پڑتی ہے۔

نفس سے ہمیشہ چوکنّے رہنا

اگر نفس کی تربیت ہوگئی، اور وہ بظاہر گناہوں سے محفوظ ہوگیا، اور اب وہ اچھے عمل کررہا ہے، اور کسی گناہ میں مبتلا نہیں ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ "نفس" کے اندر جو گناہوں کی طرف میلان کا جذبہ تھا، وہ بالکل ختم ہوگیا، ایسا نہیں ہوتا، بلکہ تھوڑا تھوڑا میلان پھر بھی باقی رہتا ہے۔ اس لیے اس دعا کی تلقین کی گئی کہ: یا اللہ! ہمارے دلوں میں ٹیڑھ پیدا نہ کیجیے، ہمارے عمل میں ٹیڑھ پیدا نہ کیجیے۔ یہ سلوک کا طریق اور اللہ کے راستے میں چلنے کا طریق، اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان کسی وقت بے فکر نہ ہو، بلکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے، اس لیے کہ نفس کے تقاضے کسی بھی وقت ابھر جاتے ہیں۔

اژدہا اٹھا کر لانا

مثنوی شریف میں مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک لکڑہارا تھا، جو روزانہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ ایک دن جنگل میں لکڑیاں جمع کر رہا تھا تو بڑا اژدہا بالکل مردہ پڑا ہوا تھا، اس نے سمجھا کہ یہ بھی لکڑی ہے، اس کو اٹھا لیا، اور دوسری لکڑیوں کے ساتھ اس کو گٹھڑ میں باندھا اور گھر میں لا کر ڈال دیا۔ جب دھوپ تیز ہوئی اور گرمی ہوئی تو اس کے اندر حرکت ہوئی، اور وہ مردہ سے زندہ ہوگیا، اور اس نے اسی کو ڈس لیا۔

نفس بھی اژدہا ہے

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کا "نفس" بھی مشق اور مجاہدہ کے بعد مردہ تو ہوجاتا ہے لیکن جہاں اس "نفس" کو غلط خواہشات پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے تو یہ پھر زندہ ہوجاتا ہے، چنانچہ مولانا ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

نفس اژدہا است او کہ مردہ است
از غمِ آلتی افسردہ است

یعنی ہمارا یہ نفس تو ایک اژدہا ہے، یہ مرا کہاں ہے، البتہ تم نے مجاہدہ کر کے اس کو افسردہ بنا دیا ہے۔

غلط خیال ضرور آتے ہیں

لہٰذا کسی وقت بھی انسان کا دماغ پلٹ سکتا ہے، اور کسی وقت بھی ہمارے

دلوں میں ٹیڑھ پیدا نہ فرما، اور ہر شخص ذرا اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھ لے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے کتنی ہی عبادت کی توفیق دی ہو، کتنی ہی اس کو دینداری عطا فرمائی ہو، کتنا وہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہا ہو، لیکن کبھی نہ کبھی دل میں غلط خیالات ضرور آتے ہیں، اور وہ خیالات کبھی ارادے کی حدِ تک پہنچ جاتے ہیں، اور کبھی صرف وہ خواہش اور تمنا کی حد تک رہتے ہیں۔

آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جائے

اگر آدمی کی صحبت ٹھیک نہ ہو اور اس کا ماحول سازگار نہ ہو تو یہ جو دل میں ارادے، خواہشات، جذبات، امنگیں اور تمنائیں پیدا ہو رہی ہیں اس کے نتیجے میں آدمی بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ لہٰذا جب کبھی کسی گناہ کا خیال دل میں پیدا ہو، ارادہ یا خواہش دل میں پیدا ہو، فوراً اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اور یہ کہو:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا

جانے سے پہلے یہ دعا کر لو

اگر آدمی ایک ایسے ماحول میں جا رہا ہے، جہاں اس کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ میری نگاہ بھٹک جائے گی، یا میرا دل خراب ہوگا، یا مجھ سے کوئی غلط ہو جانے کا اندیشہ ہے تو جانے سے پہلے اور راستے میں یہ دعا کرتا جائے کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً

اس دعا میں ایک تو اللہ جلّ شانہ کی حمد بھی ہے، کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ہدایت دی ہے، یہ آپ کا انعام اور آپ کا کرم ہے، ہم اس پر آپ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ لیکن آئندہ ہم کہیں بھٹک نہ جائیں۔

مجلس میں جانے سے پہلے دعا

مثلاً آپ کسی مجلس میں جارہے ہیں، اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اسی مجلس میں غیبتیں ہوں گی، دوسروں کا ذکر آئے گا، اور ان کو برا بھلا کہا جائے گا۔ اوّل تو آدمی ایسی مجلس میں جانے سے پرہیز کرے تو بہتر ہے، لیکن بعض اوقات ایسی مجلس میں جانا پڑتا ہے، جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا کرلو کہ یا اللہ! میں فلاں مجلس میں جارہا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غیبت کے گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اے اللہ! میری حفاظت فرما، اور مجھے ٹیڑھ سے محفوظ فرما۔

غلط کام کی خواہش کے وقت دعا

اور جب کبھی نفس کے اندر کسی غلط کام کی خواہش پیدا ہو، فوراً یہ دعا کرو:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا

اور یہ نسخہ خود اللہ جلّ شانہ نے ہمیں بتایا ہے کہ تم بھی یہ کرو، اس لیے کہ میرے نیک بندے ایسا کرتے ہیں، اس نسخہ کے ذریعے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتمامِ حجت فرمادی۔

میدانِ حشر کا تصور کرو

حضرت ڈاکٹر عارفی صاحب قدس اللہ سرّہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا تصور کرو کہ میدانِ حشر قائم ہے، حساب وکتاب ہو رہا ہے، اور ہمیں اعمال نامہ دیا جا رہا ہے، اس اعمال نامہ میں ہمارے گناہوں کی طویل فہرست ہے۔ جب ان گناہوں کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو آپ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ یا اللہ! آپ نے پیدا ہی ایسے زمانہ میں اور ایسے ماحول میں کیا تھا جہاں پر ان گناہوں سے بچنا مشکل تھا، اگر آپ نے ہمیں حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پیدا کیا ہوتا تو ہم بھی ویسے ہی ہو جاتے، جیسا زمانہ تھا، ویسے ہم بن گئے۔

مجھے کیوں نہیں پکارا

اس کے جواب میں اگر اللہ تبارک و تعالیٰ یہ سوال کریں کہ اگر تمہیں اپنے ماحول میں گناہوں سے بچنا مشکل لگ رہا تھا تو تم نے مجھے کیوں نہیں پکارا؟ اور مجھ سے کیوں نہیں مانگا کہ اے اللہ! مجھے ان گناہوں سے بچالے، اس وقت کیا جواب ہوگا؟

توبہ کی توفیق ضرور ہو جائے گی

لیکن اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگتے رہو کہ یا اللہ! ہمارے دلوں میں ٹیڑھ پیدا نہ کیجیے گا، ہمارے عمل میں، ہماری سوچ میں ٹیڑھ نہ پیدا کیجیے گا۔ بس بار بار اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے بندے پر کرم ضرور فرمائیں گے۔ اور اگر فرض کرو ایسے بندے سے پھر بھی کسی وقت لغزش ہو جائے، اور قدم

ڈگمگا جائے تو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق ضرور دیں گے، استغفار کی توفیق دیں گے، اور توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اپنی ستاری کا مظاہرہ فرمائیں گے، اپنی غفاری کا مظاہرہ فرمائیں گے۔ لہٰذا مانگنے سے غفلت مت کرو۔ اس دعا میں یہی سکھایا گیا کہ ہم سے یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! ٹیڑھ پیدا نہ کیجیے گا، نہ ہماری فکر اور سوچ میں، اور نہ ہمارے عمل میں ٹیڑھ پیدا کیجیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو اپنے حفاظت میں لے لے اور ہمیں ٹیڑھ سے بچالے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا نمبر ۵ تا ۸

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! قرآنِ کریم کی دعاؤں کا بیان چل رہا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "مناجاتِ مقبول" میں چھٹی دعا یہ لکھی ہے کہ:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱)

یہاں پر قرآنِ کریم کی کئی دعاؤں کا تسلسل ہے، چنانچہ اس کے بعد دوسری دعا یہ ہے:

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۲)

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۹۱)

(۲) سورۃ آل عمران آیت (۱۹۲)

اور اس کے بعد تیسری دعا یہ ہے:

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ(۱)

یہ سب دعائیں اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران کے آخر میں ذکر فرمائی ہیں۔

آسمان اور زمین کی تخلیق میں بڑی نشانیاں

یہ سب دعائیں اس آیت کے بعد آئی ہیں:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔(۲)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ آسمان اور زمین کی تخلیق میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانیں ہیں، یعنی جن کے پاس عقل ہے اور حکمت کو سمجھنے کا سلیقہ ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب تہجد کی نماز کے لیے اٹھتے تھے، اس وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ آیات تلاوت کیا کرتے تھے۔(۳)

ان آیات میں یہ بتادیا کہ عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۹۳)

(۲) سورۃ آل عمران آیت (۱۹۱-۱۹۰)

(۳) صحیح البخاری ۱ / ٤٧ (۱۸۳)

کھڑے، بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں کرتے رہتے ہیں اور آسمان اور زمین کی تخلیق کے بارے میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ عقل والے ہیں

اور سوچنے کے نتیجے میں بے ساختہ ان کی زبان پر یہ کلمات آتے ہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

ان آیات میں درحقیقت ان لوگوں کو عقل والا قرار دیا گیا ہے جن میں یہ دو صفتیں ہوں، ایک یہ کہ وہ لوگ کھڑے ہوئے بھی اللہ کا ذکر کر رہے ہیں، لیٹے بھی ذکر کر رہے ہیں اور بیٹھ کر بھی ذکر کر رہے ہیں۔ اور دوسری صفت یہ ہو کہ وہ آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہوں۔ یہ ایک مستقل نیکی اور ایک مستقل عمل ہے، جو شرعاً مطلوب ہے اور بندہ کے لیے قابلِ تعریف ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو "اُولِی الْاَلْبَابِ" میں داخل فرمایا ہے۔

یہ لوگ عقل والوں میں داخل نہیں

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں رکھتا، اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا اور جو آدمی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی ہوئی کائنات پر غور نہیں کرتا، ایسا آدمی "اُولِی الْاَلْبَابِ" یعنی عقل والوں میں داخل نہیں۔ گویا کہ اس کے پاس عقلِ سلیم نہیں ہے، اگر عقلِ سلیم ہوتی تو وہ آدمی کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو بھلاتا نہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کبھی نہ چھوڑتا اور اللہ کے ذکر سے اس کو کبھی غفلت نہ ہوتی۔ آسمان وزمین کی جو تخلیقات اس کے سامنے ہیں ان کے

سامنے سے غفلت کے عالم میں نہ گذر جاتا، بلکہ اس کو سوچتا۔

عقلِ سلیم والا سوچتا ہے

کیا سوچتا؟ وہ یہ سوچتا کہ یا اللہ! یہ اتنی بڑی کائنات، یہ آسمان، یہ زمین، یہ ستارے، یہ سیارے، کب سے چل رہے ہیں اور کسی خاص نظام کے تحت چل رہے ہیں، ان کے نظام میں ایک لمحہ کا فرق نہیں آتا۔ کیا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے؟ کیا اس کا کوئی چلانے والا نہیں ہے؟ سورج روزانہ ایک خاص وقت میں خاص نظام کے تحت طلوع ہوتا ہےاور خاص نظام کے تحت غروب ہوتا ہے۔ ستاروں کی کہکشاں کبھی ایک طرف نظر آتی ہے اور کبھی دوسری طرف نظر آتی ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی پھیلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

یہ کائنات کتنی عظیم ہے؟

تو کیا یہ نظامِ شمسی خود بخود پیدا ہوگیا؟ جس کو سوچنے سمجھنے میں انسان کی زندگیاں بیت گئیں اور انسان ابھی تک اس پورے نظام کو سمجھ نہیں پایا۔ کتنے خلائی جہاز اڑا لیے؟ کتنے سیارے اڑا لیے؟ سب کچھ کرنے کے بعد بھی ان کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کے جس حصے تک ہم پہنچے ہیں، وہ کل کائنات کا دس ہزارواں حصہ بھی نہیں ہے، اور ابھی تک ۹۹.۹۹ فیصد حصہ باقی ہے۔ یعنی پورے سمندر میں سے ایک قطرہ کا تناسب بھی نہیں ہے۔ جہاں تک ہم پہنچے ہیں، اس سے آگے جو کائنات ہے، وہ اتنی بڑی ہے کہ ہماری ابھی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکی۔ اتنی بڑی کائنات کس نے بنائی ہے؟ وہ کہاں ہے؟ اور کس طرح بنائی ہے؟

یہ پورا نظام ہمیں فائدہ پہنچا رہا ہے

اس نظامِ شمسی کے ذریعہ ہمیں دھوپ مل رہی ہے، اس دھوپ کے ذریعہ ہماری کھیتیاں پک رہی ہیں، ہمارے پھل پک رہے ہیں، ہمارے پودے اس سے غذا حاصل کر رہے ہیں، اس کے نتیجے میں ہمیں روٹی حاصل ہورہی ہے، چاند ان کھیتو ں پر اپنی کرنیں ڈالتا ہے، سورج اپنی کرنیں ڈالتا ہے، بادل ان کھیتو ں کو سیراب کرتے ہیں، ان پر ہوائیں چلتی ہیں، جو ان کی نشو ونما کراتی ہیں۔ یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے پیدا کیا۔ یہ چاند، یہ سورج، یہ بادل، یہ ہوائیں، اس لیے پیدا کیے کہ تیرے ہاتھ میں ایک روٹی آجائے، تو اس روٹی کو غفلت کے ساتھ نہ کھائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے کھائے۔ اگر یہ سوچ اللہ تعالیٰ ہمیں عطا فرمادے تو کائنات کی ہر چیز کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آئے گا۔

یہ کائنات فضول پیدا نہیں فرمائی

اس دیوار کے پیچھے، اس مکان کے پیچھے، اس باغ کے پیچھے، ان پہاڑوں کے پیچھے، ان دریاؤں کے پیچھے، سب جگہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا جلوہ نظر آئے گا۔ اگر انسان اس کائنات کی ہر چیز کے بارے میں سوچنے والا بن جائے:

يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور دوسرا یہ سوچے کہ یہ سارا کارخانہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے بنایا ہے تو اب میرے ذمہ بھی کوئی فرض ہے یا نہیں؟ یا میں اس کائنات میں صرف مزے

اڑانے کے لیے آیا ہوں، اور میں اس کائنات میں بندہ بن کر آیا ہوں، یا خدا بن کر آیا ہوں؟ اور آخر میں اس کائنات کی انتہا ہونی ہے یا نہیں؟ اس سوچنے کے نتیجے میں بے ساختہ ان کی زبان پر یہ کلمات آتے ہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سارا نظام بے وجہ پیدا نہیں فرمایا، فضول پیدا نہیں فرمایا، بلکہ ان کی پیدائش کا کچھ مقصد ہے۔

تاکہ انسان اللہ کا بندہ بن کر رہے

مقصد کیا ہے؟ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان یہاں پر اللہ کا بندہ بن کر رہے اور اگر کسی نے بندگی کے تحت زندگی گزاری ہے تو اس کو اس کا کچھ صلہ اور انعام بھی اللہ تعالیٰ عطا فرمائے، اور اگر کسی نے ظالم بن کر زندگی گزاری ہے اور لوگوں کے حقوق پامال کیے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا جو حق تھا، وہ ادا نہیں کیا، تو اس پر اس کو سزا ملے؛ لہٰذا اگر یہ جزا اور سزا کا نظام نہ ہوتا تو پھر کائنات کی پیدائش کا مقصد کیا ہوا؟ بس! لوگ دنیا میں آئیں اور کھائیں پئیں، سو جائیں اور پھر مر کر قبر میں چلے جائیں؟ اور مقصد کچھ نہ ہو۔

اس نظام کو ایک دن ختم ہونا ہے

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ [1]

---

(۱) سورۃ المؤمنون آیت (۱۱۵)

کیا تم سمجھ بیٹھے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کر دیا؟ اور یہ کائنات ویسی چلتی رہے گی؟ اور اس کائنات کا کوئی انجام نہیں ہوگا؟ اور کوئی انتہا نہیں ہوگی؟ اور تم ہمارے پاس واپس لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ جو شخص بھی عقل رکھتا ہو، اس کو اس کائنات میں غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ میرا ایک دن حساب کتاب ہونا ہے، اور ایک دن یہ کائنات ختم ہو جانی ہے، اور اس کائنات کے ختم ہونے کے بعد جزا اور سزا کا نظام قائم ہونا ہے، اور جو دنیا میں ظالم ہوگا، اس کو سزا ملے گی، اور جو مظلوم ہوگا، اس کی داد رسی کی جائے گی، جو اللہ تبارک و تعالیٰ کا بندہ بن کر زندگی گزار رہا ہوگا، اس کو جنتوں کی شکل میں انعام دیا جائے گا، جس کا ذکر قرآنِ کریم کے اندر بار بار آیا ہے۔

ہر ایک کو جزا اور سزا ملنی ہے

اور اگر کسی شخص نے بغاوت کی روش اختیار کی، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی روش اختیار کی، تو اس کو اس کی سزا ملے گی۔ ورنہ ایک شخص اگر ظلم کر کے اور دوسروں کی لاشوں پر اپنا محل تعمیر کرتا رہا، اور دنیا سے چلا گیا، اور جو مظلوم تھا، اس کی نہ تو فریاد رسی ہوئی، اور نہ اس ظالم کو اس کے ظلم پر کوئی سزا ملی۔ ایک معمولی سمجھ والا حاکم بھی یہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تو وہ ذات جو اس پوری کائنات کی خالق ہے، اور جس نے کائنات میں یہ نظام بنایا ہوا ہے، یہ محیّر العقول نظام بنایا ہے، جس کی طرف دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے، کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ نظام تخلیق فرمایا ہے، وہ اس سارے نظام کو اس طرح بے فائدہ پیدا کر دے گا؟

انسانی ذہن ہر وقت سوچتا ہے

دیکھیے! انسان کا ذہن ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہے، کوئی ذہن ایسا نہیں ہے، جس میں کوئی خیال نہ آرہا ہو۔ اب ہم نے اپنے ذہن کو ایسا بنا رکھا ہے کہ اس میں فضول خیالات ہم لاتے رہتے ہیں، مثلاً لذت حاصل کرنے کے خیالات، مزے حاصل کرنے کے خیالات آتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ چاہتے ہیں کہ بندوں کے خیالات کی رَو بدلے، خیالات کی رَو اللہ تعالیٰ کی طرف جائے، اور اللہ تعالیٰ کی کائنات کے بارے میں سوچے اور جس چیز کو وہ دیکھے، اس میں اس کو اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آئے۔

اللہ والے کی سوچ کیا ہوتی ہے؟

مثلا وہ ایک پھول دیکھے تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آئے، اگر کوئی باغ دیکھے تو اس کے پیچھے اللہ کا جلوہ نظر آئے، اگر کوئی عمارت دیکھے تو اس کے پیچھے اللہ کا جلوہ نظر آرہا ہو، اور ان چیزوں کو دیکھ کر اس کا ذہن اس کے خالق اور مالک کی طرف متوجہ ہو، یہی فرق ہے ایک دنیا دار آدمی کی سوچ میں اور ایک اللہ والے کی سوچ میں۔ اللہ والے کی سوچ اور فکر اللہ کی یاد کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ پہلے اللہ کا ذکر زبان پر آتا ہے، اور بار بار مسلسل زبان پر آتے رہنے سے وہ ذکر دل میں بیٹھ جاتا ہے۔

اے اللہ! میرے دل کے خیالات کو درست کردے

اسی لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِيْ خَشْيَتَكَ وَذِكْرَكَ وَاجْعَلْ هِمَّتِيْ وَهَوَايَ فِيْمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى. (۱)

اے اللہ! میرے دل میں جو خیالات آئیں، وہ آپ کی خشیت اور یاد کے آئیں، اور میرے دل کے ارادے اور میری خواہشات ان چیزوں کی طرف جائے جو آپ پسند کرتے ہوں، یعنی مجھے وہی چیز پسند آئے جو آپ کو پسند ہے، مجھے اسی کا خیال آئے جو آپ کی رضا کی بات ہو؛ لہٰذا آنے والے خیالات کی رو کو بدلنے ہی سے اس آیت کے مصداق پر عمل ہوگا کہ:

يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

یعنی آسمان اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے ہوئے بندے کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے آباد رہے۔

غور وفکر کا نتیجہ

اور اس غور وفکر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہی بندہ پہلے تو یہ کہے گا کہ:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا

اے پروردگار! آپ نے یہ نظامِ زندگی اور نظامِ کائنات بے کار پیدا نہیں کیا۔

بلکہ اس کا کوئی مقصد ہے؛ وہ مقصد یہ ہے کہ اچھے کام کرنے والوں کو صلہ دیا جائے، انعام دیا جائے، اور برے کام کرنے والوں کو جہنم کی سزا دی جائے۔

(۱) زهر الفردوس ۲ / ۲۶۰ (۵۷۶)

اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ

سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

آپ کی ذات پاک ہے، اے اللہ! ہمیں آگ سے بچالیجیے گا۔

بندہ کی سب سے بڑی کامیابی

ایک بندہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے وہ جہنم کی آگ سے بچ جائے۔ قرآنِ کریم میں بھی آیا ہے کہ جو شخص جہنم کی آگ سے بچ گیا وہ صحیح معنی میں مصیبت سے بچنے والا ہے اور وہ کامیاب ہے[1]۔ اس لیے یہ دعا فرمائی کہ

فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اے پروردگار! ہمیں عذابِ نار سے بچالیجیے۔

یہاں آسمان وزمین کی تخلیق میں غور وفکر کے بعد سب سے پہلی دعا جو زبان پر آئی وہ یہ ہے کہ اے اللہ! آگ کے عذاب سے بچا لیجیے، اس لیے کہ اگر اتنی بات بھی حاصل ہوجائے کہ جہنم سے نجات مل جائے تو یہی بھی کچھ کم کامیابی نہیں ہے۔

جہنم کی آگ سے پناہ کیوں؟

اور یہ کہ ہم جہنم کی آگ سے کیوں پناہ مانگ رہے ہیں؟ اس کی وجہ اگلی دعا میں بیان فرمائی کہ:

(۱) جیسا کہ سورۂ آل عمران آیت ۱۵۸ میں ہے: فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ.

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ [1]

اے ہمارے پروردگار! جس کو آپ نے جہنم میں داخل کردیا تو اس کو آپ نے رسوا ہی کردیا، اور ظلم کرنے والوں کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔

یعنی دنیا میں تو انسان کو کسی تکلیف سے بچانے کے لیے اس کے دوست مل جاتے ہیں، احباب مل جاتے ہیں، سرپرست مل جاتے ہیں، ہمدرد مل جاتے ہیں، جو اس کی کبھی سفارش کردیتے ہیں، لیکن وہاں پر کوئی کسی کا مددگار نہیں ہوگا۔

آج تعلقات کی دنیا میں ہو

آج دنیا کے اندر انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر میرے اوپر کوئی مصیبت آگئی تو میرے فلاں حاکم سے تعلقات ہیں، فلاں افسر سے تعلقات ہیں، فلاں میرا دوست ہے، اس کے تعلقات بہت اچھے ہیں، اس کے ذریعہ نجات پالوں گا۔ لیکن وہاں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ ظلم کرنے والوں کو کوئی مدد گار نہیں ملے گا۔ اپنا بیٹا، اپنا باپ، اپنا بھائی، اپنی بیوی، اپنے بچے، کوئی ساتھ نہیں دے سکے گا، اس دن یہ کیفیت ہوگی:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ ۝ وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ ۝ ؕ [2]

---

(۱) سورۃ آل عمران: آیت (۱۹۲)

(۲) سورۃ عبس آیت (۳۴ تا ۳۶)

اس لیے دعا کی جارہی ہے کہ اے اللہ! ہمیں آگ سے بچالے۔

یہ گناہ آگ ہیں

اور آگ سے بچا لینے کا مطلب ہے گناہوں سے بچالیں، کیوں کہ جہنم کی آگ اس دنیا میں گناہوں کی شکل میں متشکل ہوگئی ہے، اس لیے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا[1]

یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ظالمانہ طریقہ پر کھاتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں۔

اس لیے وہ مال بذاتِ خود آگ ہے۔ جہنم کی آگ جو آخرت میں نظر آئے گی، اس دنیا میں اس کو گناہوں کی شکل میں متشکل کردیا ہے؛ لہٰذا جب ہم یہ دعا کررہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں آگ سے بچا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں گناہوں سے بچا، لہٰذا ساری کائنات میں غور وفکر کرنے اور سوچنے کے بعد زبان پر یہ جملہ آتا ہے کہ اے پروردگار! آپ نے یہ سب چیزیں بے کار پیدا نہیں کی ہیں، بلکہ آخر میں جزا اور سزا ہونے والی ہے، لہٰذا اے اللہ ہمیں جہنم کی آگ سے بچالے۔

منادِی کی آواز پر لبیک کہہ دیا

پھر آگے فرمایا:

---

(۱) سورۃ النساء آیت (۱۰)

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ (۱)

اے پروردگار! ہم نے ایک منادی کی آواز سنی جو یہ پکار رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ۔ یہ منادی کون؟ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ نے ہمیں بلایا، ہمیں آواز دی، کیا آواز دی؟ کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔ یہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پکار تھی۔ تو ہم اس پکار پر عمل کرتے ہوئے ایمان لے آئے۔ اے پروردگار! ہم ایمان تو لے آئے لیکن معلوم نہیں کہ ہم سے کہاں کہاں گناہ سرزد ہوئے، کہاں کہاں ہم سے غلطیاں ہوئیں، اس لیے اے اللہ! ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرمادے، اور ہماری برائیوں کو اپنے دامنِ رحمت سے چھپا دے، اور ان کا کفارہ کر دے کہ گویا کہ وہ ہے ہی نہیں۔ اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ وفات عطا فرما، یعنی مرتے دم تک ہماری صحبت درست رہے، تبھی تو آدمی نیک لوگوں کے ساتھ مرے گا، جب موت کے وقت بھی اس کے ارد گرد جو حلقہ ہو، وہ نیک لوگوں کا ہو، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب انسان اپنی زندگی میں اس بات کا اہتمام کرے کہ اس کی صحبت اچھی ہو، اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کا ملنا جلنا، اس کا ہنسی مذاق کرنا، اس کا ملاقاتیں کرنا، یہ سب نیک لوگوں کے ساتھ ہو، جن کے دلوں میں اللہ جل شانہ کی عظمت ہو، اور دین کی عظمت ان کے دلوں میں ہو، یہاں تک کہ جب موت کا وقت آئے تو اس کے پاس جو حلقہ ہو، وہ ابرار اور نیک لوگوں کا ہو۔

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۹۳)

آگے یہ دعا فرمائی:

رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ [1]

اے ہمارے پروردگار! آپ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو وعدے ہم سے فرمائے ہیں، وہ سب ہمیں عطا فرما۔ اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیے گا۔ بے شک آپ وعدے کی خلاف ورزی نہیں فرماتے۔

نیک لوگوں کے ساتھ موت آئے

لیکن ان دعاؤں کے درمیان میں یہ دعا فرمائی کہ: وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ یعنی جب ہماری موت آئے تو وہ اچھے اعمال والے، اچھے اخلاق والے، اچھی صحبت والے لوگوں کے ساتھ، ان کے جمگھٹے میں موت آئے۔ اس کے ذریعہ اس طرف اشارہ فرمادیا کہ درحقیقت اس منزل تک پہنچنے کے لیے کہ ہمیں آگ سے بچاؤ ہوجائے، اور اللہ تعالیٰ نے جنت کے جو وعدے کیے ہیں، وہ ہمارے حق میں پورے ہوں، اس کے لیے ظاہری اسباب میں جو راستہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری صحبت اچھی ہو، اور ساری زندگی اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، نیک لوگوں کے ساتھ کھانا پینا، نیک لوگوں کے ساتھ ملنا جلنا، یہاں تک جب موت آئے، اس وقت نیک لوگوں کا جمگھٹا ہمارے اردگرد ہو۔

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۱۹٤)

اپنی صحبت درست کرلو

اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اگر تم واقعی "اولو الالباب" عقل مندوں میں داخل ہونا چاہتے ہو، جن کی اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں تعریف فرمائی ہے، تو پھر اپنی صحبت درست کرو، غفلت والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دو، یعنی جو لوگ اللہ سے غافل ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے غافل ہیں، آخرت سے غافل ہیں، اور ان کے دل میں کبھی اللہ تعالیٰ کا خیال بھی نہیں آتا، اور کبھی آتا ہے تو شاذ و نادر آجاتا ہے، ایسے لوگوں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا نہ رکھو، کیوں کہ یہ غفلت بہت بڑی بیماری ہے اور بہت بڑی بلا ہے، اور یہ متعدی بیماری ہے؛ لہٰذا اگر غفلت والوں کے پاس بیٹھوگے، تمہارے اندر بھی غفلت پیدا ہوجائے گی۔ اس لیے ان دعاؤں کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ سبق بھی دے دیا کہ اپنی صحبت درست کرو۔

آپ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے

آخر میں یہ جو جملہ ارشاد فرمایا کہ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ یعنی یہ پکی بات ہے کہ آپ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے، یہ الفاظ اللہ تعالیٰ بندوں سے کہلوا رہے ہیں کہ تم ہم سے یہ کہو۔ ورنہ عام حالات میں اگر کسی بادشاہ سے کہا جائے کہ آپ نے جو وعدہ کیا ہے، آپ اپنے وعدے کی پابندی کریں، تو یہ الفاظ کہنے والے کو پکڑ کر دربار سے نکال دیا جائے گا کہ تو ہمیں وعدہ خلافی کرنے والا سمجھتا ہے؟ لیکن ہمارا اللہ اتنا رحیم اور کریم ہے کہ وہ ہم سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم یہ کہو کہ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ کہ آپ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں

کرتے، ہمیں پتہ ہے، اس لیے آپ نے جو وعدے کیے ہیں، وہ سب ہمیں عطا فرمادیجیے۔

اپنے خیالات کو لگام دو

بہر حال! ان دعاؤں سے بنیادی طور پر دو سبق مل رہے ہیں، ایک یہ کہ اپنے خیالات کو لگام ڈالو، اور ان خیالات کو روکو، اِدھر اُدھر دنیوی چیزوں کی طرف موڑنے کے بجائے اس کو روکو اور اللہ جل شانہ کی طرف اور اس کی قدرتِ کاملہ کی طرف اور اس کی حکمتِ بالغہ کی طرف، اس کی پیدا کی ہوئی کائنات کے ذرّے ذرّے میں اللہ جل شانہ کا جو جلوہ نظر آرہا ہے، اس کی طرف اپنے ذہن کو متوجہ کرو۔ اور یہ سوچا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو کس طرح بنایا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو

دوسرے کہ ان سب چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور اللہ سے سب چیزیں مانگو، جن چیزوں کا اس نے وعدہ کیا ہے، وہ سب اس سے مانگو، اپنے گناہوں کی معافی بھی مانگو، اعمال پر اجر وثواب بھی مانگو، جنت بھی مانگو، اور جس جس عمل میں جتنی نیکیاں، جتنا ثواب رکھا ہے، وہ سب مانگو۔ بعض اوقات شیطان ذہن میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ تو کیا؟ تیری عبادت کیا؟ تو نے نماز پڑھی، کیسی پڑھی؟ تو نے روزہ رکھا، کیسا رکھا؟ تجھے مانگنے کا کیا حق ہے؟ اور یہ جو حدیث شریف میں ہے کہ:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا

تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ.[1]

یہ تو اس شخص کے لیے ہے جو صحیح معنی میں "قیام" کا حق ادا کرے، تو نے قیام کا کیا حق ادا کیا؟ جو تو مانگ رہا ہے۔ ارے نہیں! ہم تو اس کی عبادت کا حق ادا کر ہی نہیں سکتے ہیں، لیکن ہم سب محتاج ہیں۔ لہٰذا انہوں نے جس اجر وثواب کا ہم سے وعدہ کیا ہے، کیا وہ ہمیں اس سے محروم کر دیں گے؟ ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔

اپنی رحمت سے سب کچھ عطا فرما

لہٰذا اللہ تعالیٰ سے یہ کہو کہ یا اللہ! ہم سے تو عبادت کا حق ادا نہیں ہو سکا، اس لیے ہم اجر وثواب کے مستحق تو نہیں ہیں، لیکن آپ اپنی رحمت سے سب کچھ عطا فرما دیجیے، اور ہمیں کسی بھی چیز سے محروم نہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کی سمجھ بھی عطا فرمائے، اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(۱) صحیح البخاری ۱ / ۱۷ (۳۸)
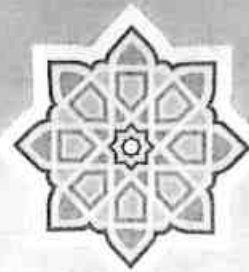
دعا نمبر ۹

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ

مِنَ الْخَاسِرِينَ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا

دعا نمبر ۹

رَبَّنَا ظَلَمۡنَآ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ، وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنۡ تَبِعَهُمۡ بِاِحۡسَانٍ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ اَمَّا بَعۡدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! مناجاتِ مقبول میں جو ابتدائی دُعائیں تھیں، ان کا تھوڑا سا بیان پچھلی مجلسوں میں ہوا۔ آگے جو دعا ہے وہ یہ ہے:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَا أَنۡفُسَنَا وَإِنۡ لَمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (۱)

اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ (یعنی ہم نے گناہ کئے ہیں، اور آپ کے فرمان کے خلاف کام کیا ہے، اور گناہ کرنا درحقیقت اپنی جان پر ظلم ہے، کیونکہ اس گناہ کا انجام آخرت میں عذاب کی صورت میں

---

(۱) سورۃ الأعراف آیت (۲۳)

ہوگا۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔) اگر آپ ہماری بخشش نہ کریں اور ہم پر رحم نہ فرمائیں تو ہم ضرور ان لوگوں میں شامل ہوجائیں گے جو بڑے خسارے میں ہیں۔ (یعنی قیامت کے دن جو بڑے خسارے میں ہوں گے۔)

یہ اللہ تعالیٰ کے حضور مغفرت مانگنے کا ایک طریقہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اور اگر آپ نے مغفرت نہ فرمائی اور رحم نہ فرمایا تو ہم بڑے خسارے میں ہوں گے۔

انسان کی مانگی ہوئی "پہلی دُعا"

درحقیقت یہ پہلی دعا ہے جو کسی انسان نے مانگی، حضرت آدم علیہ السلام کو جب پیدا فرمایا گیا اور ان سے یہ غلطی سرزَد ہوئی کہ جنت کے ایک درخت کے بارے میں حکم دیا گیا تھا کہ ان کو مت کھانا۔ مگر انہوں نے شیطان کے بہکاوے میں آکر کھالیا۔ تو اس کے نتیجے میں ان کی شرم گاہیں کھل گئیں، کیسے کھل گئیں؟ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، لیکن بعض مفسرین نے فرمایا کہ درحقیقت اُن کے جسم پر جنت کا ایک نوری لباس تھا، وہ تمام لباس سے مختلف تھا، جب غلطی ہوئی تو وہ نور زائل ہوگیا، تو شرمگاہیں بھی ظاہر ہوگئیں۔ (۱)

عریاں ہونا فطرۃً برائی ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی تھی کہ اس کا عریاں ہونا بڑے عیب کی بات ہے، پریشانی اور برائی کی بات ہے، اس لئے

(۱) تفسیر طبری ۱۱۴/۱۰

حضرت آدم علیہ السلام پریشان ہوگئے کہ یہ کیا ہوگیا؟ اور اس وقت حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا علیہا السلام کو یہ پتہ نہیں تھا کہ غلطی سے تدارک کا کیا طریقہ ہے، قرآنِ کریم میں ہے کہ:

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا

یعنی جوانہوں نے اس درخت سے چکھا، یعنی ابھی مزے لے کر کھایا نہیں تھا، بلکہ ابھی صرف چکھا ہی تھا تو چکھتے ہی وہ نور کا لباس اُتر گیا، شرمگاہیں سامنے آگئیں اور احساس ہوا کہ ہم سے بہت سخت غلطی ہوگئی۔

غلطی کا تدارک خود ہی سکھایا

اب اس غلطی کا تدارک کیا ہو؟ اس وقت تک پتہ نہیں تھا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز آئی کہ:

أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ [1]

کہ کیا میں نے تم دونوں کو منع نہیں کیا تھا کہ اس درخت کے پاس مت جانا۔

اب شرمندگی ہورہی ہے، ندامت ہورہی ہے، لیکن اس کا طریقہ معلوم نہیں کہ اس غلطی کا تدارک کیسے ہو؟ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے کہ:

فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ [2]

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت (۲۲)

(۲) سورۃ البقرۃ آیت (۳۷)

یعنی آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے چند کلمات سیکھے۔

اس رحیم کریم کی ذات کو دیکھو کہ الفاظ بھی خود ہی سکھائے کہ یوں کہو، جب یوں کہو گے تو تمہارا گناہ معاف ہوجائے گا۔ لہٰذا یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے سکھائے ہوئے ہیں۔

"أَنْفُسَنَا" جمع کا صیغہ لانے پر اشکال

انسان کی پہلی دعا یہ ہے کہ:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ[1]

یعنی اے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ابتداء میں تثنیہ کا صیغہ ہے "قَالَا"، یعنی دونوں نے یعنی حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام نے کہا۔ کیا کہا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا

اب سوال یہ ہے کہ صرف دو افراد تھے، ایک حضرت آدم علیہ السلام اور دوسری حضرت حوا۔ اس لئے ابتداء میں "قالا" تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا۔ لیکن آگے جمع کے الفاظ "أَنْفُسَنَا" لائے اور قاعدہ کے لحاظ سے کہنا چاہئے تھا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا نَفْسَيْنَا

"نَفْسَيْنَا" تثنیہ کا لفظ ہے کہ ہم دونوں نے اپنی اپنی جانوں پر ظلم کیا، جبکہ "أَنْفُسَنَا" جمع کا صیغہ ہے، جس کے اطلاق کے لئے کم از کم تین افراد ہونے چاہئیں۔

(۱) سورۃ الاعراف آیت (۲۳)

جمع کا صیغہ لانے کی وجہ

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوّا علیہما السلام درحقیقت آگے کی پوری نوعِ انسانی کے لئے نمائندے تھے، لہٰذا ان کو پتہ تھا کہ ہمارے صلب سے قیامت تک اولاد پیدا ہونے والی ہے، اس لئے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے اور اپنی اہلیہ کے ساتھ آئندہ آنے والے تمام انسانوں کو شامل کرلیا اور فرمایا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا

آدم علیہ السلام کو پہلے جنت میں کیوں رکھا گیا؟

اب یہاں ایک بات سمجھنے کی ہے، وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کا فیصلہ پہلے ہی کرلیا تھا، اور حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے پہلے ملائکہ ہی سے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا کہ:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۱)

یعنی زمین میں اپنا نائب پیدا کرنا چاہتا ہوں۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ اس خلیفہ کو زمین پر بھیجا جائے گا۔ لیکن آدم علیہ السلام کو جب پیدا فرمایا تو ان کو جنت میں رکھ دیا۔ جنت میں کیوں رکھا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ زمین پر بھیجنے کے لئے ان کے اندر ابھی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے کہ انسان کو غلطی کا پیکر بنایا تھا، اب غلطی پہلے ثابت ہوتی اور وہ اس پر دعا کرتے اور اس پر استغفار کرتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے، اپنی

---

(۱) سورة البقرة: آیت (۳۰)

جانوں پر ظلم کا اعتراف کرتے، پھر اس قابل ہوتے کہ ان کو زمین پر بھیجا جائے۔ لہٰذا پہلے جنت میں بھیجا، وہاں غلطی ہوئی اور اس غلطی پر استغفار کیا، اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا، تو اس کے بعد فرمایا کہ اب تم زمین پر جاؤ۔ اور ایک ہتھیار ساتھ لے کر جاؤ۔

غلطی پر انانیت والا جواب

ایک طرف ہم نے ابلیس کو پیدا کر دیا ہے اور ایک غلطی اس سے ہوئی کہ جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو اس نے آدم کو سجدہ نہیں کیا۔ اور جب اس سے غلطی کی وجہ پوچھی گئی تو اس پر اس نے جو جواب دیا، وہ انانیت والا جواب تھا، اس نے غلطی پر کوئی ندامت نہیں کی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مردود اور مطرود کر دیا۔

میری معافی کا کوئی راستہ ہوسکتا ہے؟

شاید حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت لکھی ہے، اس کی سند کا تو پتہ نہیں۔ لیکن حقیقت میں بڑی سبق آموز حکایت ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم کلامی کے لئے کوہِ طور پر تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں ابلیس سے ملاقات ہوگئی، ابلیس نے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے لئے تشریف لے جا رہے ہیں، میری بھی ایک درخواست پیش کر دیں، انہوں نے پوچھا کہ کیا درخواست؟ اس نے کہا کہ گناہ کراتے کراتے اب تھک گیا ہوں تو کیا میری توبہ کا کوئی راستہ ہوسکتا ہے؟ اور میری معافی ہوسکتی ہے؟

ان کی قبر کو جا کر سجدہ کر لے

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے وعدہ کرلیا کہ میں تمہاری درخواست پیش کردوں گا، چنانچہ کوہِ طور پر آپ پہنچے۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی، اب شیطان کی درخواست پیش کرنا یاد نہ رہا، جب واپسی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ راستے میں آپ کی کسی سے ملاقات ہوئی تھی؟ اب ان کو یاد آ گیا، کہا: ہاں! ابلیس سے ملاقات ہوئی تھی، اس نے کہا کہ میری توبہ کا اور میری معافی کا کوئی راستہ ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اس سے کہنا کہ تمہاری غلطی یہ تھی کہ تم نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا، اب آدم موجود نہیں ہیں، ان کی قبر کو سجدہ کر لے، ہم معاف کردیں گے۔

میں مُردہ کو سجدہ کروں؟

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام بہت خوش ہوگئے کہ یہ تو بہت آسان راستہ ہے۔ واپسی میں دوبارہ ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے تو بہت آسان راستہ کردیا، اور فرمایا کہ تو نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا، یہی تیری غلطی تھی، اب وہ تو موجود نہیں ہیں، ان کی قبر موجود ہے، اس کو سجدہ کر لے، ہم معاف کردیں گے۔ یہ سن کر ابلیس نے کہا:

واہ! زندہ کو تو میں نے سجدہ کیا نہیں، اب مردہ کو سجدہ کروں؟

یہ نہیں ہوسکتا!!

چونکہ اس کے اندر سرکشی اور انانیت تھی، جس نے اس کو اس مردودیت کے

مرتبہ پر پہنچایا۔[1]

ابلیس کی عقلی دلیل

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے سے دو نظارے دکھائے۔ ایک طرف یہ کہ ابلیس نے غلطی کی، جب اس سے غلطی ہوئی تو اس نے تکبر کا مظاہرہ کیا، اور بجائے گردن جھکنے کے اس کا سینہ اور تن جاتا ہے اور اپنی غلطی کی تاویل کرتا ہے کہ:

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ[2]

کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔

علامہ اقبالؒ نے اس پر بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ ؎

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دِل نہ کر قبول

ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے عقلی دلیل پیش کرنی شروع کر دی۔ اور تکبر کا مظاہرہ کر رہا تھا، انانیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

---

(۱) أخرجه ابن ابی الدنیا فی مکائد الشیطان ص ٦٥ (٤٤) عن ابن عمر موقوفا وانظر تلبیس ابلیس لابن الجوزی ١ / ٢٤١ (٧٧). طبع دار الوطن
(۲) سورۃ الاعراف آیت (۱۲)

دو غلطیوں کا نظارہ

دوسری طرف حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام سے غلطی ہوئی اور جونہی اپنی غلطی کا احساس ہوا، فوراً اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی دعا مانگی:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۔ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۱)

تو اللہ تعالیٰ نے دو غلطیوں کا نظارہ کرادیا۔ ایک غلطی پر ردِّ عمل کرنے والا جو سینہ تان کر یہ کہہ رہا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے، غلطی ماننے سے انکار کردیا اور غلطی نہ ہونے پر عقلی دلیل دینے لگا کہ:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۲)

کہ میں آدم سے افضل ہوں، اس لئے کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا اور آگ مٹی سے افضل ہے، لہٰذا میں زیادہ افضل ہوں، میں اس کو کیوں سجدہ کروں؟

میں ''لوجک'' کے مطابق ہوں

یہ ''لبرل اِزم'' ہے کہ ہر بات میری عقل کے مطابق ہونی چاہئے، لہٰذا ابلیس عقل دوڑا رہا تھا، انانیت کا مظاہرہ کر رہا تھا، چوری پر سینہ زوری کر رہا تھا، عقلی دلیل پیش کر رہا تھا کہ یہ ''لوجک'' کی بات ہے، ''لوجک'' کے مطابق میں

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت (۲۳)
(۲) سورۃ الاعراف آیت (۱۲)

کررہا ہوں۔ لہٰذا میں غلطی پر نہیں ہوں۔ تو ایک ابلیس کی غلطی دکھا دی۔ اور دوسری غلطی حضرت آدم اور حضرت حوّا علیہما السلام کی دکھادی کہ جب ان سے غلطی ہوئی تو انہوں نے اقرار کرلیا اور کہا کہ یااللہ! ہم سے اپنی جانوں پر ظلم ہوا، ہم نے غلطی کی ہے۔ اے اللہ! ہمیں معاف فرما!

اب تم زمین پر اُتر جاؤ

اور جب غلطی کروادی اور غلطی کی تلافی کا طریقہ بھی بتا دیا اور غلطی کا اعتراف کرنا اور اس پر نادم ہونا بھی سکھا دیا، اس کے بعد ہم نے ان سے کہا:

اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا [1]

تم زمین پر اُتر جاؤ۔

چونکہ جس مقصد کے لئے تمہیں پیدا کیا تھا، اس مقصد کے لئے تم غلطی سے پہلے تیار نہیں تھے، کیونکہ تمہیں یہ پتہ چلنا چاہئے تھا کہ میں انسان ہوں اور شاید کسی وقت مجھ سے غلطی ہوجائے تو اس وقت میں کیا کروں گا؟ اس کام کے لئے تمہیں تیار کرنا مقصود تھا، پھر جب تم تیار ہوگئے تو ہم نے کہا:

اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ [2]

کہ تم سب کے سب جنت سے اُتر جاؤ۔ اور زمین پر تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔

---

(۱) سورة طه آيت (۱۲۳)

(۲) سورة البقرة آيت (۳٦)

ہتھیار سے لیس کر کے بھیجا

یعنی شیطان تمہارا دشمن اور تم شیطان کے دشمن، اور اب ہم نے تم کو ایسے ہتھیار سے لیس کرادیا ہے کہ جب کبھی شیطان تمہیں گمراہ کرے اور وسوسہ ڈالے اور اس کے نتیجے میں تمہارے قدم ڈگمگائے تو اس وقت کے لئے ہم تمہیں ہتھیار دے رہے ہیں کہ یہ پڑھو:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۱)

چونکہ ہم صرف زہر پیدا نہیں کرتے بلکہ اس زہر کا تریاق بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایک طرف ہم نے شیطان کی شکل میں زہر پیدا کیا تو دوسری طرف ہم نے استغفار کا تریاق بھی دیدیا، جس کا استعمال بھی آسان ہے، اس کے لئے کوئی لمبی چوڑی محنت کی ضرورت نہیں۔

غلطی کا اعتراف کرلو

لٰہذا جب غلطی ہوجائے تو مان لو، اور کہو کہ: یااللہ! غلطی ہوگئی۔ یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم گناہ کیے جاؤ اور سینہ زوری دکھاتے جاؤ اور اس غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ''لوجک'' اور عقلی دلائل پیش کرتے جاؤ کہ جو عمل میں نے کیا تھا وہ غلطی نہیں تھی، میں نے بالکل ٹھیک کیا تھا، یہ تو مولویوں نے دین کو مشکل بنادیا ہے ورنہ دین تو آسان تھا۔ اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے، ہم دلائل

---

(۱) سورۃ الأعراف آیت (۲۳)

سے ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ عمل درست ہے۔ ٹھیک ہے، اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کر دو۔ لیکن تمہارا حال وہی ہوگا جو ابلیس کا ہوا تھا۔

ایک طریقہ: گناہ تسلیم کرنے سے انکار

دیکھئے! بعض اوقات انسان ایسے حالات میں اور ایسے ماحول میں پھنسا ہوتا ہے کہ اس کو گناہ چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ اب اس صورت میں دو طریقے ہیں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ تم اس گناہ کو گناہ تسلیم کرنے سے انکار کر دو اور یہ کہہ دو کہ کیا کریں ہم ایسے ماحول میں جی رہے ہیں جہاں جینا مشکل ہے، اس لئے کہ آج کل کے حالات ہی ایسے ہیں، ماحول ہی ایسا ہے، زمانے کے تقاضے ہی ایسے ہیں، لہٰذا ہم جو کر رہے ہیں وہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے۔

دوسرا طریقہ: گناہ ہو جانے کا اقرار

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اقرار کرے کہ یہ عمل ہے تو گناہ، ناجائز ہے، غلطی ہے، کرنا نہیں چاہئے تھا، لیکن ہم اس گناہ کے اندر پھنسے ہوئے ہیں، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے نکال دے۔ دونوں طریقوں میں فرق دیکھ لو۔ پہلا طریقہ "ابلیس" والا ہے اور دوسرا طریقہ حضرت آدم اور حضرت حوّا علیہما السلام والا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے اور اس سے وہ گناہ چھوڑا نہیں جا رہا ہے تو پہلا طریقہ اختیار کرنے کی بجائے دوسرا طریقہ اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ سے کہہ دے کہ یا اللہ! میں جانتا ہوں کہ مجھ سے گناہ سرزد ہو رہا ہے، غلطی ہو رہی ہے، لیکن نفس و شیطان کے جال میں پھنسا ہوا ہوں، اے اللہ! مجھے

معاف کردے اور مجھے اس سے نکال دے۔ یہ شخص اُس دوسرے شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے جو اپنے گناہ کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

خوبی میری یہی تھی کہ اہلِ خطا تھا میں

بھائیو! اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس وقت زمین پر بھیجا، جب اس میں غلطی کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگئی اور اس غلطی پر استغفار کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوگئی، اس سے پہلے وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس کو زمین پر بھیجا جاتا۔ کسی زمانے میں، میں نے ایک شعر کہا تھا کہ ؎

معصوم تھا، نہ واقفِ سجود و دُعا تھا میں
خوبی مری یہی تھی کہ اہلِ خطا تھا میں [1]

فرشتوں کے اندر خطا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لئے اللہ رب العزت نے انہیں خلیفہ بنا کر زمین پر نہیں بھیجا۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام میں جب خطا کی اہلیت پیدا ہوگئی اور اس خطا کی تلافی کا ہتھیار بھی اُن کو مل گیا تو اب اُن کو زمین پر بھیجا گیا اور اب وہ ''اہلِ خطا'' بن گئے۔

ابلیس کے لئے بھی تو اِک ابتلاء تھا میں

ایک اور شعر میں نے اسی کے بارے میں کہا تھا کہ ؎

ابلیس ہے میرے لئے اِک امتحاں تو کیا
ابلیس کے لئے بھی اِک ابتلاء تھا میں

---

(۱) گوشۂ تنہائی، شعری مجموعہ از حضرت والا دامت برکاتہم ص ۸۶

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو بھی تو مجھ سے ہی آزمایا تھا کہ اس کو سجدہ کر، اب اللہ تعالیٰ نے اس کو میرے لئے ابتلاء بنا دیا کہ وہ تمہیں بہکائے گا، لیکن بہکانے کا طریقہ تمہیں پہلے ہی سے سمجھا دیا کہ جب وہ بہکائے اور جب یہ سانپ تمہیں ڈسے تو فوراً یہ تریاق استعمال کرو اور کہو:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَاسکتہ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ [1]

''استغفار'' بڑی عظیم چیز ہے

لہٰذا یہ ''استغفار'' بڑی عظیم چیز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے جو بندوں کو عطا ہوئی ہے کہ یا اللہ! معاف کر دے۔ یہ بڑا زبردست جملہ ہے، اس کے ذریعہ ستر سال کے گناہ ایک لمحہ میں معاف ہو جاتے ہیں اور ان گناہوں پر قلم پھیر دیا جاتا ہے اور پھر نامۂ اعمال میں بھی ان کا وجود باقی نہیں رہتا۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ شیطان کی مخلوق بیکار پیدا فرما دی جو ہمیں بہکاتی ہے، اور ہمیں غلط کاموں پر آمادہ کرتی ہے۔ ارے بھائی! اس مخلوق کو اس لئے پیدا فرمایا تاکہ تم استغفار کو استعمال کرو، اور اس کے بعد تمہاری غلطیوں پر اللہ تعالیٰ اپنی غفّاری کا، اور اپنی ستّاری کا مظاہرہ فرمائیں۔

تم سے غلطیاں ضرور ہوں گی، لیکن اسی کے ساتھ ''استغفار'' کو اپنے لئے لازم کر لو، جب بھی غلطی ہو جائے، فوراً کہو:

---

(۱) سورۃ الأعراف آیت (۲۳)

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ

اللہ تعالیٰ نے کتنا آسان نسخہ بتا دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استغفار کی کثرت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں سارے دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا ہوں۔[1] وہ ذات جو گناہوں سے پاک ہے، جو معصوم ہے، جن سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی، اور اگر ہو بھی جائے تو بھی اللہ تعالیٰ نے سب معاف کرنے کا اعلان کر دیا اور فرمایا:

لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ [2]

اس کے باوجود فرما رہے ہیں کہ میں دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

سابقہ درجہ سے استغفار

اب سوال یہ ہے کہ کس چیز سے استغفار؟ جبکہ گناہ کوئی نہیں ہے۔ علماء کرام نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ والا صفات میں پیہم اور مسلسل ترقی ہو رہی تھی، ہر اگلے لحہ میں ترقی کے ایک زینہ پر چڑھ رہے تھے اور اس کے بعد اگلے لحہ ایک اور زینہ پر۔ اس طرح مسلسل ترقی ہو رہی تھی اور جب آپ اگلے زینہ پر پہنچتے تو پچھلا جو درجہ تھا وہ بھی آپ کو ایک گناہ نظر آتا تھا، تو اسی سابقہ درجہ پر استغفار کرتے تھے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۸ / ۶۷ (۶۳۰۷)

(۲) سورۃ الفتح آیت (۲)

میں گناہگار اور ذلیل بندہ کی طرح دعا کرتا ہوں

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدہ میں پڑے تھے اور زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ:

أَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ، مَنْ خَشَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهُ، ...وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهُ وَذَلَّ لَكَ جَسَدُهُ ...وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ۔ (۱)

ان الفاظ سے آپ دعا فرمارہے ہیں، یعنی میں گناہگار اور ذلیل بندہ کی طرح گڑگڑا کر دعا کررہا ہوں۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد جس پر ملائکہ بھی رشک کریں، اور اس آسمان وزمین کے درمیان ایسا شاہکار اللہ تعالیٰ نے کوئی اور پیدا نہیں کیا، وہ اپنے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں:

أَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْـمُذْنِبِ الذَّلِيلِ

میں گناہگار اور ذلیل بندہ کی طرح گڑگڑا کر دعا کررہا ہوں۔

یہی عبدیت کا کمال تھا کہ اپنے آپ کو یوں کہیں "الْـمُذْنِبِ الذَّلِيلِ" اور اسی عبدیت کے کمال کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج پر پہنچایا۔

---

(۱) ماخوذ از کتاب الدعاء للطبرانی ۲ / ۱۲۰۷ (۸۷۷)، والمعجم الكبير للطبرانی ۱۱ / ۱۷٤ (۱۱٤۰۵) والمعجم الصغير للطبرانی ص ۲۵۹ (٦٨٦) وقال الهيثمی فی "المجمع" ۳ / ٥٦٠ (٥٥٤٩): وفيه يحيى بن صالح الأيلى قال العقيلى: روى عنه يحيى بن بكير مناكير، و بقية رجاله رجال الصحيح.

بھاری جملہ ''مجھ سے غلطی ہوگئ''

لہٰذا ''استغفار'' بہت آسان کام ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتا رکھا ہے کہ جب غلطی ہو جائے تو فوراً ''استغفار'' کرلو۔ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی زبان پر یہ جملہ آنا بہت بھاری معلوم ہوتا ہے کہ ''مجھ سے غلطی ہوگئی۔'' اور اگر ان کو ان کی غلطی بتائی جائے تو فوراً اس کی تاویل شروع کردیں گے اور فوراً اس کی کوئی توجیہہ بیان کرنا شروع کردیں گے اور یہ کہنا ان کو بہت بھاری معلوم ہوتا ہے کہ ''مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردو۔'' اللہ تعالیٰ ہمیں ان میں سے نہ بنائے۔ آمین

بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

كُلُّ ابْنِ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ[1]

یعنی تم سب خطا کار ہو، لیکن خطا کاروں میں سب سے بہتر وہ ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں۔

''بہت توبہ'' پر ایک اشکال ہوتا ہے کہ جب توبہ ایک مرتبہ کرلی تو سب گناہ معاف ہو گئے اور قصہ پاک ہو گیا اور بزرگوں نے یہ کہا بھی ہے کہ جب آدمی ایک مرتبہ صدقِ دل سے توبہ کرلے تو پھر اس گناہ کو بھول جائے، اب بار بار توبہ

(۱) سنن الترمذی ٤ / ٢٣٧ (٢٤٩٩) وقال: هذا حديث غريب ... اه و ذكره الحافظ ابن حجر فی "بلوغ المرام" ١ / ٤٩٦ (١٣٨٠) وقال: وسنده قوی

کرنے کی کیا ضرورت؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غلطی بھی بار بار ہو رہی ہے اور توبہ بھی بار بار کر رہا ہے۔ اگرچہ اپنی طرف سے عزم تو یہ ہے کہ گناہ نہیں کروں گا، لیکن بتقاضائے بشری پھر گناہ ہو جاتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے، پھر گناہ ہو جاتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے۔

وہ اصرار کرنیوالوں میں نہیں

یہی معنی اس حدیث کے ہیں جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَا اَصَـرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ، وَ إِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِينَ مَرَّةً (۱)

یعنی جو آدمی استغفار کرتا رہتا ہے وہ اصرار کرنے والوں میں شامل نہیں ہے، خواہ وہ دن میں ستر مرتبہ وہی گناہ دہرائے۔

اس حدیث سے اس آیتِ کریمہ کی طرف اشارہ ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۲)

---

(۱) سنن أبی داؤد۲ / ۳۸۰ (۱۵۰۹) و سنن الترمذی ۵ / ۵۲۳ (۲۵۵۹) وقال الترمذی: هذا حدیث غریب، انما نعرفه من حدیث أبی نصیرة ولیس اسناده بالقوی، والحدیث ذکره الحافظ ابن حجر فی "فتح الباری" ۱ / ۱۱۲ وقال: اسناده حسن

(۲) سورۃ آل عمران: آیت (۱۳۵)

اللہ کے سوا مغفرت کرے گا بھی کون؟

اس آیتِ کریمہ میں اچھے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سے اگر کوئی بے حیائی کی بات ہوگئی یا انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا تو فوراً وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور درمیان میں ایک جملہ یہ فرمادیا کہ ارے بھائی! اللہ میاں کے سوا مغفرت کرے گا بھی کون؟ اور جو کچھ گناہ کئے تھے اس پر وہ لوگ اصرار نہیں کرتے۔ ''اصرار'' کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ آدمی غلطی کرنے کے بعد اس پر سینہ زوری کرے کہ میں نے تو ٹھیک کیا تھا اور ''اصرار'' کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ گناہ کرنے پر اصرار کرنا کہ جس وقت توبہ کررہا ہے، اسی وقت سے یہ ارادہ ہے کہ دوبارہ گناہ کروں گا۔

اس کی معافی ہوجائے گی

اس حدیث شریف میں فرمایا کہ جو شخص استغفار کرتا رہتا ہے وہ اصرار کرنے والوں میں نہیں لکھا جاتا، چاہے اس نے ستر مرتبہ گناہ کیا ہو، بشرطیکہ وہ استغفار بھی کرتا رہا ہو، کبھی نہ کبھی ان شاء اللہ اس کی معافی بھی ہوجائے گی۔ اور کبھی نہ کبھی اس کی اصلاح بھی ہوجائے گی، ان شاء اللہ۔ لہٰذا استغفار کو نہ چھوڑے اور یہ دعا کرتا رہے کہ:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ﵋ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۱)

---

(۱) سورۃ الأعراف: آیت (۲۳)

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے یہ دو قسم کی غلطیاں کرا کر دکھادیں۔ ایک ابلیس کی غلطی اور ایک حضرت آدم اور حضرت حوّا کی غلطی۔ اور دونوں کی فطرت کا فرق بھی واضح فرمادیا۔ اور جب حضرت آدم علیہ السلام اس دعا اور استغفار سے لیس ہوگئے تو پھر حکم دیا کہ اب زمین پر اُتر جاؤ، اب تم اس قابل ہوگئے ہو کہ تم شیطان سے مقابلہ کرسکوگے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اور اپنی رحمت سے ہم سب کو استغفار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے گناہوں پر اصرار کرنے کے بجائے بخشش مانگنے کی طرف ہمیں متوجہ فرمادے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۱۰

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰی كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! مناجاتِ مقبول کی دُعاؤں کی تشریح کا سلسلہ کئی دنوں سے چل رہا ہے۔ آگے جو دعا ہے وہ یہ ہے کہ:

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ (۱)

صبر ہم پر انڈیل دیجیے

اس دُعا کے شروع میں وہی جملہ ہے جو پہلے ایک دُعا میں آچکا ہے۔ وہ دُعا یہ تھی:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲)

---

(۱) سورة الأعراف: آیت ۱۲۶

(۲) سورة البقرة: آیت (۲۵۰)

یہاں بھی پہلا جملہ وہی ہے، یعنی:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا

اے ہمارے پروردگار! ہمارے اُوپر صبر انڈیل دیجئے۔

''انڈیلنا'' کا لفظ وہاں بھی تھا اور یہاں بھی ہے۔ جیسے کوئی بچہ دوا پینے سے بھاگ رہا ہو اور اس بچے کو دوا پلانا مشکل ہو رہا ہو تو اس صورت میں زبردستی اس کے منہ میں دوا کو انڈیل دیا جاتا ہے۔ ان دونوں دعاؤں میں یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ''انڈیلنا'' کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی چیز تھوڑی تھوڑی کرکے ڈالی جاتی ہے تو جس برتن سے ڈالی جاتی ہے اس میں تھوڑی سی بچ بھی جاتی ہے، لیکن اگر پورا انڈیلا جاتا ہے تو پھر اس برتن میں کچھ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح اس دُعا میں جب یہ کہا جارہا ہے کہ صبر ہم پر انڈیل دیجئے، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مکمل صبر عطا فرما دیجئے۔

یہ دعا کس نے مانگی تھی؟

یہاں پر جو دعا ہے، اس میں یہ فرمایا کہ:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ

اے ہمارے پرودگار! ہم پر صبر انڈیل دیجئے۔ اور ہمیں مسلمان ہونے کی حالت میں موت دیجئے۔ (یعنی اس حالت میں کہ ہم آپ کے تابعدار ہوں۔)

''مسلم'' کے معنیٰ ہیں ''تابعدار''۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دُعا کس نے مانگی

تھی؟ قرآنِ کریم میں جو دُعائیں آئی ہیں، ان میں سے بعض دُعائیں تو وہ ہیں جس کو قرآنِ کریم خود بتاتا ہے کہ یہ دعا کرو۔ اور بعض جگہ پر قرآنِ کریم دوسروں کی، کی ہوئی دعا کو نقل کرتا ہے کہ یہ دعا ہے جو فلاں شخص نے فلاں وقت مانگی تھی۔

طالوت اور اس کے لشکر کی مانگی ہوئی دُعا

پیچھے جو دُعا گزری کہ:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ (۱)

اس دُعا کے بارے میں، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ وہ دعا ہے جو طالوت اور اس کے لشکر نے اس وقت مانگی تھی جب وہ ''عمالقہ'' جیسی قوی ہیکل قوم سے مقابلہ کرنے جارہے تھے، جب انہوں نے ابتداء میں ''عمالقہ'' کو دیکھا کہ وہ بہت اُونچے قدوقامت کے لوگ ہیں، تو ان کو دیکھ کر پہلے یہ کہا:

لَا طَاقَةَ لَنَا الۡيَوۡمَ بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ (۲)

کہ جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ لیکن اس لشکر میں کچھ لوگوں نے کہا کہ:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ (۳)

---

(۱) سورة البقرة: آیت (۲۵۰)

(۲) سورة البقرة: آیت (۲۴۹)

(۳) سورة البقرة: آیت (۲۵۰)

جادوگروں کی مانگی ہوئی دُعا

اور یہ دُعا ''رَبَّنَآ أَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرٗا وَتَوَفَّنَا مُسۡلِمِينَ'' ان جادوگروں نے مانگی تھی جن کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا وہ معجزہ جو آپ کو نبوت کے وقت ہی دے دیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ یہ نشانی لے کر فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ معجزہ یہ تھا کہ اپنا عصا زمین پر پھینکو گے تو وہ عصا اژدہا بن کر چلتا ہوا نظر آئے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں یہ معجزہ دکھایا۔ اور فرعون خدائی کا دعویدار تھا کہ میں خدا ہوں، ''أَنَا رَبُّكُمُ الۡأَعۡلَىٰ'' [1] کہتا تھا، اور کہا کرتا تھا:

اَلَيۡسَ لِیۡ مُلۡكُ مِصۡرَ وَهٰذِهِ الۡاَنۡهٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ [2]

کیاتم یہ نہیں دیکھتے کہ مصر کی ساری سلطنت میرے پاس ہے اور یہ دریا میرے نیچے سے بہہ رہے ہیں۔ ارے تمہیں نظر نہیں آتا؟ اتنی بدیہی بات ہے کہ میں ان سب کا مالک ہوں۔

فرعون سے نرمی سے گفتگو کرنا

بہرحال! حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس سے نرمی سے

(۱) سورۃ النازعات: آیت (۲۴)

(۲) سورۃ الزخرف: آیت (۵۱)

بات کی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (۱)

کہ اس سے نرمی سے بات کرنا۔ چنانچہ آپ نے اس سے نرمی سے بات کی، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کیا۔ پہلے تو اس نے یہ تسلیم ہی نہیں کیا کہ میرے علاوہ بھی کوئی خدا ہوسکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نشانی دکھا دوں؟ اس نے کہا: ہاں! دکھاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر پھینکا اور وہ سانپ بن کر فرعون کی طرف بڑھنے لگا۔ اس میں بہت سی اسرائیلی روایات ہیں کہ اس وقت کیا ہوا۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ فرعون بھاگ کھڑا ہوا۔ وغیرہ

سارے معاملات اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے

فرعون نے کہا: اچھا یہ تو تم اپنا جادو دکھا رہے ہو؟ اب ایک طرف تو یہ دیکھئے کہ فرعون جو اتنی بڑی سلطنت کا مالک ہے، اس فرعون کے پاس جاتے ہیں اور جا کر صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ تم اللہ کو مان لو اور بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ لیکن فرعون کو اس بات کا خوف ہوا کہ اگر یہ معجزہ دوسروں تک پہنچ گیا تو وہ بھی میرے دین سے مرتد ہوجائیں گے، چنانچہ فرعون نے کہا کہ میں جادوگروں کو جمع کرتا ہوں اور ان کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہوگا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ ہورہا تھا، ورنہ فرعون اگر چاہتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام

---

(۱) سورة طه: آيت (٤٤)

کو اہمیت ہی نہ دیتا، ویسے ہی اپنے دربار سے نکال دیتا کہ چلو بھاگو یہاں سے۔

ہمیں کچھ اُجرت بھی ملے گی؟

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کچھ ایسا رُعب طاری کردیا کہ اس نے سوچا کہ اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور اس کو ہرانا ضروری ہے۔ اگر میں نے اس کو نہ ہرایا تو میرا یہ تخت جارہا ہے اور میری یہ بادشاہت ختم ہورہی ہے۔ لہٰذا فرعون نے سارے ملک میں اعلان کرادیا اور سارے ملک سے بڑے بڑے جادوگر جمع ہوگئے۔ جب جمع ہوگئے تو وہ فرعون سے پوچھ رہے ہیں کہ:

أَإِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (۱)

ہم آگئے، اور ہم اپنے جادو کا مظاہرہ کریں گے اور اگر موسیٰ پر غالب آگئے تو ہمیں کوئی اُجرت بھی ملے گی؟ ان جادوگروں کا دھیان اُجرت کی طرف ہے۔ فرعون جواب میں کہتا ہے کہ:

نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۲)

ہاں! اُجرت بھی ملے گی اور میرا قرب بھی حاصل ہوگا۔ میں تمہیں اپنا مقرب بنالوں گا۔

---

(۱) سورۃ الشعراء: آیت (۴۱)

(۲) سورۃ الشعراء: آیت (۴۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف

جب مقابلہ شروع ہوا تو ان جادوگروں نے اپنا عظیم جادو دکھایا جس کے نتیجے میں لوگوں پر خوف طاری ہوگیا۔ قرآنِ کریم نے فرمایا:

وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَاءُوْا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ [1]

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں بھی کچھ خوف سا آنے لگا کہ یہ اتنا بڑا مجمع ہے، یہ اتنے سارے جادوگر ہیں، میرے پاس تو جادو بھی نہیں ہے اور مجھے تو جادو کا توڑ کرنا بھی نہیں آتا۔

سب سانپ نگل گیا، میدان خالی

اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلٰى، وَأَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا [2]

آپ ڈرو نہیں، آپ ہی سربلند ہوگے، اور تمہارے داہنے ہاتھ میں جو ہے تم اسی کو ڈال دو وہ ان کی کاریگری کو نگل لے گا۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈال دیا اور جیسے ہی اس کو ڈالا تو وہ اژدہا بن گیا اور ان جادوگروں نے جو سانپ اور اژدہے بنائے تھے، ایک ایک کرکے

---

(۱) سورۃ الأعراف: آیت (۱۱۶)

(۲) سورۃ طٰه: آیت (۶۹-۶۸)

نگلنا شروع کردیا، یہاں تک کہ سب کو نگل گیا۔

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ (۱)

جب جادوگروں نے یہ دیکھا کہ سارا میدان خالی ہوگیا، اور اسی اژدہے نے ہمارے بنائے ہوئے سانپ اور اژدہے کھالئے، اب میدان میں حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کا اژدہا موجود ہے، باقی سب ختم ہوچکے، وہ سب سجدہ میں گر گئے۔ جب ایک طرف تو ان جادوگروں کو کھلی شکست ہوگئی، اور وہ ذلیل ہوکر پیچھے ہٹ گئے، لیکن ان کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام جو کچھ لائے ہیں، اس کا جادو سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ لوگ جادو کے فن کو بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ جادو کیا ہوتا ہے اور ان کو یقین آ گیا کہ یہ جادو نہیں ہے، یہ کوئی اور بات ہے، یہ اللہ کے صحیح بندے ہیں اور اللہ کا صحیح پیغام لے کر آئے ہیں، پیغمبر ہیں، چنانچہ اس معجزہ کا یہ اثر ہوا کہ:

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ (۲)

کہ وہ تمام جادوگر سجدے میں گرادیئے گئے۔

یعنی ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا، سوائے اس کے کہ وہ سجدہ میں گر جائیں۔ جو نظارہ انہوں نے دیکھا، اس کے دیکھنے کے بعد ان کے دل میں اتنا گہرا ایمان پیدا ہوا کہ اس کے سوا اور کچھ ان کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ سجدہ میں گر جائیں۔

---

(۱) سورۃ الأعراف: آیت (۱۱۹)

(۲) سورۃ الشعراء: آیت (٤٦)

موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے رب پر ایمان لائے

قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۱)

اور کہنے لگے کہ ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ ''رب العالمین'' کا لفظ سن کر فرعون یہ سمجھا کہ یہ لوگ مجھے ''رب العالمین'' کہہ رہے ہیں۔ اور ''رب العالمین'' پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ مجھ پر ایمان لے آئے، اگلے جملے میں جادوگروں نے وضاحت کر دی کہ:

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ

یعنی ہم تو موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے۔ تم پر ایمان نہیں لائے، اب اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ جن جادوگروں کو میں نے مقابلہ کرنے کے لئے بلایا تھا وہ خود بھٹک گئے، چنانچہ فرعون نے جادوگروں سے کہا:

فرعون کی دھمکی

إِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَا أَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۲)

یعنی یہ تم سب کی ملی بھگت ہے، تم نے یہ سب تماشہ بنایا ہے اور اس کے

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۱۲۲-۱۲۱)

(۲) سورۃ الاعراف: آیت (۱۲۳)

نتیجے میں تم موسیٰ کے ساتھ بنی اسرائیل کو لیجانا چاہتے ہو۔ میری سلطنت تباہ کرنا چاہتے ہو، لہٰذا تم نے مجھے شکست دینے کے لیے یہ ڈرامہ رچایا، تو اب میں تمہیں سزا دوں گا:

لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ (۱)

پہلا کام تو یہ کروں گا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا، یعنی دایاں ہاتھ بایاں پاؤں، یا بایاں ہاتھ، دایاں پاؤں، پھر میں تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا۔

سزاؤں کے مختلف طریقے

سورۂ فجر میں فرعون کے بارے میں کہا کہ:

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ○ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ (۲)

یعنی فرعون لوگوں کو سولی پر اس طرح لٹکا تا تھا کہ ان کے ہاتھوں پر میخیں گاڑتا تھا اور کئی دن آدمی اس طرح رہتا اور پھر بعد میں یا تو اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا جاتا یا اور طریقے سے اس کو ختم کردیا جاتا۔ اسی طرح فرعون نے جو سزاؤں کے مختلف طریقے مقرّر کئے ہوئے تھے، جادوگروں کو ان کی دھمکی دی۔

---

(۱) سورۃ الأعراف: آیت (۱۲٤)

(۲) سورۃ الفجر: آیت (۱۱-۱۰)

دھمکی کے الفاظ

فرعون نے جوالفاظ کہے، ان میں زور کے ساتھ دھمکی دی اور کہا:

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ

اس میں لام تاکیداور نون تاکیدثقیلہ ہے، اب فرعون جواتنا بڑا طاقتور بادشاہ ہے اور جس کو چاہتا ہے، قتل کرادیتا ہے، جس کو چاہتا ہے، پھانسی چڑھا دیتا ہے، سولی چڑھا دیتا ہے، ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا ہے، وہ فرعون ان کو دھمکی دے رہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہ سلوک کروں گا۔

جوتمہیں کرنا ہے، کرگزرو

اب دیکھئے کہ وہ جادوگر جب آئے تھے تو اس وقت فرعون سے پوچھ رہے تھے کہ کیا اگر ہم غالب آگئے تو ہمیں اُجرت ملے گی؟ یعنی اگر اُجرت ملے گی تو کام کریں گے اور پیسوں کی خاطر یہ کام کرنے کے لئے آئے تھے۔ ان جادوگروں کے دل کی کائنات بدل گئی اور اب فرعون سے کہنے لگے کہ اچھا تم ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹو گے؟ اور ہمیں سولی پر چڑھاؤ گے، سن لو:

لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا
فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا [1]

تمہیں جو کرنا ہے، کرگزرو، ہاتھ پاؤں کاٹنا ہے، کاٹ لو، سولی پر چڑھانا

---

(۱) سورۃ طہ: آیت (۷۲)

ہے، چڑھالو، تم جو فیصلہ کروگے وہ اسی دنیا کی خاطر ہوگا، اب تو ہم نے کچھ اور ہی نظارہ دیکھ لیا ہے، اب ہمیں دنیا کی لالچ یا دنیا کا خوف مرعوب نہیں کرسکتا۔

ذراسی دیر میں کایا پلٹ گئی

اب ایک طرف تو جادوگروں نے یہ دعویٰ کردیا کہ ہمیں تمہاری سولی کی بھی پرواہ نہیں، ہاتھ پاؤں کاٹنے کی بھی پرواہ نہیں اور یہ کہا:

لَا ضَيْرَ إِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ (۱)

کچھ حرج نہیں، ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ دو، ہمیں سولی پر چڑھا دو، اس لئے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جائیں گے اور یہی ہماری عین خواہش ہے۔ وہ نظارہ جو آج ہم نے دیکھا، اس کے ذریعہ مالک الملک والملکوت کا دیدار نصیب ہوگیا اور حقیقت واضح ہوگئی، اب تم جو چاہو کرلو۔ ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

جادوگروں کی دُعا

اس وقت جادوگروں نے یہ دعا کی:

رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ (۲)

اے پروردگار! ہم پر صبر انڈیل دیجئے۔

---

(۱) سورۃ الشعراء: آیت (۵۰)

(۲) سورۃ الاعراف: آیت (۱۲۶)

اپنی آنکھوں سے فرعون کو سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں اور یہ کہ اس نے ہمارے بارے میں ہاتھ پاؤں کاٹنے اور سولی پر چڑھانے کا حکم دیدیا ہے اور ہم اس کے مقابلے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ ٹھیک ہے، جو تجھے کرنا ہے، کر گزر، لیکن اے اللہ! جب یہ کرنے پر آئے گا اس وقت ہمارے صبر کا دامن کہیں تار تار نہ ہوجائے، اس وقت کہیں ہم بھٹک نہ جائیں اور کہیں تکلیف کے وقت ہم صبر کا دامن چھوڑ بیٹھیں اور پھر کہیں گناہ کے اندر مبتلا نہ ہوجائیں۔

مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دیدے

اور آگے یہ بھی دُعا کی: "وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ" اور ہم نے مرنے کا ارادہ تو کرلیا ہے، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تکلیف کی شدت کی وجہ سے کوئی کلمہ ہمارے منہ سے ایسا نکل جائے جو کفر تک پہنچادے، اے اللہ! ہمیں وفات اس حالت میں دیجئے گا جب ہم مسلمان ہوں، تابعدار ہوں۔ یہ دُعا اس وقت مانگ رہے ہیں جب سولی سامنے ہے، ہاتھ پاؤں کٹنے کا حکم ہو چکا ہے اور جواب بھی ڈٹ کر دیدیا ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ سے صبر مانگ رہے ہیں کہ:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ [1]

اپنے حصے کا کام کر کے اللہ سے مانگو

یہ ہے بندے کا کام کہ بندہ اپنے حصے کا کام کرلے، پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے، چنانچہ ان جادوگروں نے اپنے حصے کا کام کرلیا، وہ یہ کہ فرعون کو جواب

(۱) سورۃ الاعراف: آیت ۱۲۶

دیدیا کہ جا، تجھ سے جو ہوسکے وہ کر گزر اور اس طرح انہوں نے "كلمة حق عندسلطان جائر" پر عمل کرتے ہوئے ایک حق کا کلمہ ظالم بادشاہ کے سامنے کہہ دیا کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں، اب تمہاری کوئی دھمکی، تمہارا کوئی لالچ ہمیں اس ایمان سے پھیر نہیں سکتا۔ تو اپنے حصے کا کام کر کے پھر اللہ تعالیٰ سے مانگا کہ یا اللہ! ہمیں صبر عطا فرمایئے، ثابت قدمی عطا فرمایئے اور تابعداری کی حالت میں ہماری موت آئے۔

شہید ہو کر واپس لوٹے

قرآنِ کریم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ لوگ جو جادوگر بن کر آئے تھے وہ "صدیقین" بن کر گئے، ان کا انجام کیا ہوا؟ آیا واقعی ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے؟ اور ان کو سولی پر چڑھایا گیا یا نہیں؟ لیکن بعض تابعین سے منقول ہے کہ فرعون نے فوراً اس پر عمل کروایا، اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور سولی پر چڑھایا اور ان کے بارے میں مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے کہ:

جَاؤُوْا سَحَرَةً فِي الضُّحٰى وَ رَجَعُوْا شُهَدَآءَ فِي الْمَسَآءِ[1]

یعنی صبح کے وقت جادوگر بن کر آئے تھے اور شام کے وقت شہید بن کر گئے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: تفسیر طبری ۱۰ / ۳٤٦ عن ابن عباس قال: كانوا في أول النهار سحرة وآخر النهار شهداء.

جبکہ بعض دوسرے حضرات [1] کا کہنا یہ ہے کہ جب انہوں نے عزیمت کا اتنا اعلیٰ مقام حاصل کر کے ڈٹ کر فرعون کے سامنے یہ بات کہہ دی تو فرعون مرعوب ہوگیا اور کہا کہ ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔ واللہ اعلم

وہ ثابت قدم رہے

لیکن قرآنِ کریم نے صرف اتنی بات ذکر کی ہے جو ہمارے اور آپ کے سبق لینے کی ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ ایک ظالم اور جابر انسان ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے اور دوسری طرف لالچ بھی دے رہا تھا کہ تم ہمارے مقرب بن جاؤ گے، لیکن ایمان کے بعد لالچ اور دھمکی کام نہ آئی اور وہ لوگ ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ سے صبر کی دُعا کی۔

مقابل کوئی بھی ہو، اللہ سے صبر مانگو

قرآنِ کریم جو واقعات بیان کرتا ہے ان سے محض تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں کہ محض قصہ کہانیاں بتلانا مقصود ہو، بلکہ ہر قصہ اور ہر واقعہ کے پیچھے کوئی سبق ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جادوگروں کا یہ واقعہ بیان فرمایا، اور یہ کہ انہوں نے یہ دُعا کی تھی کہ

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ

اس واقعہ سے یہ سبق دیا جارہا ہے کہ وہ فرعون بادشاہ تھا۔ اگر مقابل بادشاہ

---

(۱) تفسیر سمعانی ۳ / ۳۴۲

نہ ہو بلکہ مقابل نفسِ امّارہ ہو یا مقابل شیطان ہو اور وہ تمہارے دل میں برائی کی خواہش پیدا کررہا ہو، تمہارے دل میں مال کی محبت کے ذریعہ رشوت لینے کا جذبہ پیدا کررہا ہو یا مال کی محبت میں حرام کاروبار کا جذبہ پیدا کررہا ہو تو اس وقت بھی تم اللہ تعالیٰ سے صبر مانگو اور یہ کہو کہ:

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

اے اللہ! ہم پر صبر انڈیل دیجئے۔

اس طرح دعا کرو

یعنی اے اللہ! یہ شیطان اور یہ نفسِ امارہ فرعون کی شکل میں ہم پر چھائے ہوئے ہیں اور ہمیں گناہوں پر، برائیوں پر، حرام کاموں پر آمادہ کررہے ہیں تو اے اللہ! ہمیں ایسا صبر دیدیجئے کہ ہم ان کے سامنے ڈٹ جائیں کہ یہ ہمیں پھسلا نہ سکیں اور کسی طرح وہ ہمیں اپنے جال میں نہ پھنسالیں اور ہم ان کے چنگل سے نکل جائیں۔ اور جب ہماری موت کا وقت آئے تو فرمانبردار، تابعدار مسلمان بن کر ہم دنیا سے رخصت ہوں۔

شکریہ قبر تک پہنچانے والو، شکریہ

اب یہ بات کہ ہم کس حالت میں مریں؟ آج جبکہ ہم زندہ ہیں، ہماری صحت بھی ٹھیک ہے، الحمدللہ! تمام نعمتیں بھی میسر ہیں، الحمدللہ! اس حالت میں اپنی موت کا تصور ہی نہیں آتا کہ ہمیں کسی دن مرنا بھی ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کے جنازوں کو کندھا دیتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر میں

اُتارتے ہیں اور ہاتھوں سے مٹی جھاڑ کر اس طرح واپس آجاتے ہیں جیسے یہ معاملہ جانے کا صرف اس کے ساتھ ہی ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے، ارے یہ بھی سوچا کہ تمہارا بھی یہی انجام ہونے والا ہے، یا اس میں کوئی شک ہے؟ اور یہ سب تمہارے عزیز و اقارب، تمہارے رشتہ دار، تمہارے احباب تمہیں گڑھے میں ڈال کر واپس آجائیں گے، کسی نے خوب کہا ہے کہ ؎

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو! شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

کوئی تمہارا ساتھ دینے والا نہیں ہوگا، نہ کوئی خادم، نہ کوئی چپراسی، نہ کوئی اہلکار، بس تم ہوگے اور تمہاری قبر ہوگی اور قبر کے مناظر ہوں گے اور تمہیں تنِ تنہا بذاتِ خود ان تین سوالات کا جواب دینا ہوگا جو تم سے وہاں کئے جائیں گے۔

میدانِ حشر میں سوالات

میدانِ حشر میں پانچ سوالات ہوں گے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ خَمْسٍ: (۱)

---

(۱) سنن الترمذی ٤ / ٢١٦ (٢٤١٦) وقال: هذا حديث غريب لانعرفه الا من حديث ابن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم الا من حديث حسين بن قيس، وحسين بن قيس يضعف في الحديث من قبل حفظه و ٤ / ٢١٧ (٢٤١٧) من حديث أبي برزة الأسلمي رضي الله عنه، وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح.

فرمایا کہ قیامت کے دن ابن آدم کے قدم اپنے رب کے پاس سے نہیں ہلیں گے جب تک پانچ چیزوں کے بارے میں اس سے سوال نہ کرلیا جائے۔ "عن عمره فيما أفناه" بتاؤ: ہم نے تمہیں اتنی عمر دی تھی، تم نے وہ عمر کس چیز میں فنا کی؟

"وعن شبابه فيما أبلاه" ہم نے تمہیں جوانی دی تھی، اس کو کس چیز میں پرانا کیا؟ اور یہ مال تم نے کہاں سے کمایا تھا؟ اور یہ مال کہاں پر خرچ کیا تھا؟ ایک ایک پیسے کا حساب دو کہ حلال سے کمایا تھا یا حرام سے کمایا تھا؟ جب یہ سوالات ہوں گے اس وقت تم اکیلے ہوگے، تمہارا کوئی معاون نہیں ہوگا، تمہارا کوئی عزیز، قریب، دوست احباب، اولاد، کوئی نہیں ہوگا۔

میدانِ حشر کے سوالات کے جواب

لہٰذا یہ فکر رہنی چاہئے کہ ہمیں بھی مرنا ہے اور جب ہم مریں تو تابعدار ہو کر مریں اور جب اللہ تعالیٰ کے سامنے جائیں اور وہاں یہ سوالات ہوں تو یہ جواب دے سکیں کہ یا اللہ! آپ نے اپنے فضل وکرم سے حلال طریقے سے جو عطا کیا تھا، الحمدللہ! وہ ہم نے حاصل کیا اور جس طرح آپ نے حکم دیا تھا، اس طرح پر خرچ کیا، اور آپ نے ہمیں جو اتنی لمبی زندگی دی تھی اور اس زندگی میں آپ نے ہم پر جو فرائض عائد کئے تھے الحمدللہ! ان فرائض کو انجام دینے کی توفیق ہوگئی۔

آخرت کے امتحان کی تیاری کرو

بہرحال! وہ امتحان جس کا پرچہ آؤٹ ہوچکا ہے، اس امتحان کے لئے تم

نے کیا تیاری کی؟ انسان کو چاہئے کہ روزانہ اپنا یہ جائزہ لے اور اگر مسلمان ہے تو جائزہ لینے کے نتیجے میں دل اس طرف جائے گا کہ یااللہ! مجھے گناہوں سے بچالے اور مجھے ایسے اعمال کرنے کی توفیق عطا فرما جو آپ کو راضی کرنے والے ہوں اور پھر اس وقت آدمی اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرے کہ:

رَبَّنَآ أَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَتَوَفَّنَا مُسۡلِمِينَ

اے اللہ! ہمیں نفس وشیطان کے حملوں کے مقابلے میں صبر عطا فرما! اور موت اس حالت میں آئے کہ ہم آپ کے تابعدار ہوں۔ اس لئے تابعدار ہونے کی صورت میں قبر کے مراحل، میدانِ حشر کے مراحل سب آپ کے فضل وکرم سے آسان ہوجائیں گے۔ یہ چھوٹی سی دُعا ہے، لیکن اس میں سب کچھ آ گیا۔

صبر کے بدلے جنت کا غرفہ

اس لئے کہ صبر وہی چیز ہے جس کی بنیاد پر جنت ملے گی، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَٰٓئِكَ يُجۡزَوۡنَ ٱلۡغُرۡفَةَ بِمَا صَبَرُواْ (۱)

یعنی ان لوگوں کو جنت کے غرفے ملیں گے۔ کیوں ملیں گے؟ اس لئے کہ انہوں نے صبر کیا تھا۔ وہ صبر یہ تھا کہ ان کو ان کی نفسانی خواہشات دوسری طرف لے جارہی تھی، لیکن انہوں نے کہا کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر ان نفسانی خواہشات کو کچلیں گے اور ہم ان کی جگہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں گے اور

---

(۱) سورۃ الفرقان: آیت (۷۵)

اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخ رُو ہو کر جائیں گے۔

عقلمند کون؟

اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

الكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللهِ (1)

فرمایا کہ عقلمند شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنے قابو میں کرے، اپنی نفسانی خواہشات کو اپنے قابو میں کرے اور مرنے کے بعد والی زندگی کے لئے عمل کرے اور ''عاجز'' بندہ وہ ہے جس نے اپنے آپ کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگایا ہوا ہے، جو دل میں آتا ہے وہ کرتا جا رہا ہے، حلال اور حرام کی کوئی فکر نہیں ہے اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ حرام اور ناجائز کام کو چھوڑ و تو کہتا ہے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے، سب معاف کر دیں گے۔ اب اللہ تعالیٰ کا غفور و رحیم ہونا اپنے گناہوں کے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص ''عاجز'' ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی مذمت بیان فرمائی۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس دُعا کو ہم سب کے لئے قبول فرمالے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(1) سنن الترمذی ٤/٢٤٦ (٢٤٥٩) وقال: هذا حديث حسن.

دعا نمبر ١١

أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ

فہرستِ مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دعا نمبر (۱۱)

اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! مناجاتِ مقبول میں قرآنی دُعائیں ہیں، ان کی تشریح کا سلسلہ کئی دنوں سے چل رہا ہے۔ اگلی دُعا یہ ہے کہ:

اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ (۱)

اس دُعا میں بندہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ آپ میرے ''ولی'' ہیں، آپ میرے سرپرست ہیں، آپ میرے کارساز ہیں۔

دُعا شروع کرنے سے پہلے بندہ یہ کہہ رہا ہے کہ ''أَنْتَ وَلِیُّنَا'' جیسے کوئی نابالغ بچہ ہو تو اس بچے کا ایک ولی اور سرپرست ہوتا ہے جو اس بچے کی مصلحتوں کی نگرانی کرتا ہے، وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ بچے کو کس طرح پالنا چاہئے؟ کس طرح

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۱۵۵)

اس کی دیکھ بھال کرنی چاہئے، اللہ تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ ہماری نگرانی کررہے ہیں اور ہماری دیکھ بھال کررہے ہیں۔ ''أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا'' اور آپ ہمارے ولی ہیں تو آپ ہمیں معاف بھی کردیجئے۔ اور ہم پر رحمت بھی فرمایئے اور آپ سب سے بہتر معاف کرنے والے ہیں۔

یہ دعا کس نے مانگی؟

یہ اصل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واسطہ بنی اسرائیل جیسی قوم سے پڑا تھا جو کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہیں تھی، بلکہ ہر حکم میں اپنی مرضی کو دخل دیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کوہِ طور سے تورات لے کر واپس تشریف لائے، تورات کے احکام ہماری شریعت کے اعتبار سے ذرا سخت تھے، تو بنی اسرائیل کے لوگ اَکڑ گئے اور ایک موقع پر یہ کہہ دیا کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ کوہِ طور پر لیجائیں اور اللہ تعالیٰ کی آواز سنائیں اور خود اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کہیں کہ:

> یہ کتاب تورات تمہارے لئے اُتاری ہے، لہٰذا تم اس پر عمل کرو۔

ہمیں ''اللہ'' دِکھاؤ

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ستر (۷۰) افراد کا انتخاب کیا اور ان کو لے کر آپ کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور وہاں پر ان کو اللہ تعالیٰ کی آواز بھی سنادی گئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمارے پیغمبر ہیں اور ہم نے ان پر اپنی کتاب تورات

نازل کی ہے، تم اس کتاب کے احکام پر عمل کرو۔ اب آواز سننے کے بعد دوسرا مطالبہ کر دیا کہ:

أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً

یعنی ہمیں ''اللہ میاں'' دکھاؤ کہ وہ ہمیں صاف صاف، کھلم کھلا نظر آئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دیکھنے کی تاب نہ ہوئی اور طور پہاڑ اللہ تعالیٰ کی تجلی سے ہی جل گیا۔ لیکن بنی اسرائیل کا اصرار یہ تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ دکھاؤ۔

صاعقہ کا عذاب

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر ایک ''صاعقہ'' بھیجا گیا، یعنی ایک ''کڑک'' کی آواز ان پر بھیجی گئی اور اس آواز کے نتیجے میں وہ سب مر گئے۔ قرآنِ کریم میں فرمایا کہ:

فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ [1]

کہ صاعقہ نے ان کو آ پکڑا اور سب مر گئے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام بہت پریشان ہوئے کہ میں ان کو کوہِ طور پر لے کر آیا اور اللہ تعالیٰ کا کلام سنا دیا گیا، اب یہ مر گئے تو بنی اسرائیل کے لوگ یہ سمجھیں گے کہ میں نے ان کو کہیں لے جا کر کسی تدبیر سے مار دیا ہوگا۔ اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مذکورہ دُعا فرمائی کہ ''أَنْتَ وَلِيُّنَا'' آپ ہی تو ہمارے ''ولی'' ہیں، آپ ہی ہماری ساری مصلحتوں کو جاننے والے ہیں، ان لوگوں کی سرکشی کی وجہ سے اے اللہ! ہم

---

(۱) سورۃ النساء: آیت (۱۵۳)

پر کوئی عذاب نازل نہ فرمائیے اور ہمیں معاف فرما دیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے۔ اور آپ بہترین بخشش کرنے والے ہیں۔

دعا کرنے کا صحیح طریقہ

اس دُعا میں جو بات قابلِ ذکر ہے اور سیکھنے اور سمجھنے کی ہے، وہ یہ کہ دُعا مانگنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی ولایت کی یعنی ''ولی'' ہونے کی صفت ذکر کی اور فرمایا ''أنت ولیّنا'' آپ ہمارے ولی ہیں اور آپ یہ حاجت پوری فرمادیجئے کہ ہماری مغفرت بھی فرمائیے اور ہم پر رحم بھی فرمائیے۔ درحقیقت یہ دُعا کا صحیح طریقہ ہے اور سنت یہ ہے کہ جب بھی دُعا کی جائے تو اس دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد کی جائے۔ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دُعا کا طریقہ سکھایا، سورۂ فاتحہ میں اصل دُعا تو یہ ہے کہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ٥ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ

سورۂ فاتحہ کی پہلی چار آیات

اس دُعا سے پہلے کی چار آیات اللہ تبارک وتعالیٰ کی ''حمد'' پر مشتمل ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ،

اور یہ چار آیات حمد اور بندے کی اللہ تعالیٰ کے سامنے بندگی کا اظہار ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کی کہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

اور یہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے اور بزرگوں نے یہ فرمایا ہے کہ آدمی جب بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی دُعا مانگے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد کرے، اور اس کے بعد نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور پھر اپنی حاجت اور ضرورت مانگے۔

میدانِ حشر کا حال

یہ جو فرمایا کہ دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد اور تعریف کرے، یہ درحقیقت دعا کا ایک مقدمہ اور ایک زیور ہے، جو بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ حدیث شریف [۱] میں آتا ہے کہ میدانِ حشر میں جب لوگوں کا برا حال ہوگا، شدید گرمی ہوگی، سورج سوا نیزے پر آجائے گا اور لوگوں کے پسینے بہہ رہے ہوں گے، کسی کا پسینہ اس کے ٹخنوں تک ہوگا، کسی کا پسینہ گھٹنوں تک ہوگا، کسی کا اس سے زیادہ ہوگا اور اس وقت پریشانی کے عالم میں ہر شخص کی یہ خواہش ہوگی کہ یا اللہ! معاملہ آگے تو بڑھے اور حساب کتاب تو شروع ہو، ہمارے بارے میں کوئی تو فیصلہ ہو۔

---

(۱) صحیح البخاری ٦ / ٨٤ (٤٧١٢)

ہر نبی ''نفسی نفسی'' پکارے گا

اس موقع پر لوگ مختلف انبیاء کے پاس جائیں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ آپ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعا فرمائیں کہ ہم سے یہ پریشانی دور فرمادیں اور حساب وکتاب شروع ہوجائے، چنانچہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے، لیکن تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام لوگوں سے یہ کہیں گے کہ سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاؤ، اس لئے کہ ہر نبی یہ کہے گا کہ ''نَفْسِیْ، نَفْسِیْ'' مجھے اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی ہے، میں تو خود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوں۔

بہترین الفاظ سے حمد وثنا

آخر میں لوگ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے سفارش فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ پریشانی دور فرمادیں اور حساب وکتاب شروع ہوجائے۔ چنانچہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور سجدہ میں گرجائیں گے، اس وقت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

ثُمَّ يَفْتَحُ اللهُ عَلَيَّ مِنْ مَحَامِدِهِ وَ حُسْنِ الثَّنَآءِ عَلَيْهِ شَيْئًا، لَمْ يَفْتَحْهُ عَلٰى أَحَدٍ قَبْلِيْ

اللہ تعالیٰ اپنی حمد وثنا کے ایسے الفاظ میرے دل میں ڈالیں گے جو الفاظ اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کہے ہوں گے

اور اس حمد وثنا کا واسطہ دے کر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست پیش کروں گا۔

اب دیکھئے کہ وہاں آخرت میں بھی دُعا کی ضرورت ہوگی، اور آپ ''حمد وثنا'' کے بعد دُعا کریں گے۔

دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا

بہرحال! اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنے کا اچھا اور مسنون طریقہ اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے۔ اور اس میں بھی بظاہر یہ راز ہے۔واللہ اعلم۔کہ جب ہم اللہ تعالیٰ سے کوئی حاجت مانگتے ہیں کہ یااللہ! ہمیں روزی دیدے، یااللہ! ہمیں صحت دیدے، ہمیں عافیت دیدے۔ اللہ بچائے!۔ ان الفاظ میں تھوڑا سا شکوہ کا پہلو نکلتا ہے، وہ اس طرح کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی طرف نظر کریں تو باوجود اس تکلیف کے جس میں بندہ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگ رہا ہے، اس کے باوجود اس بندہ کا سارا جسم اور سارا وجود اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ آنکھیں سلامت ہیں، کان سلامت ہیں، زبان سلامت ہے، ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، دوسرے اعضاء سلامت ہیں، رزق وسعت کے ساتھ مل رہا ہے وغیرہ۔ لہٰذا وہ بندہ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے۔

دعا کے اندر شکوہ کا پہلو

اب اس وقت وہ بندہ یہ دُعا کر رہا ہے کہ یااللہ! مجھے صحت دیدیجئے۔ اس

دُعا کے اندر شکوہ کا یہ پہلو نکل سکتا تھا کہ آپ نے مجھے بیمار کر رکھا ہے، یا میرا رزق کم کر دیا ہے یا مجھے نوکری اور ملازمت نہیں مل رہی ہے وغیرہ۔ اور دُعا تو بہت اچھی چیز ہے، لیکن ''شکوہ'' بہت خراب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مانگنا بہت اچھی صفت ہے اور بہت مبارک چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ سے خوب مانگو، چاہے چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز ہو، ہر حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ اور مانگنے میں کبھی تکلف مت کرو، اور یہ بھی مت سوچو کہ یہ چھوٹی چیز ہے، یہ کیا اللہ تعالیٰ سے مانگوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ بری چیز ہے مثلاً یہ شکوہ کہ یااللہ! میں ایسا رہ گیا، میرے اندر یہ کمی رہ گئی، میں بیمار ہوگیا، مجھے بیماریوں نے کھالیا، مجھے یہ تکلیف ہے، مجھے یہ درد ہے، مجھے یہ پریشانی ہے، یہ شکوہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

یہ طریقہ سنت ہے

اللہ تعالیٰ نے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو سنت قرار دیا کہ جب بھی دُعا مانگنی ہو، پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرو، اس کی تعریف کرو، اس کی صفات کا تذکرہ کرکے اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یااللہ! ویسے تو آپ نے اتنی نعمتیں دے رکھی ہیں کہ ان کا کوئی حد و حساب نہیں۔ لیکن کمزور بندہ ہوں، مجھے صحت بھی عطا فرما دیجئے۔ لہٰذا جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں موجود ہیں ان پر پہلے حمد وثنا کرو اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کرو۔ یہ ہے بندگی اور دُعا مانگنے کا طریقہ۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے الفاظ

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اکثر وبیشتر دُعاؤں میں یہ نظر آئے گا کہ وہ

دعائیں اللہ تعالیٰ کی حمد سے شروع ہوتی ہیں، مثلاً یہ دعا کہ:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظَلَّتْ، وَرَبَّ الْاَرَضِيْنَ وَ مَا اَقَلَّتْ، وَ رَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَ مَا اَضَلَّتْ، كُنْ لِيْ جَارًا مِنْ شَرِّ خَلْقِكَ (۱)

لہذا دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان فرما رہے ہیں اور اس کے بعد اپنی حاجت کا ذکر فرما رہے ہیں۔

والد صاحب کے محبوب اُستاذ ''میاں صاحب''

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے اساتذہ سے بڑا محبت کا تعلق تھا۔ حضرت والد صاحب کو بعض اُمور میں بعض اساتذہ کرام سے اختلاف بھی ہوا۔ لیکن ان کا جب بھی تذکرہ فرماتے تو اتنی عظمت کے ساتھ تذکرہ فرماتے تھے کہ ہمیں حیرانی ہوتی تھی۔ اور سب سے محبوب اُستاذ مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کو ''حضرت میاں صاحب'' بھی کہا جاتا ہے اور والد صاحب نے ان کو ہر لحاظ سے اپنا مقتدا سمجھا ہوا تھا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کے بعد ان ہی کو اپنا بڑا بنایا ہوا تھا، لیکن ان کے ساتھ بے تکلفی بہت تھی۔

(۱) سنن الترمذی ۵ / ۴۹۶ (۳۵۲۳) وقال: هذا حديث ليس اسناده بالقوی، والمعجم الكبير للطبرانی ٤ / ١١٥ (٣٨٣٩) من حديث خالد بن الوليد رضی الله عنه. رواه الطبرانی فی الأوسط كما فی مجمع البحرين ٤ / ٢١٠ (٤٥٦٩) وقال الهيثمی فی ''مجمع الزوائد'' ١٠ / ١٧٥ (١٧٠٦٣) رواه الطبرانی فی الأوسط رجاله رجال الصحيح الا أن عبدالرحمن بن سابط لم يسمع من خالد بن الوليد، ورواه فی الكبير بسند ضعيف نحوه.

خیریت پوچھنے پر جواب

ایک مرتبہ حضرت والدصاحب کو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں پتہ چلا کہ آپ بیمار ہیں اور آپ کو بخار ہے، چنانچہ والدصاحب ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، جا کر پوچھا کہ حضرت! کیسے مزاج ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے بہت اچھا ہوں، الحمدللہ! میرا دل ٹھیک کام کر رہا ہے، الحمدللہ! میری زبان اور میرے کان ٹھیک کام کر رہے ہیں، میری آنکھیں، میرے ہاتھ پاؤں ٹھیک کام کر رہے ہیں، الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کا شکر، بہت اچھا ہوں۔ البتہ تھوڑا سا بخار ہو گیا ہے، دُعا کرو کہ وہ بھی ٹھیک ہو جائے۔ اب دیکھئے! کہ جو تکلیفیں نہیں تھیں ان کا ذکر کر کے ان کا شکر ادا کیا اور پھر جو ضرورت تھی وہ پیش کر دی کہ ذرا سا بخار ہے، دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو دور فرما دے۔

شکر گزار بندہ

سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سب سے بڑی صفت جو ذکر فرمائی، وہ یہ تھی کہ:

اِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا [(۱)]

یعنی وہ بڑا شکر گزار بندہ ہے۔

لہٰذا یہ ''شکر'' بڑی عظیم چیز ہے اور شکر ہی کا ایک حصہ ہے ''اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنا'' اور حمد کے بعد جو دُعا کی جائے گی وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوگی۔

---

(۱) سورة بنی اسرائیل آیت (۳)

دُعا سے پہلے حمد کرنا خوشامد تو نہیں

البتہ بعض حضرات کے ذہن میں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ دُعا سے پہلے ''حمد'' کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی خوشامد کرو اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگو اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان کے مناسب نہیں کہ پہلے اس کی تعریف کریں اور اس کی چاپلوسی کریں اور حمد وثنا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا دل خوش کریں، پھر اپنی حاجت پیش کریں؟

وہ ہماری حمد وثنا سے بے نیاز ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ذات ہماری حمد وثنا سے بے نیاز ہے، اگر دنیا کی ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا چھوڑ دے، تب بھی اس کی عظمت اور جلال میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ پھر یہ کیوں کہا جارہا ہے کہ دُعا سے پہلے حمد کرو۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک وجہ تو وہی ہے جو ابھی عرض کی، وہ یہ کہ تاکہ دعا کے اندر ناشکری اور شکوہ کا انداز نہ ہو، بلکہ دُعا کے اندر اپنی عاجزی اور بندگی کا اظہار ہو، اس لئے پہلے ''حمد'' کر کے شکوہ کا جو شائبہ ہے اس کو دور کیا جارہا ہے۔

عظیم انوار وبرکات والے کلمات

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی تعریف کے جو کلمات ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نہ اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی مزہ آتا ہے۔ وہ تو ہم جیسے انسان ہوتے ہیں جو تعریف سے خوش ہوجاتے ہیں اور تعریف

سے ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ کو نہ تو حوصلہ بڑھانے کی ضرورت ہے اور نہ دوسروں سے اپنی تعریف کرانے کی ضرورت ہے۔ وہ ذات تو ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ لیکن تعریف کے یہ کلمات، یعنی:

الحمدلله، سبحان الله، الله أكبر، لا إله إلا الله

یہ کلمات بذاتِ خود عظیم انوار و برکات کے کلمات ہیں۔

میزانِ عمل کو بھرنے والے کلمات

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تَملَأُ الْمِیْزَانَ (۱)

یعنی لفظ ''الحمد للہ'' میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے۔ اسی طرح ''سبحان اللہ'' میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے۔ حالانکہ بظاہر یہ بہت چھوٹے چھوٹے کلمات ہیں کہ ایک لمحہ میں زبان سے ادا ہوجاتے ہیں، لیکن ان کلمات کو جو انوار عطا ہوئے ہیں، ان کی خاصیت یہ ہے کہ جو انسان ان کلمات کو اپنی زبان سے نکالے گا، وہ کلمات اس انسان کے لئے انوار و برکات کھینچ کر لائیں گے جن کا ابھی ہمیں پتہ نہیں۔ ہمیں تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنا بتادیا کہ یہ کلمات آسمان اور زمین کے درمیان فضا کو بھر دیتے ہیں (۲)، لیکن کس طرح بھر دیتے ہیں؟ کیا ان کی کیفیت ہے؟ ابھی اس کے بارے میں ہمیں پتہ نہیں ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ۲۰۳ (۲۲۳)

(۲) حوالا بالا

تاکہ انوار و برکات حاصل کرلے

ان شاء اللہ وہاں جاکر پتہ چل جائے گا کہ ''الحمدللہ'' کیا چیز ہے؟ اور ''سبحان اللہ'' کیا چیز ہے؟ یہ کلمات جن انوار کی شکل میں ہمارے سامنے آئیں گے اس وقت پتہ چل جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ میرا بندہ دُعا کرنے سے پہلے ان انوار و برکات کو حاصل کرلے جو اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کے اندر پوشیدہ رکھے ہیں۔

جنت میں ''حقائقِ اشیاء'' کا انکشاف

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جنت کی نعمتوں میں ایک بہت بڑی نعمت یہ ہوگی کہ وہاں ''حقائقِ اشیاء'' منکشف ہوجائیں گی، وہاں پر یہ پتہ چل جائے گا کہ ''الحمدللہ'' کیا چیز تھی؟ ''سبحان اللہ'' کیا چیز تھی؟ اور جو اِن کلمات کا گلِ گلزار سامنے آجائے گا اور جو اِن کلمات کے انوار و برکات اور روشنیاں سامنے آجائیں گی، وہ جنت کی ''نعمتِ عظیمہ'' ہوں گی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ جب میرا بندہ دُعا مانگنے آئے تو دُعا مانگنے سے پہلے ان انوار وبرکات کا حامل بن جائے جو میں نے ان کلمات کے اندر رکھے ہیں۔ اس لئے دُعا سے پہلے وہ حمد کرے۔

''أَنْتَ وَلِيُّنَا'' کے الفاظ

اس لئے اس دُعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا سے پہلے فرمایا:

أنت ولیّنا

اے اللہ! آپ میرے کارساز ہیں۔ آپ میرے ولی ہیں اور میری ساری مصلحتوں کو جاننے والے اور مصلحتوں کو پیدا کرنے والے آپ ہیں، چونکہ آپ ہمارے ولی اور کارساز ہیں، اس لئے جو غلطی ہم سے ہوگئی ہے یا ہمارے میں سے بیوقوف لوگ باتیں کرتے ہیں، ان کی وجہ سے ہمیں ہلاک نہ کیجئے گا، بلکہ ہمیں معاف فرما اور ہم پر رحم فرما۔ آپ بہترین بخشنے والے ہیں۔

ان بیوقوفوں کی وجہ سے سب کو ہلاک نہ کریں

اس دُعا سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمارے بعض بے وقوف لوگوں نے یہ بات کہی ہے کہ ''ہمیں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا دِکھاوَ۔''

أَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ ٱلسُّفَهَآءُ مِنَّآ (١)

ان کی اس بیوقوفی کی وجہ سے ہم سب کو ہلاک نہ کیجئے۔ اس کے ذریعہ ہمیں یہ سبق دیا کہ کسی شخص یا کسی گروہ کی کوئی بے عملی سامنے آئے، کوئی بدعملی سامنے آئے، یا بدعقیدتی سامنے آئے تو اس وقت یہ دعا کرنی چاہئے کہ:

اَللّٰهُمَّ لَا تُهْلِكْنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا

بہرحال! یہ موسیٰ علیہ السلام کی دُعا ہے جسے یہاں ''مناجاتِ مقبول'' میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس تصور کے ساتھ یہ دُعا مانگنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ''ولی'' ہیں اور ''ولی'' ہمیشہ بندے کی مصلحت کو دیکھتے ہوئے کام کرتا ہے، لہٰذا ہماری مصلحت

---

(١) سورۃ الاعراف: آیت (١٥٥)

کے مطابق ہماری مغفرت فرمادیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے اور آپ بہترین بخشنے والے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی دُعا

اگلی دُعا بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی دعا ہے کہ:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ [1]

اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم لوگوں کا تختۂ مشق نہ بنائیے اور اپنی رحمت کے ذریعہ ہمیں کافر قوموں سے نجات عطا فرمائیے۔

جب موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مقابلہ ہو چکا، اس کے بعد جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، ان کو فرعون کی طرف سے بڑی بڑی دھمکیاں ملتی تھیں اور فرعون ان پر ظلم وستم ڈھاتا تھا، اس وقت ان ایمان لانے والوں نے یہ دُعا مانگی تھی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم لوگوں کا تختۂ مشق نہ بنائیے۔ ''فتنہ'' آزمائش کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں کے ظلم کی وجہ سے ہم آزمائش میں نہ پڑیں۔ ''آزمائش'' مانگنے کی چیز نہیں ہے، بلکہ ''آزمائش'' سے پناہ مانگنی چاہئے اور اپنی رحمت سے ہمیں کافروں سے نجات عطا فرمائیے۔

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۸۵-۸۶)

آج کل اس دعا کو کثرت سے مانگیں

یہ دُعا آدمی کو اس وقت مانگنی چاہئے جب اس پر غیر مسلموں کا، یا ظالموں کا غلبہ ہو، جیسے آج کل پوری اُمتِ مسلمہ اس میں گرفتار ہے، لہٰذا اس موقع پر پوری اُمت کے لئے یہ دُعا مانگنی چاہئے۔ اس کے علاوہ جب ہم زندگی کے کارزار میں اُترتے ہیں، اس وقت نفس وشیطان ہمیں گناہوں کی طرف لیجارہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کاموں کی طرف لیجارہے ہوتے ہیں اور یہ نفس وشیطان بھی قوم کافرین اور قوم ظالمین ہیں۔ ہمارا یہ ''نفسِ امّارہ'' بڑا ظالم ہے، بڑا کافر ہے، لہٰذا جب کبھی جی میں گناہ کا تقاضا پیدا ہواور جب کبھی گناہوں کی طرف طبیعت مائل ہونے لگے، اس وقت بھی یہ دُعا مانگنے کا موقع ہے کہ اے اللہ! ہمیں ''نفسِ امّارہ'' اور شیطان کے تسلط سے نجات عطا فرمادیجئے تاکہ ہم ان کے پیچھے نہ چلیں، بلکہ ہم آپ کے فرمانبردار بن کر زندگی گزاریں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں یہ دُعائیں مانگنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دعا نمبر ۱۲

رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ وَنَجِّنَا بِرَحۡمَتِكَ مِنَ الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ

فہرستِ مضامین

دعا نمبر ۱۲

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! گذشتہ چند دنوں سے "مناجاتِ مقبول" کی قرآنی دُعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے۔ آگے جو دُعا آئی ہے، وہ ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، وہ دُعا یہ ہے:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱)

اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم لوگوں کا تختۂ مشق نہ بنائیے، یعنی ظالم لوگ ہمیں آزمائش میں نہ ڈالیں۔ ظالم لوگ ہمارے ساتھ ظلم نہ کریں اور ان

(۱) سورۃ یونس: آیت (۸۵-۸۶)

کے لئے ہم تختۂ مشق نہ بن جائیں۔ اور اپنی رحمت کے ذریعہ ہمیں کافر قوموں سے نجات عطا فرمائیے۔

عصا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں نے یہ دُعا کی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہر مسلمان جانتا ہے، قرآنِ کریم میں بارہا اس کا ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت کا یہ عظیم معجزہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا زمین پر ڈالتے تھے وہ سانپ بن جاتا تھا، چنانچہ آپ کے مقابلے کے لئے فرعون نے اپنے سارے ملک کے جادوگروں کو جمع کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم جادوگر ہو اور میں بھی جادوگروں کو جمع کرتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ تمہارا جادو کہاں جاتا ہے؟

اور سارے سانپ ختم ہوگئے

چنانچہ جب سب جادوگر جمع ہوگئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم لوگ اپنا جادو پہلے دکھاؤ، چنانچہ وہ جادوگر جو لاٹھیاں اور رسیاں لے کر آئے تھے، وہ سب میدان میں جب پھینکیں تو وہ سب سانپ بن گئے اور چلنے شروع ہوگئے اور ان سینکڑوں سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی تھوڑا سا خوف طاری ہوگیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الہام فرمایا کہ تم اپنا عصا ڈالو، چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بھی بڑا سانپ بن گیا، اور جادوگروں کے سانپوں کو ایک ایک کر کے نگلنا شروع کر دیا، اس کے

نتیجے میں وہ سارے سانپ ختم ہو گئے، اب صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سانپ باقی رہا۔

یہ جادو نہیں ہوسکتا

جادوگروں نے جب یہ معاملہ دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ اگر یہ کوئی جادو ہوتا تو ہم سے زیادہ جادو کو جاننے والا کوئی نہیں۔ یہ جو کچھ کرشمہ ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے یہ جادو نہیں ہوسکتا، یقیناً یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کو پیغمبری کی نشانی دی گئی ہے، ورنہ یہ واقعہ اس طرح نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالی، اس کے نتیجے میں وہ سب جادوگر جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے آئے تھے اور جو مقابلہ کرنے سے پہلے فرعون سے اُجرت کا مطالبہ کر رہے تھے کہ:

إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ [1]

یعنی اگر موسیٰ پر غالب آگئے تو کیا ہمیں کوئی اَجر، کوئی انعام ملے گا؟ فرعون نے ان کے جواب میں کہا:

نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ [2]

ہاں! تمہیں انعام بھی ملے گا اور تمہیں اپنا مقرب بھی بنالیں گے۔

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۱۱۳)

(۲) سورۃ الاعراف: آیت (۱۱٤)

بادشاہ کا مقرب بننا بہت بڑی بات ہے، بادشاہ بھی وہ جو خدائی کا دعویٰ دار ہو۔

ہم ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے رب پر ایمان لائے

بہرحال! وہ جادوگر جو اتنے جوش وخروش سے آئے تھے اور فرعون سے انعام لینے کی تمنائیں لے کر آئے تھے، لیکن جب ان کی آنکھیں کھلیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھا تو سارے جادوگر سجدے میں گر گئے اور کہا کہ آج ہمارے سامنے حقیقت کھل گئی اور یہ کہا کہ:

اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى [1]

کہ ہم ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے رب پر ایمان لائے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا نام اس لئے لیا کہ اگر صرف اتنا کہتے کہ "اٰمنا باللّٰہ" یا "اٰمنا بربنا" تو فرعون کو یہ مغالطہ ہوسکتا تھا کہ یہ جادوگر میرے بارے میں کہہ رہے ہیں، اس لئے کہ وہ خود خدائی کا دعویدار تھا کہ میں خدا ہوں، میرے سوا کون خدا ہوسکتا ہے؟ اور یہ جادوگر مجھے سجدہ کررہے ہیں اور میرے اُوپر ایمان لانے کا اعلان کررہے ہیں۔ لیکن جادوگروں نے صاف کہہ دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے رب پر ایمان لائے ہیں، یعنی جس رب کی نشاندہی موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے کی ہے، اس رب پر ایمان لائے ہیں۔

---

(۱) سورۃ طٰہٰ: آیت (۷۰)

فرعون کی دھمکی

فرعون یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا کہ یہ جادوگر ابھی تو مجھ سے انعام کا مطالبہ کررہے تھے اور ابھی انہوں نے سجدہ کرلیا، اور موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو پیغمبر تسلیم کرلیا، اور میرا سارا کھیل بگاڑ دیا، چنانچہ فرعون نے یہ اعلان کردیا کہ:

لَاُقَطِّعَنَّ أَيۡدِيَكُمۡ وَأَرۡجُلَكُمۡ مِنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمۡ أَجۡمَعِيۡنَ (۱)

کہ تم نے میری اجازت کے بغیر یہ حرکت کی ہے، میں تم سب کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت کے ساتھ کاٹوں گا اور میں تم سب کو سولی چڑھاؤں گا اور دنیا تمہارا تماشہ دیکھے گی۔ یہ اعلان وہ فرعون کررہا ہے جو خدائی کا دعویدار ہے جس کے پاس زبردست فوج ہے۔

تم جو چاہو، کرلو

لیکن جب ایمان دل میں گھر کر جاتا ہے اور ایمان کی بشاشت اور اس کا نور دل میں داخل ہوجاتا ہے تو کسی ظالم کے ظلم کی انسان پرواہ نہیں کرتا، چنانچہ جادوگروں نے فرعون کے اس اعلان کا یہ جواب دیا کہ:

لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالَّذِىۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقۡضِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا (۲)

---

(۱) سورۃ طه: آیت (۷۲)

(۲) سورۃ الشعراء: آیت (۵۰)

کہ جس جادو پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، آج ہم پر اس کی حقیقت کھل گئی، اب تم جو فیصلہ کرنا چاہو، کرلو، اور جو تمہارا فیصلہ ہوگا، وہ صرف اس دنیا کے متعلق ہوگا، زیادہ سے زیادہ یہ کرلو گے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ دو گے اور ہمیں سولی پر چڑھادو گے۔

ہمیں کچھ پروانہیں

دوسری جگہ پر جادوگروں کے یہ الفاظ آئے ہیں:

قَالُوْا لَا ضَيْرَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ (۱)

اگر تم ہمیں سولی پر چڑھا بھی دو تو ہمیں کچھ پرواہ نہیں۔ ہم تو اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر چلے جائیں گے۔

آپ ذہن کا انقلاب اور خیال کا انقلاب دیکھئے، عقیدہ کا انقلاب دیکھئے کہ یا تو دنیا کی حرص تھی اور اُجرت کا مطالبہ کررہے تھے کہ:

اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (۲)

یا دنیا سے اتنی بے رغبتی اور اتنی بے پرواہی کہ یہ کہا جارہا ہے کہ:

فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ

تم جو چاہو، کرلو، ہمیں تو آخرت کا ثواب چاہئے۔

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۱۱۳)

(۲) سورۃ یونس: آیت (۸۳)

اللہ نے رُعب طاری کردیا

اب ان جادوگروں کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں، لیکن بہرحال! اس واقعہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت لوگوں پر واضح ہوگئی اور جب حقانیت واضح ہوگئی تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پوری قوم بنی اسرائیل کے سردار تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے دل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک رُعب پیدا کردیا، ورنہ اس کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا کیا مشکل تھا؟ بلکہ دونوں کو قتل کرادیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا رُعب طاری کردیا جس کی وجہ سے وہ قتل نہیں کرسکا۔

پورے بنی اسرائیل اسلام میں داخل

لیکن جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لارہے تھے، ان پر فرعون نے ظلم وستم ڈھانے شروع کردیئے۔ قرآنِ کریم نے اس کا ذکر فرمایا:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ [1]

شروع میں ایسا ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے بہت تھوڑے تھے، اس لئے کہ وہ لوگ ایمان لانے کے نتیجے میں فرعون سے ڈرتے تھے کہ کسی بھی وقت ہم پکڑ لئے جائیں گے اور ہمیں ظلم کا نشانہ بنایا جائے گا، لیکن بالآخر پورے بنی اسرائیل اسلام میں داخل ہوئے۔

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۸۷)

عبادت صرف مسجد میں

اب ان ایمان لانے والوں کی حالت یہ تھی کہ اگر وہ لوگ گھر سے باہر نکلتے تو فرعون کے سپاہی ان کا پیچھا کرتے اور ان کو تکلیفیں پہنچاتے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا کہ:

وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱)

یعنی تم اپنے گھروں کو قبلہ بنالو۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حکم یہ تھا کہ نماز اور عبادت صرف مسجد یا عبادت گاہ میں ادا کی جاسکتی تھی، اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر عبادت کرنے کی اجازت نہیں تھی، جبکہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی شریعت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ میرے لئے ساری زمین مسجد بنادی گئی ہے، یعنی جہاں کہیں بھی آدمی کو موقع ملے، آدمی اس جگہ نماز پڑھ لے، یہ ضروری نہیں کہ مسجد ہی میں جاکر نماز پڑھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حکم یہ تھا کہ عبادت کرنی ہے تو خاص مسجد میں جاکر عبادت کرو۔

اپنے گھروں کو قبلہ بنالو

یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے جو چالیس دن ''میدانِ تیہ'' میں گزارے،

---

(۱) سورة یونس آیت (۸۷)

(۲) صحیح البخاری ۱ / ۹۵ (٤۳۸)

اس میں بھی ان کے ساتھ ایک خیمہ عبادت کے لئے ساتھ ساتھ چلتا تھا، اور جس جگہ پڑاؤ ڈالتے، اس جگہ وہ خیمہ نصب کر دیا جاتا، وہ خیمہ مسجد کے قائم مقام ہوتا تھا اور وہ لوگ صرف اس خیمہ کے اندر عبادت کر سکتے تھے، اس سے باہر نہیں۔ اس لئے کہ ان کی شریعت میں اصل حکم یہی تھا کہ مسجد میں جا کر عبادت کرو۔ لیکن بنی اسرائیل کے لئے گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا تھا، ہر جگہ فرعون کے ہرکارے موجود تھے جو اُن پر ظلم وستم کرتے تھے، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو یہ حکم دیا کہ:

وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً

اپنے گھروں کو قبلہ بنالو۔

یعنی اپنے گھروں میں عبادت کرو اور گھروں کے اندر اپنے لئے ایک عبادت کی جگہ بنالو، وہاں پر عبادت کیا کرو، باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔

ہمیں ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنائیے

اب بنی اسرائیل اس حالت میں زندگی گزار رہے ہیں کہ ہر وقت فرعون کا خوف مسلط ہے، اور فرعون کے ظلم وستم کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتے اور فرعون نے ان کو غلامی کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے، اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے پیروکاروں نے یہ دُعا کی کہ:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ

مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ (۱)

اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالموں کا تختۂ مشق نہ بنایئے اور ہمیں ایسی آزمائش میں مبتلا مت کیجئے کہ جس کے ذریعہ ظالم قوم ہم پر غالب آجائے، اور ہم اس کے ظلم وستم کا شکار بنے رہیں اور ہمیں اپنی رحمت سے کافر لوگوں سے نجات عطا فرما۔

اللہ ہی سے مانگا جائے

دیکھئے! جب کسی دشمن سے مقابلہ ہوتا ہے تو اصل بات جو دنیا میں سمجھی جاتی ہے، وہ یہ کہ اس دشمن سے مقابلے کے لئے کچھ تدبیریں سوچی جائیں اور کچھ اسلحہ جمع کیا جائے اور لشکر تیار کیا جائے اور پھر اس لشکر کے ذریعہ میدانِ جنگ کے اندر مقابلہ کیا جائے۔ لیکن بنی اسرائیل فرعون کے ظلم کی وجہ سے ویسے ہی دبے ہوئے اور پسے ہوئے تھے، اس لئے مسئلہ یہ تھا کہ ہتھیار کہاں سے لائیں اور اتنی بڑی فوج کہاں سے لائیں؟ جس کے ذریعہ فرعون کے لشکر سے مقابلہ کرسکیں۔ اس لئے انہوں نے اس طریقہ کو اختیار کرنے کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگا جائے اور کہا کہ اے پروردگار! ہم اس حالت میں ہیں کہ ہم بے وسیلہ ہیں، ہم کچھ نہیں کرسکتے، ہمارے پاس اسباب نہیں ہیں، لہٰذا آپ ہمیں ان ظالموں کے لئے تختۂ مشق نہ بنایئے اور ہمیں ان ظالموں سے نجات عطا فرمایئے۔

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۸۵ - ۸۶)

اس دُعا کو وظیفہ بنالیا

اور ان لوگوں نے اس دُعا کو اپنا وظیفہ بنالیا کہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگ رہے ہیں کہ یااللہ! ہمیں اس مشکل سے نکال دیجئے، ہمیں ظالموں کے ظلم سے نجات عطا فرمادے، ہمیں کافر قوم سے نجات دیدے، اس دُعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور قدرت کا کرشمہ دکھایا، وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام راتوں رات پوری قوم کو لے کر مصر سے نکل گئے، جب فرعون کو پتہ چلا تو اس نے بھی اپنی فوج کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، چلتے چلتے سامنے دریا آگیا، اب دریا کیسے پار کریں؟ اس وقت بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ:

اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (۱)

کہ ہم دھرلئے گئے، پکڑلئے گئے، اس لئے کہ آگے دریا ہے اور پیچھے فرعون اور اس کا لشکر ہے، اور اب ہمارے پاس بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

بنی اسرائیل پار اُتر گئے

اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۲)

---

(۱) سورۃ الشعراء: آیت (٦١)

(۲) سورۃ الشعراء: آیت (٦٢)

ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا پروردگار ہے، وہ مجھے صحیح راستہ دکھائے گا۔

دریا بھی اس کے قبضہ میں ہے، زمین بھی اس کے قبضہ میں ہے، فرعون بھی اس کے قبضہ میں ہے اور فرعون کا لشکر بھی اس کے قبضہ میں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی عصا کے ذریعہ اپنا کرشمہ دکھایا کہ وہ عصا جو پہلے اژدہا بنا تھا، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اس عصا کو دریا پر ماریں، چنانچہ آپ نے عصا مارا، اس کے نتیجے میں دریا کے اندر بارہ خشک راستے بن گئے، اور ان راستوں کے ذریعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے دریا پار کر لئے۔

اور فرعون غرق ہو گیا

پیچھے سے فرعون اور اس کا لشکر بھی دریا پر پہنچ گیا اور وہ خشک راستے موجود تھے، فرعون نے جب ان خشک راستوں کو دیکھا تو اس نے سوچا کہ میں ان راستوں کے ذریعہ دریا پار کرلوں، چنانچہ فرعون اور اس کا لشکر بھی دریا کے بالکل بیچوں بیچ پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے دریا کو ملا دیا اور فرعون دریا کے اندر ڈوبنے لگا تو ڈوبتے وقت اس نے پکارا کہ:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ (۱)

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲)

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۹۰)

(۲) سورۃ یونس: آیت (۹۱)

اب تم ایمان لاتے ہو؟ جب کہ تم نے ساری زندگی نافرمانی میں گزاری اور فساد پھیلانے میں گزاری۔

فرعون کی لاش آج بھی عبرت کا نشان

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب عذاب آنکھوں کے سامنے آجائے، اس کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی، توبہ اس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک عذاب آنکھوں کے سامنے نہ آئے، اور جب تک موت کا وقت نہ آئے، لہٰذا اب تمہارا ایمان معتبر نہیں، البتہ تمہارے ساتھ اتنا معاملہ کریں گے کہ:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً [1]

یعنی آج ہم تمہارے بدن کو محفوظ رکھیں گے، تاکہ تم بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے عبرت کا نشان بن جاؤ۔

قرآنِ کریم کی آس آیت کی تفسیر میں مفسرین [2] فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش کو اس طرح محفوظ رکھا کہ وہ لاش دریا کے پانی میں اُوپر آگئی اور سب لوگوں نے اس کو دیکھا کہ یہ فرعون ہے اور جس کا اب یہ حشر ہوا ہے، اور ابھی ساٹھ ستر سال پہلے ''فرعون'' کی لاش مل گئی اور وہ ''قاہرہ'' کے عجائب گھر میں محفوظ ہے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ آج میں تمہارے بدن کو نجات دوں گا تاکہ تم بعد میں آنے والوں کے لئے عبرت بن جاؤ، آج بھی قاہرہ جا کر اس کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) سورۂ یونس: آیت (۹۲)

(۲) ملاحظہ فرمائیں: روح المعانی ۶ / ۱۷۳

اس دعا کے نتیجے میں نجات مل گئی

بہرحال! یہ دُعا معمولی چیز نہیں۔ اس وقت جبکہ کوئی وسیلہ نظر نہیں آرہا تھا، کوئی سبب نظر نہیں آرہا تھا، ہر طرح کے وسائل منقطع ہیں اور فرعون کا جبر اور ظلم جاری ہے، اس وقت اس دُعا کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے اپنا وظیفہ بنالیا کہ:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱)

اس دُعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور قدرت کا اتنا بڑا معجزہ دکھایا کہ فرعون کو ہلاک کردیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات عطا فرمادی۔

جب راستہ نظر نہ آئے تو رجوع الی اللہ کرو

قرآنِ کریم میں مختلف پیغمبروں کے جو واقعات اللہ تعالیٰ نے بار بار بیان فرمائے ہیں اور ان واقعات میں جو باتیں پیش آئیں، ان کی تفصیل اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں، یہ سب کچھ محض تاریخ بیان کرنے کے لئے اور قصہ کہانی بیان کرنے کے لئے نہیں بیان فرمارہے ہیں، بلکہ یہ سب اس لئے بیان فرمائے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ ہمیں سبق ملے۔ چنانچہ اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملا کہ جب انسان ظاہری اسباب کے اعتبار سے ہر طرح سے مجبور ہوجائے اور کوئی راستہ اس

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۸۵-۸۶)

کو نظر نہ آرہا ہو تو اس وقت واحد علاج یہ ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو، اور اس سے مانگو اور مانگتے رہو، مانگتے رہو اور مانگنے کو اپنا وظیفہ بنالو تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے راستہ کھول دیں گے۔

پورا عالمِ اسلام ابتلاء اور آزمائش میں

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ اس وقت پورا عالمِ اسلام تقریباً اسی آزمائش میں ہے، جس آزمائش میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی، اس وقت ان کے مقابلے میں فرعون تھا، ظلم کرنے والا وہ تھا، اور اس کے ظلم وستم میں بنی اسرائیل پسے ہوئے تھے اور کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ آج ہم اگر عالمِ اسلام کے حالات پر غور کریں اور دیکھیں کہ مصر میں کیا ہو رہا ہے؟ شام میں کیا ہو رہا ہے؟ لیبیا میں کیا ہو رہا ہے؟ افغانستان میں کیا ہو رہا ہے؟ کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟ فلسطین میں کیا ہو رہا ہے؟ سارا عالمِ اسلام اس عظیم فتنے میں مبتلا ہے، وہ اس طرح سے کہ جو کافر اور غیر مسلم طاقتیں ہیں چاہے وہ یہودیوں کی ہوں یا عیسائیوں کی ہوں یا دہریوں کی ہوں، سارے عالم پر ان کا غلبہ ہے اور وہ براہِ راست مسلمانوں پر ظلم کرنے کے بجائے ریاستوں سے اور ملکوں سے کھیل رہے ہیں۔

عالمِ اسلام کی حکومتیں ان کے اشاروں پر

ہمارے ہاں عالمِ اسلام میں جو حکومتیں قائم ہوتی ہیں، وہ انہی کے چشمِ ابرو پر آتی ہیں اور انہی کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں اور جو شخص ان کے مقاصد کے پورا

ہونے میں رکاوٹ بنتا ہے، اس کو نشانۂ عبرت بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، بہت سی جگہوں پر تو براہِ راست جنگ کے ذریعہ حملہ کرتے ہیں، جیسے فلسطین میں یہودی ہر وقت مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں اور کہیں دوسرے حربوں سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے، اقتصادیات اور مالیات میں مسلمانوں کو اپنا غلام بنایا ہوا ہے، کوئی ملک ان کی دسترس سے باہر نہیں ہے اور عالمِ اسلام میں بظاہر دیکھنے میں انتخابات ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان انتخابات کے پیچھے جو قوتیں کارفرما ہیں وہ ان ظالم قوموں کی ہیں۔ ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ امریکہ کے کہنے پر ہورہا ہے۔

ظاہر میں آزاد، حقیقت میں غلام

بظاہر ہم آزاد ہیں اور مسلمانوں کی ریاستیں بظاہر آزاد ہیں، وہ کسی کے زیرِ نگیں نہیں ہیں، لیکن حقیقت میں غلامی کا طوق ان کی گردنوں میں پڑا ہوا ہے، یا سیاسی غلامی کا طوق ہے یا اقتصادی غلامی کا طوق ہمارے گلے میں پڑا ہوا ہے اور ہم میں سے ہر شخص کروڑوں کا مقروض ہے اور اس سے نکلنے کا راستہ آسان معلوم نہیں ہوتا۔ اب بیچارے عوام کیا کریں؟ ان کو پتہ ہے کہ ہمارے ساتھ کیا کھلواڑ ہورہا ہے۔ ان کو پتہ ہے کہ یہ غیر ملکی طاقتیں ہم پر حکمران ہیں، افسوس یہ ہے کہ ہم ان حالات پر باتیں اور تبصرے تو بہت کرتے ہیں، اخبارات میں لوگوں کے تبصرے بھی آرہے ہیں، تقریریں بھی ہورہی ہیں اور لوگ افسوس کا اظہار بھی کررہے ہیں، لیکن کرنے کا جو اصل کام ہے، ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔

اصل کام کی طرف متوجہ ہو جاؤ

وہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ اپنے پروردگار کو پکارو کہ یااللہ! ہم اس مصیبت میں پھنس گئے ہیں، یااللہ! ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرمائیے:

رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ وَنَجِّنَا بِرَحۡمَتِكَ مِنَ الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ (۱)

اللہ میاں کو پکارو، جو اِن ساری طاقتوں سے بڑھ کر طاقتور ہے، اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ، اس کی نافرمانی چھوڑ دو، اس کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرو اور یہ دعا کرتے رہو اور اس دعا کو اپنا وظیفہ بناؤ، یہ دُعا ہر وقت تمہاری زبان پر چڑھی ہوئی ہو۔ جب بندہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی رحمت کے دروازے کھلتے ہیں۔

حرام کی نحوست، دُعا قبول نہ ہونا

آج ہم اور سب کچھ کرتے ہیں، لیکن اس طرح اپنے رب کو نہیں پکارتے جیسے پکارنا چاہئے اور جیسے اس کا وظیفہ بنانا چاہئے۔ اگر ہماری ملت کا ہر فرد اپنے اللہ کو پکارے اور نافرمانی چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلائے تو ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول نہ کرے۔ اگر قبولیت نہیں ہوتی تو اس کی وجہ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں بیان فرمائی ہے کہ:

بعض اوقات ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوتے

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۸۵ - ۸۶)

ہیں، ان کے کپڑے خراب، ان کے بال بکھرے ہوئے، عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ''یارب! یارب!'' پکار رہے ہیں، لیکن کھانا حرام، ان کا لباس حرام، کھانا حرام آمدنی کا، لباس حرام آمدنی کا ہے۔

فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ [1]

ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہوگی؟ ایک طرف وہ شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر کمر باندھے ہوئے ہے اور اس کو یہ بھی خیال نہیں کہ جو لقمہ میں اپنے پیٹ میں ڈال رہا ہوں وہ درحقیقت آگ کے انگارے ہیں۔

وہ آگ کے انگارے کھا رہے ہیں

إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتَامٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا [2]

جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں، وہ جو کچھ کھا رہے ہیں، وہ حقیقت میں آگ کے انگارے ہیں جو اِن کے پیٹ میں جا رہے ہیں۔

یہ صرف یتیموں کے مال کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جو شخص بھی گناہ کے ذریعہ مال کمائے مثلاً جھوٹ بول کر، دھوکہ دے کر کمائے، رشوت دے کر کمائے، رشوت لے کر کمائے، وہ سب آگ کے انگارے ہیں۔ اب آگ کے

---

(۱) صحیح مسلم ۲ / ۷۰۳ (۱۰۱۵)

(۲) سورۃ النساء: آیت (۱۰)

انگارے تو وہ خود اپنے پیٹ میں بھر رہا ہے اور پھر دُعا کر رہا ہے کہ یااللہ! مجھے ان ظالموں سے نجات دے دے۔ ظالم تو خود بنا ہوا ہے، پھر کیسے اس کو نجات ملے؟

کچھ بعید نہیں کہ یہ عذاب دور فرمادیں

لیکن جن لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان چیزوں سے محفوظ رکھا ہے یعنی وہ حرام خوری نہیں کرتے، بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حلال اور جائز طریقے سے ان کو دیا ہے، اس پر قناعت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی کثرت فرمائے، آمین، ان کا کام یہ ہے کہ وہ لوگ یہ دُعا کریں کہ:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۱)

اور وہ لوگ یہ دُعا مسلسل مانگتے رہیں تو پھر کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ عذاب دور فرمادیں۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، ان کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کی بستی میں قحط پڑ گیا، بارش بند ہوگئی اور قحط کی وجہ سے لوگ پریشان تھے، لوگوں نے جاکر حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! ساری قوم قحط کی وجہ سے پریشان ہے، کوئی ایسی تدبیر بتایئے کہ ہم اس قحط سے نجات پالیں اور پانی کی قلت ختم ہوجائے۔

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (۸۵-۸۶)

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس کا واحد علاج یہ ہے کہ میں اس بستی سے چلا جاؤں، اس لئے کہ جو عذاب آرہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرے گناہوں کی وجہ سے آرہا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے بڑے اولیاء اللہ کے سرتاج ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے، میرے گناہوں کی وجہ سے ہورہا ہے، جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو شاید اللہ تعالیٰ کو اس قوم پر رحم آجائے اور ان سے یہ عذاب دور ہوجائے۔

توبہ اور استغفار کرو

جب حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ یہ سمجھ رہے ہیں تو ہم میں سے ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے وہ میرے گناہوں اور خطاؤں کی وجہ سے ہورہا ہے۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرے، اور اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرے کہ:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (1)

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(1) سورة يونس: آيت (٨٥ - ٨٦)

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعا نمبر ۱۳

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! مناجاتِ مقبول کی اگلی دُعا یہ ہے کہ:

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱)

اس دُعا کا ترجمہ یہ ہے کہ:

اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! آپ ہی میرے کارساز ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دیجئے۔ اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا دیجئے۔

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۱۰۱)

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا ہے، آپ نے یہ دُعا کس موقع پر مانگی؟ یہ بڑا سبق آموز واقعہ ہے۔

قصۂ یوسف "احسن القصص"

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ آپ حضرات نے سنا ہوگا، اور قرآنِ کریم نے سورۂ یوسف میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس واقعہ کو "احسن القصص" قرار دیا گیا ہے، یعنی تاریخ کا بہترین واقعہ قرار دیا، یہ محض قصہ گوئی اور افسانہ طرازی کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس کے بیان کرنے کا مقصد سبق حاصل کرنا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر بچپن میں ان کے بھائیوں نے زیادتی کی، اس لئے زیادتی کی کہ ہمارے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے زیادہ محبت کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کو یوسف علیہ السلام پر حسد ہوگیا اور حسد کی آگ میں اس بری طرح جلے کہ آپس میں تمام بھائیوں نے یہ مشورہ کیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کردو، اور قتل کرنے کے نتیجے میں جب وہ دنیا سے رخصت ہوجائیں گے تو اس کے بعد ہمارے والد کی محبت خالص ہمارے لئے ہوجائے گی۔

اور حضرت یوسف علیہ السلام مصر پہنچ گئے

پھر انہی بھائیوں میں سے ایک نے یہ مشورہ دے دیا کہ ان کو قتل نہ کرو،

اس لئے کہ اگر قتل کروگے تو بہت بڑے جرم کا ارتکاب کروگے، قتل کا گناہ معاف ہونا مشکل ہے، لہٰذا قتل کرنے کے بجائے ان کو کسی اندھے کنویں میں لے جاکر ڈال دو، پھر کوئی قافلہ ان کو اٹھاکر لے جائے گا اور اس کے نتیجے میں وہ والد صاحب سے دور ہوجائیں گے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ انہوں نے کنویں میں ڈالا اور ایک قافلہ آیا اور قافلہ کے ایک شخص نے کنویں سے پانی نکالنے کے لئے ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے وہ ڈول پکڑلیا، اور جب اس شخص نے ڈول کھینچا تو اس کو لڑکا نظر آیا، چنانچہ قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنا غلام بنالیا اور مصر لاکر اُنہیں فروخت کردیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت

عزیزِ مصر نے ان کو خرید لیا اور اس نے کہا کہ ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں گے، جب بڑے ہوئے تو عزیزِ مصر کی اہلیہ زُلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس آزمائش سے نکالا، وہ عورت جو اپنے آقا کی بیوی ہے، صاحبِ منصب اور صاحبِ جمال عورت تھی، وہ اپنی طرف گناہ کی دعوت دے رہی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام جو بھرپور جوانی کے عالم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا حسن وجمال عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس آزمائش میں سے اس طرح نکالا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ زُلیخا نے چاروں طرف کے دروازوں پر تالے ڈال دیئے ہیں تاکہ یہ باہر نہ نکل سکیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں خیال آنا

جب زُلیخا نے گناہ کا ارادہ کیا تو حضرت یوسف علیہ السلام باوجودیکہ انسان تھے اور نوجوان تھے اور تنہائی کا موقع تھا، اس کے لئے قرآنِ کریم میں یہ الفاظ آئے ہیں:

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَّأٰى بُرْهَانَ رَبِّهِ (۱)

یعنی زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ گناہ کرنے کا ارادہ تو کر ہی لیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی کچھ خیال آنے لگا تھا، اس لئے کہ بشر تھے، انسان تھے، نوجوان تھے، خلوت تھی اور دعوت دی جارہی تھی، اس موقع پر ان کے دل میں بھی کچھ خیال آنے لگا تھا، جیسے ایک وسوسہ ہوتا ہے۔

جیسے روزے میں ٹھنڈے پانی کا خیال

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال آیا، وہ خیال ایسا تھا جیسے کوئی روزہ دار ہو، اور گرمی کا روزہ ہو، اور حلق میں کانٹے پڑ رہے ہوں، اس وقت کوئی شخص ٹھنڈے پانی کا گلاس لاکر روزہ دار کو دکھائے تو اس وقت روزہ دار کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ یہ پانی بہت اچھا ہے، اور مجھے پیاس لگی ہوئی ہے، حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں، یہ ٹھنڈا پانی میرے لئے کتنا اچھا ہے؟ یہ خیال اس کو آئے گا، لیکن وہ شخص روزہ نہیں توڑے گا اور نہ ہی روزہ توڑنے کا خیال آئے گا۔

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۲٤)

بالکل یہی معاملہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہوا کہ ان کے دل میں بھی گناہ کا خیال آیا، لیکن وہ خیال ایسا تھا جیسے روزہ دار کو ٹھنڈا پانی دیکھ کر دل میں خیال ہوسکتا ہے۔

اور دروازے کھل گئے

لَوْلَا أَنْ رَأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ

خیال تو آتا، لیکن اگر اپنے پروردگار کی نشانی نہ دیکھ لی ہوتی تو ۔اللہ بچائے۔ گناہ میں مبتلا ہوسکتے تھے، لیکن اس موقع پر جبکہ گناہ کرنے کے اتنے داعیے اور اتنے محرکات موجود ہیں۔ اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے دو کام کئے۔ ایک کام تو یہ کیا کہ اپنے رب کو پکارا اور دُعا کی کہ یااللہ! میں بڑی سخت آزمائش کے اندر مبتلا ہوگیا ہوں۔ اے اللہ! مجھے آپ ہی اس آزمائش سے نکال دیجئے۔ اور دوسرا کام یہ کیا کہ دروازے کی طرف بھاگے، حالانکہ اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ زلیخا نے دروازوں پر تالے ڈال دیئے ہیں اور وہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہے، لیکن یہ سوچا کہ میرے بس میں جتنا کام ہے، میں اتنا کام تو کرلوں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حوالے۔ چنانچہ آپ اس جگہ سے دروازے کی طرف بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے دروازے کھول دیئے۔

گناہ سے بچنے کے لئے دو کام

اس کے ذریعہ یہ سبق دیا جارہا ہے کہ جب بھی تمہارے دل میں کسی گناہ کا داعیہ پیدا ہو اور گناہ کے مواقع آجائیں اور اس وقت تمہارے دل میں بھی کچھ

خواہشات پیدا ہونے لگیں اور گناہ کرنے کے لئے دل مچلنے لگے اور تم اپنے آپ کو مجبور سمجھنے لگو تو اس وقت تمہارا کام بھی وہی ہونا چاہئے جو کام حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا، وہ کیا؟ وہ یہ کہ ایک طرف تم اللہ تعالیٰ کو پکارو اور کہو: یااللہ! میں اس آزمائش میں مبتلا ہوگیا ہوں، میرا دل، میرا دماغ، میری خواہشات، میرا نفس مجھے گناہ کی طرف دعوت دے رہا ہے اور میں ایسے ماحول میں ہوں کہ اس ماحول میں مجھے بچنا مشکل نظر آرہا ہے، لیکن اے اللہ! آپ کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں، مجھے اس گناہ سے بچالیجئے۔

اور دوسرے یہ کہ اس گناہ سے بچنے کے لئے جتنا کام اپنے بس میں ہو، وہ ضرور کردے۔ یہ دو کام کرے۔ ایک یہ قدم آگے بڑھائے اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے مانگے تو پھر اللہ تعالیٰ دروازے کھول دیں گے۔

اس جگہ سے دُور ہوجاؤ

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ مثنوی شریف میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

کہ اگرچہ آنکھوں کے سامنے تمہیں کوئی رخنہ اور کوئی بھاگنے کا راستہ نظر نہیں آرہا، ان گناہوں سے، ان معصیتوں سے، ان ظلمتوں سے جو سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہیں، اگرچہ ان سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے کہ میں کہاں سے نکلوں؟ کم از کم تم اس وقت اتنا عمل کرو جتنا یوسف علیہ السلام نے کیا تھا کہ وہاں

سے بھاگ پڑو اور وہاں سے نکل جاؤ اور جب تم اپنے حصے کا کام کروگے تو اللہ تعالیٰ اپنے حصے کا کام کرے گا۔

غیبت کرنے والے کو ٹوک دو

دیکھو! آج کل جب گھر میں مجلسیں ہوتی ہیں یا دوستوں اور احباب کے ساتھ مجلس ہو رہی ہے تو اس مجلس میں کسی کی غیبت شروع ہوگئی، اب ایک انسان خود غیبت نہیں کر رہا ہے، لیکن غیبت سن رہا ہے اور جس طرح غیبت کرنا گناہ ہے، اسی طرح غیبت سننا بھی گناہ ہے، لہٰذا اگر کسی مجلس میں غیبت شروع ہو جائے تو انسان کو پہلا کام یہ کرنا چاہئے کہ غیبت کرنے والے کو روکے کہ بھائی یہ غیبت والی بات نہ کریں، یا پھر بات کا موضوع بدل دے، تا کہ غیبت کا دروازہ بند ہو۔

اس مجلس سے اُٹھ کر چلے جاؤ

لیکن اگر انسان ایسا نہ کر سکے اور اس پر قدرت نہ ہو تو پھر اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ شخص اس مجلس سے اُٹھ جائے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تم کسی ایسی مجلس میں ہو، جہاں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کی جارہی ہو یا استہزاء کیا جارہا ہو تو:

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ [1]

---

(۱) سورۃالنساء: آیت (۱۴۰)

تم ان کے ساتھ مت بیٹھو، جب تک کہ وہ دوسرے موضوع میں مشغول نہ ہوجائیں۔

مجلسِ غیبت سے بچو

بالکل اسی طرح جب کسی مجلس میں غیبت ہورہی ہوتی ہے تو اس وقت مجلس گرم ہوتی ہے، آدمی کا دل چاہتا ہے کہ میں ابھی اس مجلس کے اندر مزید بیٹھوں، اس لئے کہ وہ دوستوں کی، عزیزوں کی اور احباب کی مجلس ہے، لیکن اس مجلس میں غیبت ہورہی ہے اور موضوع بدلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کا طریقہ اختیار کرو، یعنی اس جگہ سے ہٹ جاؤ، تاکہ تم اس غیبت کے گناہ میں شامل نہ ہو، ۔اللہ تعالیٰ بچائے۔ یہ غیبت ایسی مصیبت ہے کہ آج کل شاید ہی کوئی مجلس اس سے خالی ہوگی۔ لیکن راستہ یہی ہے کہ آدمی دُعا کرے کہ یااللہ! میں اس مجلس میں پھنس گیا ہوں، مجھے اس سے بچالے، اور اپنے حصے کا کام کرے کہ اس مجلس سے اُٹھ کر چلا جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ سبق ہمیں دیا۔

ہمارے لئے دروازہ کھول دیا

یہ آزمائش کوئی معمولی آزمائش نہیں تھی، جو حضرت یوسف علیہ السلام کو پیش آئی، بہت سنگین آزمائش تھی اور اس آزمائش میں حضرت یوسف علیہ السلام نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس نے ہمارے لئے دروازہ کھول دیا کہ جب بھی گناہ کا کوئی موقع آئے یا جب بھی گناہ کی خواہش دل میں پیدا ہو اور گناہ کے لئے دل مچلے تو اس

وقت یہ دو کام کرو، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو پکارو، دوسرے یہ کہ اس جگہ سے بھاگنا جتنا ہمارے بس میں ہے، اتنی دور بھاگ جاؤ۔

بارش ہوئی اور برتن بھر گئے

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ سن ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی لڑی گئی، جس میں مسلمانوں نے انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے جنگ لڑی، اس جنگ میں چاروں طرف انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں کا قتلِ عام ہورہا تھا اور گھر سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا، گھر سے باہر نکلتے تو موت سامنے تھی، تو ایک عالم اپنے گھر کے اندر محصور ہوگئے، گھر کے اندر کھانا ختم ہوگیا، پانی ختم ہوگیا، فاقے ہونے لگے، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آگیا کہ فاقوں کی وجہ سے اتنے کمزور ہوگئے کہ صرف ہڈی اور چمڑا رہ گیا اور گھر میں تنہا تھے، باقی تمام افراد شہید ہوچکے تھے اور پیاس کی شدت کی وجہ سے جان نکلنے کے قریب تھی، ان کے پاس ایک پیالہ تھا، اس پیالہ کو آہستہ آہستہ سرکا کر گھر کے صحن تک لائے اور صحن میں کھلے آسمان کے نیچے وہ پیالہ رکھ دیا اور پھر دُعا کہ یااللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ یہ پیالہ لاکر صحن میں رکھ دوں، بارش برسانا آپ کا کام ہے، اپنی رحمت سے ایسی بارش کردے کہ میرا پیالہ بھرجائے اور میں پانی پی لوں، اللہ تعالیٰ نے اس بندہ کی دُعا سن لی، اور اچانک بادل آتے ہیں، بارش برستی ہے اور نہ صرف وہ پیالہ بلکہ اور بھی جتنے برتن تھے، وہ سب پانی سے بھر گئے۔

ایک خان صاحب کا واقعہ

میں نے آپ کو حضرت شاہ مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ پہلے بھی سنایا تھا کہ ایک خان صاحب تھے، جو بستی میں رہتے تھے، نماز نہیں پڑھتے تھے، مولانا صاحب نے بستی والوں کو نماز کی دعوت دی، بستی والوں نے کہا کہ ''خان صاحب'' بستی کے بڑے ہیں، اگر وہ نماز شروع کر دیں گے تو بستی کے سب لوگ نماز شروع کر دیں گے، جناب مولانا صاحب ''خان صاحب'' کے پاس گئے اور ان کو نماز کی ترغیب دی کہ تم نماز پڑھا کرو اور تمہاری وجہ سے پوری بستی کے لوگ نمازی بن جائیں گے۔ ''خان صاحب'' نے کہا کہ نماز تو میں پڑھ لوں، لیکن مجھ سے وضو نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم بے وضو ہی پڑھ لیا کرو، اب سب لوگ حیران ہوئے کہ مولانا صاحب نے ان کو بے وضو نماز پڑھنے کے لئے کیسے کہہ دیا؟ لیکن جب وہاں سے واپس آئے تو مسجد میں گئے اور نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر سجدے میں گر گئے اور سجدے میں جا کر خوب روئے اور کہا کہ:

> یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ میں اس سے یہ وعدہ لے لوں کہ وہ نماز پڑھے، چاہے بے وضو پڑھے، اب وضو کرانا آپ کا کام ہے، آپ ہی اس سے وضو کرا دیجئے۔

غسل کر کے نماز پڑھی

جب ظہر کا وقت آیا تو خان صاحب کو وہ وعدہ یاد آیا کہ میں نے مولانا سے وعدہ کیا تھا کہ میں نماز پڑھوں گا، لہٰذا میں جا کر نماز پڑھتا ہوں، ساتھ ہی دل میں یہ خیال آیا کہ خدا کے بندے! پہلی مرتبہ تو نماز پڑھنے جا رہا ہے، آج

وضو کیا، بلکہ غسل کر کے نماز پڑھنی چاہئے۔ چنانچہ خان صاحب نے غسل کیا، کپڑے تبدیل کئے اور مسجد میں نماز کے لئے چلے گئے اور پوری نماز اطمینان سے ادا کی اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کا دِل بدل دیا۔ اور پکے نمازی بن گئے۔ بہرحال! انسان اپنے حصے کا کام کرلے اور پھر اللہ کے حوالے کردے اور کہے:

وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْ إِلَى اللهِ إِنَّ اللهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ [1]

یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام نے عمل کر کے ہمیں سکھادی۔

اپنے حصے کا کام صحیح رُخ پر کرو

لہٰذا ہمارے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں بہت بڑا عظیم سبق تو یہ ہے کہ پہلے اپنے حصہ کا کام کرو اور پھر اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو۔ جو شخص دین کی طرف نہیں چل رہا ہے وہ تھوڑا سا قدم بڑھائے اور اللہ تعالیٰ سے مانگے اور یہ کہے کہ: یااللہ! اتنا میں نے کرلیا، آگے آپ کرادیجئے۔ پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دُعا کو رد فرمادیں۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ایک آدمی مشرق کی طرف چل پڑا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعا کررہا ہے کہ یااللہ! مجھے مغرب میں پہنچادے۔ لیکن ایک شخص مغرب کی طرف ایک قدم بڑھائے، دوقدم بڑھائے اور جتنا اس کے بس میں ہے، اتنا چلے، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یااللہ! مجھے منزل تک پہنچادے، تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے پہنچادیں گے۔

---

(۱) سورۃ غافر: آیت (٤٤)

آج کی دنیا اور گناہوں کے تقاضے

آج کی دنیا میں ہمارے سامنے گناہوں کے اتنے تقاضے آتے ہیں تو آدمی اس وقت یہ سوچتا ہے کہ یااللہ! میں اس سارے ماحول میں کس طرح ان گناہوں سے بچوں گا؟ بس اس وقت یہ نکتہ یاد رکھو، وہ یہ کہ پہلے اپنے حصے کا کام کرلو اور پھر اللہ تعالیٰ کو پکارو، پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کس طرح گناہوں سے بچاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بہرحال! حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ایک نکتہ تو یہ تھا۔

نیکی اختیار کرنے کی صورت میں آزمائش

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پرہیزگاری اختیار کرنے اور گناہ سے بچنے کا صلہ یہ ملا کہ ان کو زُلیخا نے قیدخانہ میں ڈلوادیا اور آپ کئی سال قیدخانہ میں مقیّد رہے۔ اس سے یہ سبق مل رہا ہے کہ بعض اوقات انسان کو نیکی اختیار کرنے اور گناہ سے بچنے کے نتیجے میں دنیا کے اندر کچھ مسائل پیش آتے ہیں اور وہ بھی ایک آزمائش ہوتی ہے کہ آیا وہ اس آزمائش کو بھی برداشت کرے گا نہیں؟ زلیخا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ [1]

اگر یہ میری بات نہیں مانیں گے تو انہیں قید کر دیا جائے گا اور دنیا میں ان کو ذلت اُٹھانی پڑے گی۔

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۳۲)

قید خانہ میں خوابوں کی تعبیر بتانا

جواب میں حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلام نے یہ دعا کی:

رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ [1]

اے پروردگار! جس گناہ کی طرف یہ عورتیں مجھے دعوت دے رہی ہیں، اس کے مقابلے میں مجھے قید ہوجانا زیادہ پسند ہے۔

بہرحال! آپ پر قید والی آزمائش آئی۔ قید کے دوران دو قیدی اور لائے گئے، ان دونوں قیدیوں نے خواب دیکھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلام کو خواب کی تعبیر کا خاص علم عطا فرمایا تھا، چنانچہ ان دونوں قیدیوں نے حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلام سے اپنے اپنے خوابوں کو بیان کرکے آپ سے ان کی تعبیر پوچھی۔

تعبیر بتانے سے اسلام کی دعوت

لیکن خوابوں کی تعبیر بتانے سے پہلے ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور آپ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے خواب کی تعبیر کا علم عطا فرمایا ہے اور میں تمہیں یہ بھی بتاسکتا ہوں کہ جوتم کھاتے ہو، اور جو کچھ تم ذخیرہ کرتے ہو۔ اور میں تمہیں خواب کی تعبیر بعد میں بتاؤں گا، پہلے میری ایک بات سن لو، وہ یہ کہ یہ بتاؤ:

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۳۳)

أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ [1]

کہ اللہ کے علاوہ جن مختلف معبودوں کی عبادت کی جاتی ہے، وہ بہتر ہیں یا وہ اللہ جو واحد اور قہار ہے، وہ بہتر ہے؟

اور پھر فرمایا:

إِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ [2]

میں ان لوگوں کی ملت کو چھوڑ چکا ہوں جو تنہا اللہ پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ شرک کرتے ہیں اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔

یہ سب بیان کر کے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی اور اس کے بعد ان دونوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بھی بتادی۔

بادشاہ کا خواب دیکھنا

اس تعبیر کے نتیجے میں ان میں سے ایک شخص کو قید سے رہائی مل گئی اور وہ دوبارہ بادشاہ کے دربار میں شراب پلانے پر مامور ہوگیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور دربار کے لوگوں سے کہا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے، کیا تم میں سے کوئی شخص ہے جو اس خواب کی تعبیر بیان کر سکے؟ سب درباریوں نے کہا: یہ خواب نہیں بلکہ پریشان خیالات ہیں، اور ہم خواب کی تعبیر کا علم بھی نہیں

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۳۹)

(۲) سورۃ یوسف: آیت (۳۷)

رکھتے، اب وہ قیدی جو جیل سے رہا ہوکر دوبارہ بادشاہ کے دربار میں شراب پلانے پر مامور ہوگیا تھا، اس کے ذہن میں فوراً حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کی یاد آگئی اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ یوسف نام کے ایک قیدی ہیں جو بہت دنوں سے قید میں پڑے ہوئے ہیں وہ خواب کی تعبیر بہت اچھی بتاتے ہیں، مجھے ان کے پاس بھیج دو، چنانچہ بادشاہ نے اس کو حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کے پاس بھیج دیا۔

بادشاہ کے خواب کی تعبیر

چنانچہ وہ شخص قید خانے میں حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کے پاس پہنچ گیا اور جا کر بتایا کہ بادشاہ نے یہ خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی موٹی گائیں ہیں، ان کو سات دُبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں، دوسرا خواب یہ دیکھا کہ سات خوشے ہرے بھرے ہیں اور سات خوشے خشک ہیں۔ حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام نے ان خوابوں کی یہ تعبیر دی کہ تمہارے اُوپر شروع میں سات سال تک خوشحالی آئے گی اور اس کے بعد سات سال قحط پڑے گا اور پھر سات سال کے بعد دوبارہ خوشحالی آئے گی۔

تعبیر سے پہلے تدبیر

لیکن حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام نے تعبیر بتانے سے پہلے اس قحط سے بچنے کا طریقہ بھی بتادیا کہ ایسا کرو کہ تم لوگ سات سال خوب محنت سے کاشتکاری کرو، تاکہ تمہاری زرعی پیداوار گندم بہت زیادہ پیدا ہوجائے اور ان سات سالوں میں جو پیداوار ہو اس میں سے ضرورت کے مطابق تھوڑا بہت استعمال کرلو اور باقی گندم کو ان کے بالوں میں ہی ذخیرہ کرکے رکھ دو اور سات سال کے بعد جو قحط

والے سات سال آئیں گے، اس وقت وہ ذخیرہ کیا ہوا گندم کام آئے گا، اس کے بعد پھر دوبارہ خوشحالی کا سال آجائے گا۔ اب دیکھئے! تعبیر بعد میں بیان فرمائی، اس کا حل پہلے بتادیا کہ اس کا یہ حل ہے۔

مسئلہ بیان کرنے کے بعد اس کا حل بتاؤ

اس کے ذریعہ ہم جیسے لوگوں کو، یعنی جن سے لوگ دینی مسائل پوچھتے رہتے ہیں، یہ سبق دیا کہ جب تم لوگوں کو یہ بتاؤ کہ یہ کام حرام ہے یا یہ کام ناجائز ہے یا گناہ ہے تو اس سے بچ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کی تدبیر بھی بتاؤ کہ اگر تم اس گناہ سے بچنا چاہتے ہو تو یوں کرلو۔ چنانچہ تعبیر پوچھنے والے شخص نے واپس آکر بادشاہ کو تعبیر بتادی تو بادشاہ کی سمجھ میں بات آگئی اور اس نے کہا کہ تعبیر بتانے والے نے تو بہت زبردست تعبیر بتائی ہے، بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کو قیدخانہ سے نکال کر میرے پاس لے آؤ۔

بادشاہ سے ملاقات اور وزیرِ خزانہ کا عہدہ

چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ کے پاس آگئے، بادشاہ نے ان سے کہا کہ میں تمہیں اپنا مقرب بناتا ہوں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ٹھیک ہے، پھر آپ مجھے ''وزیرِ خزانہ'' بنادیجئے۔ میں ان شاء اللہ کام اچھے طریقے سے انجام دوں گا۔ ابتدائی سات سال میں خوب خوشحالی رہی اور غلّہ ذخیرہ کرلیا گیا، جب اس کے بعد قحط والے سال شروع ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے راشن کی تقسیم شروع فرمادی، اور مقدار مقرر کردی کہ ہر شخص کو اتنا گندم فروخت کیا جائے گا۔

اب قحط کی وجہ سے دور دراز سے لوگ گندم لینے کے لئے وہاں آنے لگے، چنانچہ کنعان سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی گندم لینے آ گئے۔

بھائیوں کا غلّہ کے لئے مصر آنا

ان بھائیوں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس طرح ''وزیرِ خزانہ'' بن چکے ہیں، چنانچہ بھائیوں نے آ کر حضرت یوسف علیہ السلام سے غلّہ مانگا کہ ہمیں غلّہ دیدو۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نہیں پہچانا کہ یہ ''یوسف'' ہیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام پہچان گئے کہ یہ میرے بھائی ہیں، چنانچہ ان کو غلّہ دیدیا اور غلّہ کی قیمت جو انہوں نے ادا کی تھی وہ بھی غلّہ کے ساتھ ہی رکھوادی، وہ بھائی جو قاتل تھے جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا تھا، ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا کہ غلّہ خریدتے وقت جو قیمت انہوں نے ادا کی تھی، وہ بھی ان کے غلّہ کے اندر چھپا کر رکھ دی، تاکہ گھر جب جا کر غلّہ کھولیں تو یہ دیکھ لیں کہ ان کے پیسے ان کو واپس مل گئے۔

میں تمہارا بھائی ہوں

لیکن ساتھ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا کہ جو تمہارا چھوٹا بھائی ''بنیامین'' ہے، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حقیقی بھائی تھا، اس کو آئندہ ساتھ لے کر آنا، ورنہ تمہیں راشن نہیں ملے گا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ منظر بھی دکھایا کہ جو میرے قاتل تھے وہ میرے پاس محتاج بن کر آئے اور آ کر انہوں نے راشن مانگا اور بھائی کو بلوالیا اور اگلی مرتبہ حقیقی بھائی ''بنیامین'' بھی آ گئے اور

اس کو چپکے سے بتادیا کہ میں تمہارا بھائی ہوں، میرے کارندے جو عمل کریں اس پر تم رنج مت کرنا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک شاہی پیالہ ''بنیامین'' کے غلّہ میں رکھوادیا، جب وہ لوگ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو کارندوں نے یہ اعلان کردیا کہ تم لوگ چور ہو۔ وہ بھائی واپس لوٹے اور پوچھا کہ ہم نے کیا چوری کی؟ کارندوں نے کہا کہ تم نے بادشاہ کا پیالہ چوری کرلیا ہے، ان بھائیوں نے کہا کہ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں، ہم نے تو کبھی چوری نہیں کی۔

اور ''بنیامین'' کو روک لیا

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تمہاری چوری پکڑی جائے تو پھر کیا ہوگا؟ بھائیوں نے کہا کہ جس کے مال سے وہ پیالہ نکل آئے، آپ اس کو اپنے پاس غلام بنا کر رکھ لیں۔ اب تلاشی شروع ہوئی اور پہلے دوسرے بھائیوں کی تلاشی ہوئی اور آخر میں ''بنیامین'' کے سامان کی تلاشی لے کر وہ پیالہ وہاں سے نکال لیا۔ اب بھائیوں کے پاس کوئی عذر نہیں تھا، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ''بنیامین'' کو اپنے پاس روک لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ جب میرے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی اطلاع ملے گی تو ان کا اس وقت کیا حال ہوگا؟ اس لئے کہ ایک بیٹا تو پہلے ہی چلا گیا تھا اور ایک بیٹا اب چلا گیا۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ سب تدبیر اس لئے کی، تاکہ ان بھائیوں کو تھوڑی سی عقل آئے، پھر یہ دوبارہ اپنے باپ کے پاس واپس جائیں اور اپنے سابقہ کرتوتوں پر استغفار اور ندامت پیدا ہو۔

جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو

چنانچہ یہ بھائی واپس گھر گئے اور اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کو بتایا کہ اس طرح ہوگیا اور ہم نے تو ''بنیامین'' کی بہت حفاظت کی تھی، لیکن اس کی چوری پکڑی گئی اور وہ قید ہوگئے۔ اس موقع پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا (۱)

بس صبر ہی بہتر راستہ ہے اور اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو مجھ تک پہنچادے گا۔

پھر بیٹوں سے فرمایا:

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ (۲)

اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہوجاؤ۔

میں ''یوسف'' اور یہ میرا بھائی

چنانچہ یہ بھائی روتے ہوئے پھر کسی طرح مصر پہنچے، اور حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ ہم تو بڑی مصیبت میں آگئے ہیں اور ہمارے والد بوڑھے ہیں، اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے راز کھولا اور فرمایا کہ:

---

(۱) سورة یوسف: آیت (۸۳)

(۲) سورة یوسف: آیت (۸۷)

هَلْ عَلِمْتُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ (۱)

آپ کو پتہ ہے کہ آپ نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ اس وقت ان کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا:

أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ

کیاتم ہی یوسف ہو؟

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي (۲)

ہاں ! میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔

اور فرمایا کہ:

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (۳)

آج میں تم پرکوئی ملامت نہیں کرتا۔

چونکہ روتے روتے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی چلی گئ تھی، اس لئے بھائیوں سے کہا کہ یہ میراقمیص لے جاؤ اور جا کر میرے والد کے منہ پرڈال دوتو ان کی بینائی واپس آجائے گی اور پھر پورے خاندان کو یہاں لے آؤ۔

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۸۹)

(۲)سورۃ یوسف: آیت (۹۰)

(۳) سورۃ یوسف: آیت (۹۲)

یوسف کی خوشبو آرہی ہے

جونہی حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کی قمیص وہاں سے روانہ ہوئی، اُدھر یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام کنعان میں لوگوں سے کہنے لگے کہ مجھے تو یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ دیکھئے! ابھی یوسف کی قمیص مصر سے کنعان کی طرف چلی ہے اور اُدھر کنعان میں حضرت یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام فرمارہے ہیں:

إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ (۱)

لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ تم یہ کہو گے کہ یہ بوڑھا بہک گیا ہے، لیکن میں تو یوسف کی خوشبو محسوس کررہا ہوں۔ بہرحال! وہ قمیص کنعان پہنچی اور حضرت یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام پرڈالی گئی، اس کے نتیجے میں ان کی بینائی واپس آگئی۔

اور سب سجدہ میں گر گئے

اب پورے خاندان نے مصر جانے کی تیاری کی اور سفر کر کے مصر پہنچے، اس وقت حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا:

ادْخُلُوا مِصْرَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ (۲)

یعنی مصر میں تم سب امن وامان کے ساتھ داخل ہوجاؤ ان شاء اللہ۔ اور حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنے والدین کوتخت پر بٹھایا۔ اس موقع پر والدین اور گیارہ بھائی سب کے سب سجدہ میں گر گئے اور اس زمانے میں ''سجدۂ تعظیمی''

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۹۴)

(۲) سورۃ یوسف: آیت (۹۹)

جائز تھا، ایک سجدہ ''سجدۂ عبادت'' ہوتا ہے، یعنی کسی کو اپنا معبود سمجھ کر سجدہ کیا جائے وہ تو بالکل حرام اور شرک ہے، لیکن دوسرا سجدہ ہوتا ہے تعظیمی، یعنی کسی کی تعظیم کے لئے اس کو سجدہ کرنا، یہ سجدہ پچھلی اُمتوں میں حلال تھا، البتہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت پر یہ سجدہ بھی ممنوع قرار دیدیا گیا۔ (۱)

یہ ہے میرے خواب کی تعبیر

بہرحال! یہ سب کے سب حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے سجدہ میں گر گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ:

إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ (۲)

کہ میں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں، اس خواب کا منظر آج سامنے آگیا، اس لئے کہ شمس وقمر تو والد اور والدہ تھے اور گیارہ ستارے، گیارہ بھائی تھے۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

---

(۱) روى أبو نعيم فى "تاريخه" ۲ / ۱۰۴ عن سلمان أنه لقى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى بعض سكك المدينة يسجد له، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا سلمان! اتسجد لى؟أرأيت لو مت أكنت ساجدا لغيرى؟ قال: انما أسجد النورالذى خلقه الله بين عينيك، قال: فلا تسجد لى ، واسجد للحى الذى لا يموت، ولو أمرت أحدا أن يسجد أحدا لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها لعظم حقه عليها. و حسن اسناده الحافظ ابن كثير فى تفسيره (۱۰ / ۳۱۶) و راجع سنن أبى داؤد ۳ / ۵۷ (۲۱۳۳)

(۲) سورة يوسف: آيت (٤)

هٰذَا تَأْوِيْلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا

یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس خواب کو سچا کر دکھایا۔

اللہ تعالیٰ کے احسانات گنوانا شروع کر دیئے

اب دیکھئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سالہا سال مصیبتوں اور تکالیف میں گزارنے کے بعد اپنے والدین سے مل رہے ہیں، اور ان بھائیوں سے مل رہے ہیں جنہوں نے تقریباً ان کے قتل کی سازش تیار کی تھی۔

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی اور ہوتا تو والد صاحب سے سالہا سال کے بعد ملاقات کے وقت سینے سے لگ کر خوب روتا، اور اپنا سارا دُکھڑا سناتا کہ میرے اُوپر کیا کیا ظلم ہوئے، کس طرح مجھے کنویں میں ڈالا گیا اور کس طرح میں نے قید خانہ میں زندگی گزاری، کس طرح سالہا سال تک غلام بن کر رہا وغیرہ، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنے والد صاحب سے جب ملاقات ہوئی تو بات یہاں سے شروع کی:

وَقَدْ أَحْسَنَ بِيْ إِذْ أَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ إِخْوَتِيْ (۱)

کہ میرے پروردگار نے مجھ پر احسان فرمایا کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا۔ اب دیکھئے کہ قید خانے میں جانے کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ قید خانے سے نکلنے کا ذکر

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۱۰۰)

فرمایا، اور کنویں میں ڈالے جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ اور فرمایا کہ آپ لوگوں کو دیہات سے یہاں شہر میں اللہ تعالیٰ میرے پاس لے آئے۔ بچھڑنے کا اور مدتوں فراق ہوجانے کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر فرمایا کہ آپ لوگوں کو مہمان بنا کر پہنچا دیا اور بھائیوں نے جو شرارت کی تھی، اس کو شیطان کے سر ڈال دیا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان ایک فساد پیدا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ احسانات فرمائے۔

اللہ کی مشیت میں لطیف انداز ہوتا ہے

پھر فرمایا:

إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِمَا يَشَاءُ [1]

میرا پروردگار لطیف طریقے سے وہ کام کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

یعنی سارا دُکھڑا سنانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کرکے شکر گزار بندے بنے۔ فرمایا کہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا، آپ سب کو دیہات سے شہر میں لے آئے اور اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کو بڑے لطیف طریقے سے انجام دیتے ہیں، بہرحال! یہ بات تو والد صاحب سے کہی۔

بادشاہ بن کر شکر ادا کرنے کا انداز

اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ:

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۱۰۰)

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِىْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِىْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ [1]

اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے سلطنت عطا فرمائی۔ اس لئے کہ بادشاہ نے پہلے ان کو وزیرِ خزانہ بنایا تھا، بعد میں بادشاہ نے ساری سلطنت حضرت یوسف علیہ السلام کو سونپ دی تھی۔ اور اے پروردگار! آپ نے مجھے خواب کی تعبیر بتانے کا علم عطا فرمایا، اپنا سارا منصب، اپنی شوکت، اپنی بادشاہت، اپنا جاہ وجلال یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ یا اللہ! یہ سب آپ کی عطا ہے، میں کچھ نہیں تھا، آپ نے مجھے یہ سلطنت عطا فرمائی، آپ نے مجھے خواب کی تعبیر کا علم بخشا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے یہاں تک پہنچایا۔

ہر منصب اور عہدہ کو اللہ کی عطا سمجھو

اس شکر کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بندگی سکھائی کہ آدمی کو دنیا کے اندر چاہے کتنا ہی بڑا منصب اور کتنا ہی بڑا عہدہ مل جائے اور لوگوں میں اس کی شہرت اور عزت ہوجائے، لیکن وہ اپنے ذہن میں یہ بات رکھے کہ یہ سب اللہ جل شانہ کی عطا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں اور وہ کسی منصب پر پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو ''فرعون'' سمجھنے لگتے ہیں، اور لوگوں پر اپنی فرعونیت کا سکہ جمانا چاہتے ہیں، ان کو اس واقعہ کے ذریعہ یہ سبق دیدیا کہ ہمارے پیغمبر بھی بادشاہ بنے ہیں، لیکن بادشاہ بننے کے بعد ان کی زبان پر یہ الفاظ ہوتے ہیں کہ:

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۱۰۱)

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ [1]

آپ نے مجھے یہ سلطنت عطا فرمائی ہے، اس میں میرا کوئی استحقاق نہیں تھا، لہٰذا جو کچھ اچھائی، جو شہرت اور نیک نامی بندہ کو حاصل ہو، یہ نہ ہو کہ اس کی گردن اکڑ جائے اور اس کا سینہ تن جائے، بلکہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے اور جھک جائے۔

مکہ میں فاتحانہ داخل ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انداز

دیکھئے! جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں فاتح کے طور پر داخل ہو رہے تھے، وہ مکہ مکرمہ جہاں ان کو تکلیفیں پہنچائی گئیں، اذیتیں دی گئیں اور جہاں آپ پر ایمان لانے والوں کو تپتی ہوئی ریت پر لٹایا گیا اور گرم سلاخوں سے ان کو داغا گیا، اس مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ [2] فرماتے ہیں کہ آپ کے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں داخل ہونے کا منظر آج بھی میرے سامنے ہے کہ آپ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہیں، آپ کی گردن جھکی ہوئی ہے، ٹھوڑی سینے سے لگی ہوئی ہے اور زبان مبارک پر یہ آیات ہیں:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا [3]

---

(۱) سورہ یوسف: آیت (۱۰۱)

(۲) ملاحظہ فرمائیں: مسند أبي يعلى ٦ / ١٢٠ (٣٣٩٣) وقال الذهبي فی "تاریخ الاسلام" ١ / ٣٧٠ حديث صحيح. طبع دار العرب الإسلامي اور سورہ فتح کی تلاوت کا ذکر حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے، ملاحظہ فرمائیں: صحیح البخاری ٩ / ١٥٧ (٧٥٤٠)

(۳) سورۃ الفتح: آیت (۱)

کوئی دوسرا فاتح ہوتا تو اکڑتا ہوا داخل ہوتا اور اپنے فاتح ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے داخل ہوتا، لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی وانکساری ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عام معافی کا اعلان

اور یہ اعلان (۱) فرمارہے ہیں کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، اسے امن ہے، جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرے گا، اسے امن ہے، جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے گا، اسے امن ہے، جو شخص حرم میں داخل ہوجائے گا، اسے امن ہے، کوئی اور فاتح ہوتا تو مکہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہوتیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے فتحِ مکہ کے موقع پر مکہ کی حرمت کو اُٹھالیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اجازت دے دی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو تم یہاں خون بہا سکتے ہو۔ (۲) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خون نہیں بہایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان پر شکر کے الفاظ

کیوں؟ اس لئے کہ جب اللہ کا بندہ ''بندہ'' بن کر بادشاہ بنتا ہے تو پھر اس کی گردن نہیں اکڑتی، اس کا سینہ نہیں تنتا، بلکہ اس کی گردن اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں اور جھک جاتی ہے۔ اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان پر اس وقت یہ الفاظ تھے کہ:

---

(۱) صحیح مسلم ۳ / ۱۴۰۵ (۱۷۸۰)

(۲) قولہ تعالیٰ: وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ. سورۃ البلد، آیت:۲

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱)

تکالیف کا کوئی ذکر نہیں

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو ''احسن القصص'' قرار دیا۔ یہ واقعہ اور دوسرے انبیاء کرام کے واقعات اللہ تعالیٰ نے ان کو قصہ گوئی اور افسانہ طرازی کے طور پر بیان نہیں فرمایا، بلکہ ان واقعات سے سبق لینے کے لئے ان کو بیان فرمایا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اتنی سخت تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد، قید خانہ کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد، ماں باپ کی جدائی کی تکلیف برداشت کرنے کے بعد، اندھے کنویں میں پڑے رہنے کی تکلیف اُٹھانے کے بعد، غلامی کی زندگی گزارنے کے بعد، جب والدین سے ملاقات ہوتی ہے تو ان تکالیف کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر کرتے ہیں۔

یہ دنیا ہے، جنت نہیں

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے سبق دیئے ہیں، ہر ہر مرحلے پر ہمارے لئے کوئی نہ کوئی سبق ہے، لیکن واقعہ کے آخر میں حضرت یوسف علیہ السلام یہ سکھا گئے کہ ارے یہ دنیا ہے، اس میں تو مشکلات اور تکالیف آتی رہیں گی، اس لئے کہ یہ دنیا ہے، جنت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تین عالَم پیدا فرمائے ہیں، ایک عالَم راحت ہی راحت کا ہے، جس میں تکلیف کا نام ونشان

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۱۰۱)

نہیں، وہ جنت ہے۔ دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، راحت کا نام نہیں، وہ جہنم ہے۔ تیسرا عالم وہ ہے جو دونوں سے ملا جلا ہے، اس میں راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، اس میں خوشیاں بھی ہیں، اس میں غم بھی ہیں۔

دنیا میں تکلیف ملنی ہی ہے

اس دنیا کے اندر کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو خوش ہی خوش رہتا ہو اور اس کو کبھی کوئی صدمہ اور کوئی تکلیف پیش نہ آئی ہو، یہ نہیں ہوسکتا، یہاں انبیاء علیہم السلام جو اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہوتے ہیں وہ بھی آزمائشوں سے خالی نہیں ہوتے، بلکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلَاءً؟ قَالَ: الأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الأَمْثَلُ فَالأَمْثَلُ (١)

یعنی سب سے زیادہ مصیبتیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔ لہٰذا اس دنیا کے اندر کوئی شخص بھی رنج اور صدمہ سے خالی نہیں ہے۔ اور اسی طرح اس دنیا کے اندر کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا جس کو کبھی خوشی نہ ملی ہو اور کوئی آدمی ایسا بھی نہیں ملے گا جس کو کبھی غم نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس کام کے لئے بنائی ہے کہ انسان کو جب یہاں تکلیف ہو تو صبر کرے اور جب اس کو راحت ملے تو شکر کرے۔ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، حکمران ہو، سرمایہ دار ہو، دولت مند ہو، اس کو صرف خوشی ہی خوشی حاصل ہو، یہ نہیں ہوسکتا۔

(١) سنن الترمذی ٤ / ٢٠٣ (٢٣٩٨) وقال: هذا حديث حسن صحيح.

''زندگی''، غم اور مسرت کا مجموعہ

بہرحال! غم اور مسرت کے مجموعہ کا نام ''زندگی'' ہے۔ اب جو آدمی ناشکرا ہوتا ہے وہ صرف ''غموں'' کو لے کر بیٹھ جاتا ہے کہ میرے ساتھ یہ ہوگیا، میرے ساتھ یہ معاملہ ہوگیا، میں تو اتنی تکلیف اور پریشانی میں گھرا ہوا ہوں، میری زندگی خراب ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو انعامات اس کو دے رکھے ہیں، اس کی طرف بالکل دھیان نہیں ہوتا۔ جبکہ انبیاء یہ سکھاتے ہیں کہ جب صدمہ اور تکلیف آئے تو صبر کرو۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ [1]

یعنی صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر ملنے والا ہے۔

لہٰذا اس دنیا میں تکلیف پیش آئے تو صبر کرو، اور اگر راحت اور خوشی ملے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

دنیا اور آخرت میں آپ ہی کارساز ہیں

اس واقعہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بڑا زبردست سبق دیدیا اور اتنی لمبی غم واندوہ کی داستان کا نتیجہ یہ نکالا کہ میرے پروردگار نے مجھ پر احسان فرمایا۔ اور جس وقت اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر کیا، اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگی:

---

(۱) سورۃ زمر: آیت (۱۰)

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ
تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱)

چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام ہرطرح کے مناظر دیکھ کر آئے تھے، غم کے مناظر بھی، صدمے کے مناظر بھی، خوشی کے مناظر بھی اور کبھی غلام بنادیئے گئے، کبھی قیدی بنادیئے گئے، کبھی وزیر بنادیئے گئے، کبھی بادشاہ بنادیئے گئے۔ اس لئے جب وہ اپنے رب/ پروردگار کو پکارتے ہیں تو کہتے ہیں: اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، یعنی آسمان وزمین کا جو نظام چل رہا ہے، یعنی اچھائی اور برائی، خوشی اور راحت، ان سب کو پیدا کرنے والے آپ ہیں۔

اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ

آپ ہی میرے کارساز ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

جیسا کہ گذشتہ کل عرض کیا تھا کہ دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنی چاہئے۔ اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اصل دُعا سے پہلے فرمایا کہ آپ ہی آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے ہیں اور آپ ہی میرے کارساز ہیں، آپ ہی میری بگڑی بنانے والے ہیں۔ ''ولی'' وہ ہوتا ہے جو اپنے ماتحت کی ہر مصلحت کا خیال رکھتا ہے، اس کی بگڑیاں بناتا ہے، اے میرے ولی، جو دنیا میں بھی میرے ولی ہیں اور آخرت میں بھی میرے ولی ہیں یعنی آخرت میں بھی آپ سے یہی اُمید رکھتے ہیں کہ آپ ہماری بگڑی بنائیں گے اور ہماری مصلحت کے مطابق فیصلے فرمائیں گے۔

---

(۱) سورۃ یوسف: آیت (۱۰۱)

مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دیدے

اب آپ سے درخواست یہ ہے کہ:

تَوَفَّنِیۡ مُسۡلِمًا

اب تک آپ نے اتنے انعامات تو میرے اُوپر کردیئے، اب آخری انعام میرے اُوپر دنیامیں یہ کردیجئے گا کہ جب میری وفات ہواور جب میری موت آئے، اس وقت میں تابعدار بندہ بناہواہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کے قلوب میں تغیرآتا رہتا ہے، اس لئے اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ کسی وقت ہمارا دل کسی غلط سمت میں نہ چلاجائے اور کہیں دل میں ٹیڑھ پیدانہ ہوجائے، اس لئے اے اللہ! جب موت آئے تو اس حالت میں آئے کہ میں آپ کا تابعدار ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے حسنِ خاتمہ کی دعا کی۔ اس لئے کہ اعتبار ''حسنِ خاتمہ'' کا ہے۔

مجھے صالحین کے ساتھ شامل کردیجئے

اس کے ساتھ آخر میں یہ دُعا فرمائی کہ:

وَاَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ [1]

اور اے اللہ! مجھے صالحین کے ساتھ شامل کردیجئے۔

دیکھئے! ایک نبی یہ دُعا کررہا ہے کہ مجھے صالحین میں شامل کردیجئے۔ نبی کو

(۱) سورۃ یوسف:آیت (۱۰۱)

اللہ تعالیٰ نے جو بلند مقام عطا فرمایا ہے، اس کے بجائے اپنی ذات کو پستی والے درجے میں شامل ہونے کی دُعا کررہے ہیں، اس لئے کہ ''صالحین'' کا درجہ تو بہت بعد میں ہے، اس لئے کہ درجات میں ترتیب اس طرح ہے کہ:

مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (۱)

پہلا درجہ انبیاء کا ہے، دوسرا درجہ صدیقین کا ہے، تیسرا درجہ شہداء کا ہے اور چوتھا درجہ صالحین کا ہے۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کے باوجود اپنی تواضع کی وجہ سے یہ دُعا کررہے ہیں کہ یااللہ! اگر آپ مجھے صالحین میں شامل فرمالیں تو میرے لئے وہ بھی بڑی نعمت ہے۔

جنتِ موعود عطا فرمائیے

جیسے ہم نے اپنے بہت سے بزرگوں سے یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ ہمیں اگر اللہ تعالیٰ جنتیوں کی جوتیوں میں جگہ دیدے تو ہمارے اُوپر بہت بڑا کرم ہوگا۔ ہم جنت کی نعمتوں کے لائق نہیں ہیں، لیکن وہ اپنے فضل وکرم سے اہلِ جنت کی جوتیوں میں جگہ دیدے تو یہ ہمارے لئے بڑی نعمت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سے دُعا وہی مانگتے ہیں کہ:

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ (۲)

اے اللہ! جنت کی جن نعمتوں کا آپ نے وعدہ فرمایا ہے، وہ ساری نعمتیں

---

(۱) سورۃ النساء: آیت (۶۹)

(۲) سورۃ آل عمران: آیت (۱۹۴)

ہمیں عطا فرمایئے اور ہمارے استحقاق کے بغیر عطا فرمایئے۔ بہرحال! کس درد کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ دعا مانگی اور اس دعا پر اللہ تعالیٰ نے اس ''احسن القصص'' کو ختم فرمادیا۔ اور جس قدر تفصیل سے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا، اتنی تفصیل سے کسی کا واقعہ بیان نہیں فرمایا اور آخر میں اس دعا پر واقعہ کو ختم فرمادیا۔

صالحین کے ساتھ شامل ہونے کا طریقہ

اب ''صالحین'' کے ساتھ الحاق کا راستہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں بزرگوں نے فرمایا کہ دنیا میں جو صالحین ہیں، تم ان کے ساتھ جڑ جاؤ اور جب دنیا میں ان کے ساتھ رہوگے تو ان شاء اللہ، آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کا ساتھ عطا فرمائیں گے۔ ہمارے حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال دیا کرتے تھے کہ ایک ریل گاڑی جارہی ہے اور اس ریل گاڑی میں ملک کا صدر سفر کرنے والا ہے، چنانچہ اس ریل گاڑی میں صدرِ مملکت کے لئے اعلیٰ درجے کی بوگی لگائی گئی ہے، اس بوگی میں بہترین فرنیچر ہے، ان کے لئے کھانے پک رہے ہیں، خوشبو اُٹھ رہی ہے اور بوگی میں عیش و آرام کے ساتھ انتظامات ہیں، جب وہ ریل چلنے لگی اور لاہور جارہی ہے تو اسٹیشن ماسٹر نے اس ٹرین کے ساتھ ایک پرانا ڈبا بھی لگا دیا تاکہ وہاں اس کی مرمت ہوجائے۔ اب ایک طرف صدرِ مملکت کی بوگی ہے جو خوشبوؤں میں مہک رہی ہے اور دوسری طرف اس گاڑی میں ایک پرانا ڈبہ بھی لگا ہوا جارہا ہے جس کے چلنے سے مختلف قسم کی آوازیں آرہی ہیں۔

میرا کنڈا تمہارے ساتھ جڑا ہوا ہے

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ وہ جو صدرِ مملکت کی بوگی ہے، وہ اس پرانے ڈبے پر ہنستی ہے کہ تو یہاں کہاں ہمارے ساتھ لگ گیا؟ وہ پرانا ڈبہ اس سے کہتا ہے کہ تو خاموش ہوجا۔ میں اگرچہ پرانا بوسیدہ اور چوں چوں بولتا ہوا ڈبہ ہوں، لیکن میرا کنڈا تمہارے ساتھ جڑا ہوا ہے اور جب تک یہ کنڈا جڑا ہوا ہے تو جس وقت تم لاہور پہنچو گے میں بھی لاہور پہنچوں گا اور وہاں جاکر میری مرمت بھی ہوجائے گی۔

اللہ والوں کے ساتھ جڑ جاؤ، جنت میں پہنچ جاؤ گے

یہ مثال دے کر حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اللہ والوں کے ساتھ تعلق قائم کرلینا، اور ان کے ساتھ جڑ جانا بالکل ایسا ہی ہے کہ پرانے ڈبے کا صدرِ مملکت کی بوگی کے ساتھ جڑ جانا۔ اور ہماری مثال پرانے ڈبے جیسی ہے اور اللہ والوں کی مثال اس شاندار بوگی جیسی ہے، لہٰذا اگر ہم اپنے آپ کو اللہ والوں کے ساتھ جوڑ لیں تو چاہے چوں چوں بولیں یا کچھ اور آواز نکالیں، لیکن منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ اس لئے حضرت یوسف عَلَیْہِ السَّلَام نے یہ دُعا فرمائی کہ

"وَأَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ"

لہٰذا اگر دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی صحبت عطا فرمادے، متبعِ سنت لوگوں کی صحبت عطا فرمادے تو اللہ کی رحمت سے اُمید ہے کہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کردیں گے۔

جس کے ساتھ محبت، اس کی معیت

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (۱)

یعنی قیامت کے دن انسان ان کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ وہ دنیا میں محبت کرتا تھا، جس روز حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات ارشادفرمائی تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ہمیں ایمان لانے کے بعداتنی خوشی کسی بات سے نہیں ہوئی جتنی خوشی ہمیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے یہ جملہ سن کر ہوئی کہ "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" کہ جن کے ساتھ انسان محبت کرتا ہے، قیامت کے روزانہی کے ساتھ رہے گا۔

اولاد کو نیک والدین کے ساتھ ملا دیا جائے گا

اورقرآنِ کریم کی اس آیت میں بڑی بشارت کی بات ہے کہ:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ (۲)

یعنی وہ لوگ جوایمان لائے، عملِ صالح کیے اور ان کی اولاد بھی ہے اور وہ اولاد ایمان تو لائی ہے، مسلمان تو ہے، لیکن وہ اولاد عمل میں اپنے آباء واجداد کے درجے تک نہیں پہنچے تو ہم اپنے فضل وکرم سے ان کی ذریت کو بھی ان کے ساتھ شامل کرلیں گے۔ اور ان آباء واجداد کے عمل میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۸ / ۳۹ (۶۱۶۷) و(۶۱۶۸)

(۲)سورۃ الطور:آیت (۲۱)

اولاد روحانی بھی والدین کے درجے میں ہوگی

اس آیت میں ہمارے اور آپ کے لئے بڑی بشارت ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں آباء واجداد نیک دیئے تو اللہ تعالیٰ ان کی بدولت ان کی ذریت کو جنت کے بلند درجات عطا فرمادیں گے۔ اور ’’ذریت‘‘ کی دو قسمیں ہیں، ایک نسبی ہوتی ہے اور دوسری ذریت علمی، فکری اور عملی ذریت ہوتی ہے، لہٰذا اگر کوئی شیخ ہے، کوئی بزرگ ہے تو اس کے جو مریدین ہیں، وہ بھی اس کی ذریت میں شامل ہیں ان شاء اللہ۔ لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ سے یہ اُمید رکھتے ہیں کہ جن بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دکھادیا، یا جن بزرگوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمارا تعلق جوڑ دیا، ان شاء اللہ۔ اگرچہ ہمارے عمل ان کے عمل کے ہزارویں حصہ کے برابر بھی نہ ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قیامت کے روز ہمیں ان کے ساتھ شامل فرمادیں گے۔

اللہ والے کے دل میں بیٹھ جاؤ

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی محبت چاہتے ہو، بر بناء فاعل بھی اور بر بناء مفعول بھی، یعنی یہ کہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اور اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں تو تم کسی اللہ والے کے دل میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ جب تم ان کے دل میں جا کر بیٹھو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت اس طرح بھی حاصل ہوگی کہ تم اللہ سے محبت کرو گے اور اس طرح بھی حاصل ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے، یہ بہت بڑی نعمت اور بڑی دولت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے، اپنے فضل سے ہم سب کو یہ دولت عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ، رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۱۴ و ۱۵

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ، رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! گذشتہ کئی مہینوں سے ''مناجاتِ مقبول'' کی دُعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے۔ کئی قرآنی دُعاؤں کی تشریح پہلے ہوچکی ہے، اگلی دُعا یہ ہے:

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ، رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ (۱)

---

(۱) سورۃ ابراھیم: آیت (۴۰-۴۱)

یہ دُعا اکثر لوگوں کو یاد بھی ہوتی ہے، اور جب نماز میں ''التحیات'' میں بیٹھتے ہیں تو درود شریف کے بعد جو دُعائیں پڑھی جاتی ہیں، ان میں سے ایک دُعا یہ بھی ہے اور یہ حقیقت میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا ہے۔ اور یہ دُعا انہوں نے ایسے موقع پر مانگی ہے جب شدتِ جذبات کا اعلیٰ ترین مظہر تھا، وہ یہ کہ اپنی اہلیہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اپنے دودھ پیتے بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام، ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس جگہ لا کر جس جگہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ قائم کرنا تھا، اور اس بیت اللہ کی بنیادیں موجود تھیں، البتہ اس کی جدید تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ کرانی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے یہ حکم ہوا کہ اپنی اہلیہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اپنے بیٹے کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں چھوڑ دو، تم واپس چلے جاؤ۔

پلٹ کر یہ نہیں پوچھا، کیوں؟

حضرت ہاجرہ خاتون ہیں اور ساتھ میں دودھ پیتا بچہ ہے، ان دونوں کو وہاں پر ایک جگہ بٹھایا اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام حکم ملتے ہی وہاں سے واپس چل پڑے، پلٹ کر اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ اس جنگل بیاباں میں ان دونوں کو کیسے تنہا چھوڑ کر جاؤں؟ ہر جگہ ویرانہ ہے، پہاڑ ہیں، پانی کا کوئی نام ونشان نہیں، نہ کوئی کھیتی ہے، نہ کوئی آبادی ہے، اس بے آب وگیاہ ویرانے میں کیوں چھوڑ کر جاؤں؟ کوئی سوال نہیں کیا، بلکہ جونہی حکم ملا، فوراً روانہ ہو گئے۔

اللہ کے حکم کے آگے ''کیوں؟'' کا سوال نہیں

آپ اندازہ کریں کہ ایک شخص اپنی بیوی بچے کو ایسی جگہ چھوڑ کر جارہا ہے جہاں پر کوئی مونس نہیں، کوئی مدد اور معاون نہیں۔ کوئی کھانے پینے کا انتظام نہیں۔ بس حکم آیا کہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہر اَدا میں یہ سبق دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد ''کیوں؟'' نہیں چلتی، جب حکم آیا کہ آگ میں کود جاؤ، کود گئے، حکم آیا کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر چلے جاؤ، چل دیئے، یہ نہیں پوچھا کہ ایسا کیوں کیا جارہا ہے؟ کیا مقصد ہے؟ بلکہ چھوڑ چھاڑ کر چل پڑے۔

آج کی دنیا میں ''لوجک'' کا سوال کیا جاتا ہے

اس کے ذریعہ یہ سکھانا مقصود ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے تو بندہ کا کام یہ ہے کہ اس حکم کے آگے ''کیوں'' کا سوال نہ کرے کہ میں یہ کام ''کیوں'' کروں؟ آج کی دنیا میں ایک مصیبت یہ آگئی ہے کہ جب کسی سے کہا جائے کہ یہ قرآن شریف کا حکم ہے، یا اللہ کا حکم ہے، یا اللہ کے رسول کا یہ حکم ہے تو سوال کرتے ہیں کہ اس حکم کی ''لوجک'' کیا ہے؟ اس حکم کے پیچھے ''فلسفہ'' کیا ہے؟ پہلے وہ مجھے بتاؤ، پھر میں اس حکم پر عمل کروں گا۔ یہ ایک مصیبت ہے جس کی وجہ سے ''دین'' لوگوں کی خواہشات کا کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔

معمولی نوکر ''کیوں'' کا سوال نہیں کرسکتا

دنیا کا حال یہ ہے کہ تمہارا ایک معمولی نوکر جو تمہاری طرح کا انسان ہے،

اس کو اگر تم یہ حکم دو کہ بازار سے فلاں چیز لے آؤ، وہ نوکر تم سے سوال کرے کہ ''کیوں لاؤں؟'' کیا اس نوکر کو برداشت کروگے؟ کوئی بھی شخص یہ گوارا نہیں کرتا کہ میرا نوکر مجھ سے کیوں کا سوال کرے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کے بارے میں ہر شخص یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے ''لوجک'' بتاؤ، پھر میں عمل کروں گا اور لوگ اس شخص کے بہت عقیدت مند ہوجاتے ہیں جو اسلامی احکام اور شریعت کے احکام کی سائنسی انداز میں اس کی توجیہہ اور ''لوجک'' بتائیں کہ اس کی سائیٹفک (سائنسی) وجہ یہ ہے۔

اللہ کا کوئی حکم ''حکمت'' سے خالی نہیں

یاد رکھیے! اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم بلاوجہ نہیں ہوتا، لیکن بندہ کا کام یہ ہے کہ جو حکم دیا جائے وہ اس پر عمل کرے، چوں وچرا نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''اتباعِ کامل'' کا مقام عطا فرمایا۔

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ [1]

جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک جاؤ تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے ربُّ العالمین کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔

اس بات کو قرآنِ کریم نے اتنی تعریف کے ساتھ ذکر فرمایا کہ سورۂ بقرہ کے ان دو رکوع میں تقریباً دس مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام ذکر فرمایا، کیوں؟ اس

---

(۱) سورۃ البقرہ: آیت (۱۳۱)

لئے کہ وہ متبع تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکانے والے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کرے گا

چنانچہ جب ان کے پاس یہ حکم آیا کہ اپنے بیوی بچے کو چھوڑ کر چلے جاؤ، تو وہاں سے چل پڑے، حضرت ہاجرہ عورت ذات، بچہ گود میں ہے، شوہر ایک سہارا تھا، وہ بھی چھوڑ کر جارہا ہے، حضرت ہاجرہ نے پوچھا کہ کہاں چلے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں شام جارہا ہوں، حضرت ہاجرہ نے پھر سوال کیا کہ آپ اپنی طرف سے جارہے ہیں یا اللہ کا حکم ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے، اس عورت کا حوصلہ دیکھئے کہ وہ عورت جواب میں کہتی ہے کہ:

إِذًا لَّا يُضَيِّعُنَا

اگر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیوی بچوں کو جنگل اور بیابان میں چھوڑ کر روانہ ہوگئے۔[1]

چڑھائی پر جاکر کھڑے ہوگئے

جب روانہ ہوئے تو تھوڑا آگے چل کر ایک چھوٹی سی چڑھائی تھی، اس کے اوپر پہنچے اور اس کے بعد اُترائی آرہی تھی، یہ وہ جگہ تھی جہاں سے اپنے بیوی بچے پر نظر ڈالنے کا آخری موقع تھا، اس کے بعد بیوی بچہ نظر نہ آتا، اس جگہ پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا مانگی۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اس وقت ان

(۱) ملاحظہ فرمائیں: صحیح البخاری ٤ / ١٤٢ (٣٣٦٤)

کے کیا جذبات ہوں گے؟ کیا خیالات ہوں گے؟ اس وقت ان کے دل میں کیا طوفان اُٹھ رہے ہوں گے کہ میں بیوی بچے کو تنہا جنگل میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

چھپرا بازار، سوق مدعیٰ

کسی زمانہ میں مکہ مکرمہ میں مروہ پہاڑی کے داہنی طرف ایک مسقّف بازار ہوا کرتا تھا (جس کو چھپرا بازار کہا جاتا تھا) اس بازار پر چھت پڑی ہوئی تھی، اس بازار میں چڑھائی تھی، جس جگہ چڑھائی ختم ہوکر اُترائی شروع ہوتی تھی، وہاں پر ایک دائرہ بنا ہوا تھا، اس کو ''سوق مدعیٰ'' کہا جاتا تھا، ''مَدْعیٰ'' کے معنیٰ ہیں ''دُعا کرنے کی جگہ'' یہ وہ جگہ تھی جہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہوکر یہ دُعا مانگی تھی۔

کسی زمانے میں، میں نے بھی اس جگہ کی زیارت کی تھی، اور وہاں پر دُعائیں بھی مانگی تھیں، اب وہ حرم کی توسیع میں آگئی ہے اور وہ بازار بھی ختم ہوگیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور دوسری دُعا

اس جگہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعائیں مانگیں ان میں سے پہلی اور دوسری دعا یہ تھی کہ:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [1]

---

(۱) سورۃ ابراھیم: آیت (۳۶-۳۵)

اے پروردگار! اس شہر کو امن والا شہر بنا دیجئے اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے دُور رکھیے کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔ اے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، اب جو اِن میں سے میری اتباع کرے گا، (یعنی جو احکام آپ نے مجھ پر نازل فرمائے ہیں، ان پر عمل کرے گا) تو وہ میرا ہوگا، اور جو میری نافرمانی کرے گا تو بیشک آپ بخشنے والے اور رحم کرنے والے ہیں (آپ جس پر چاہیں، رحم فرمائیں، جس کی چاہیں، مغفرت فرمائیں)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری اور چوتھی دُعا

پھر فرمایا:

رَبَّنَا إِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِيْ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (۱)

اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو آپ کے حرمت والے گھر کے پاس لاکر آباد کیا ہے جو ایسی وادی میں ہے جہاں کوئی کھیتی نہیں اُگتی۔ اے پروردگار! میں نے ان

---

(۱) سورۃ ابراھیم: آیت (۳۷)

کو یہاں پر اس لئے آباد کیا، تاکہ یہ نماز قائم کریں۔ تو آپ لوگوں کے دِلوں کو ایسا بنادیجئے کہ لوگ ان کے پاس کھنچ کھنچ کر جائیں اور ان کو طرح طرح کے پھلوں کا رزق عطا فرمایئے، تاکہ یہ آپ کے شکر گزار بندے بن جائیں۔

رَبَّنَا إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۱)

اے ہمارے پروردگار! آپ کو تو سب کچھ معلوم ہے جو ہم اپنے دل میں رکھیں، اور جو ظاہر کریں۔ اللہ تعالیٰ سے کوئی بھی چیز مخفی نہیں، نہ زمین میں، نہ آسمان میں۔

پانچویں دُعا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ إِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ إِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ، رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۲)

میں اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام جیسے بیٹے عطا فرمائے، بیشک میرا پروردگار دُعا کو بہت سننے والا ہے، اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم

---

(۱) سورۃ ابراھیم: آیت (۳۸)

(۲) سورۃ ابراھیم: آیت (۴۰-۳۹)

کرنے والا بنادیجئے اور میری اولاد کو بھی، اے ہمارے پروردگار میری دعا قبول فرمالیجئے۔ اے ہمارے پروردگار! میری مغفرت فرمائیے۔ میرے والدین کی مغفرت فرمائیے اور سارے مؤمنین کی اس دن مغفرت فرمائیے جس دن حساب قائم ہوگا۔

شہرِ مکہ کے لئے پر امن ہونے کی دُعا

اب ذرا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ان دُعاؤں میں غور کریں:۔

① پہلی دُعا یہ کہ ''رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا'' اے پروردگار! اس شہر کو پر امن بنادیجئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کسی شہر کا پر امن ہونا یہ اس کی آبادی کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ شہر پر امن ہو اور اس میں لڑائی جھگڑے نہ ہوں، اس میں قتل وغارت گری نہ ہو۔

② دوسری دُعا یہ فرمائی کہ مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائیے، کیونکہ شرک سب سے بڑی بیماری ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (1)

یقین جانو شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔

اس شرک سے پناہ مانگی۔

---

(۱) سورۃ لقمان: آیت (۱۳)

لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے

فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِيْ إِلَيْهِمْ

③ تیسری دُعا یہ مانگی کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''بیت اللہ'' میں ایسا مقناطیس لگا ہوا ہے کہ چاروں اطرافِ عالم سے لوگ کھنچ کھنچ چلے آ رہے ہیں۔ پہلے تو لوگ صرف حج کے لئے جایا کرتے تھے اور اب تو عمرہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ہر وقت پوری دنیا سے مسلمان وہاں پر آتے رہتے ہیں۔

دنیا کا ہر پھل مکہ میں موجود

وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ

④ چوتھی دُعا یہ فرمائی کہ ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمایئے۔ آج بھی مکہ مکرمہ میں کوئی کھیتی نہیں، کوئی باغ نہیں، آج بھی وہ ''واد غیر ذی زرع'' ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے آج تک اسی طرح چلی آ رہی ہے کہ وہاں پر کوئی کھیت ہے، نہ کوئی باغ ہے، نہ کوئی درخت ہے، نہ کوئی کاشت کاری ہے۔ لیکن ساری دنیا کے پھل وہاں پر اس طرح ملتے ہیں کہ دنیا کے کسی شہر میں اتنی اقسام کے پھل نہیں ملتے ہوں گے۔ جو پھل آپ کو کسی اور جگہ نہیں ملتے، وہ پھل آپ کو وہاں (مکہ) میں مل جائیں گے۔ ''لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ'' اس سب کا نتیجہ یہ نکالا کہ اے اللہ! یہ سب نعمتیں اس

لئے عطا فرمائیں، تا کہ یہ شکر گزار بندے بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بڑی عظیم دولت ہے اور چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے انسان کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی رَٹ لگانی چاہئے۔

نماز قائم کرنے والا بنادیجئے

اب یہاں ''مناجاتِ مقبول'' میں جو دُعا نقل فرمائی ''رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ'' اے میرے رب! مجھے نماز کا پابند بنادیجئے۔ نماز قائم کرنے والا بنادیجئے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ ایک جلیل القدر پیغمبر یہ دُعا مانگ رہے ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ کیا وہ اس دُعا سے پہلے نماز نہیں پڑھتے ہوں گے؟ یقیناً وہ نماز پڑھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی ساری عبادات ادا کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ دُعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے نماز قائم کرنے والا بنادیجئے۔

نماز قائم کرنے کے معنیٰ

دیکھئے! قرآنِ کریم میں کسی جگہ بھی یہ نہیں آیا کہ ''صَلُّوْا'' نماز پڑھو۔ بلکہ ہر جگہ یہ لفظ آیا ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ'' اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی یہ دُعا کر رہے ہیں کہ مجھے نماز قائم کرنے والا بنادیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز کی جو حقیقت ہے، نماز کا جو اصل ادب ہے، نماز کا جو اصل طریقہ ہے، اس کے فرائض و واجبات ہیں، اس کے سنن اور نوافل ہیں، اس کے مستحبات اور آداب ہیں، اے اللہ! مجھے ان سب کا ادا کرنے والا بنادیجئے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے گھر میں نماز پڑھ رہا ہے، مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا نہیں کر رہا ہے تو نماز کا فریضہ

تو بڑی حد تک ادا ہو جائے گا، لیکن اگر بغیر عذر کے گھر میں پڑھ رہا ہے اور مسجد میں نہیں آتا تو اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس نے نماز تو پڑھی، لیکن نماز قائم نہیں کی، نماز قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تمام آداب کے ساتھ قائم کرو، اور گھر میں نماز پڑھنا یہ نماز کی اداءِ قاصر ہے، اداءِ کامل نہیں ہے اور اقامت صلاۃ نہیں ہے، اس لئے کہ جماعت سے نماز ادا کرنا تقریباً واجب جیسا ہے۔

عورتوں کی نماز میں پردہ رکھا گیا

عورتوں کے لئے جماعت سے نماز پڑھنا نہیں ہے، بلکہ عورتوں کے لئے جماعت سے نماز پڑھنا مکروہ ہے، ان کا کام یہ ہے کہ وہ نماز گھر میں تنہا پڑھیں، ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور کمرے میں نماز پڑھنا صحن میں پڑھنے سے بہتر ہے، یعنی عورت جتنا چھپ کر پڑھے گی، اس کو اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا، لیکن مرد کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرے، وہ ''اقامت صلاۃ'' ہے۔[1]

خشوع وخضوع اقامت صلاۃ کا حصہ

''اقامتِ صلاۃ'' کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ آدمی کو یہ دُھن ہو کہ میری نماز خشوع کے ساتھ ہو۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

(۱) سنن ابی داؤد ۱ / ۵۱۳ (۵۷۱) وقال النووی فی "خلاصة الأحكام" ۲ / ٦٧٨ (۲۲٤۷): رواه أبو داؤد باسناد صحيح على شرط مسلم.

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (۱)

ان ایمان والوں نے یقیناً فلاح پالی ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں

لہٰذا آدمی زندگی بھر یہ کوشش کرتا رہے کہ میری نماز خشوع والی نماز ہو، جس میں دھیان صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمایا کہ آدمی نماز کے اندر جو الفاظ زبان سے نکال رہا ہے، ان الفاظ کی طرف دھیان ہو، مثلاً ''الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین'' کے الفاظ جب زبان سے ادا کررہا ہے تو دھیان میں ہو کہ میں ''الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین'' کہہ رہا ہوں۔ ''الرحمٰن الرحیم'' کی طرف دھیان ہو۔ ''مالك یوم الدین'' کی طرف دھیان ہو۔ اور الفاظ کی طرف دھیان رکھنا ''خشوع'' کا ادنیٰ درجہ ہے۔

خشوع کا اعلیٰ درجہ

''خشوع'' کا اعلیٰ درجہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمادیا کہ:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (۲)

اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اور نماز عبادت کا سب سے اہم حصہ ہے، یعنی نماز تم اس طرح پڑھو جیسے کہ تم

---

(۱) سورة المؤمنون: آیت (۱ - ۲)
(۲) صحیح البخاری ۱ / ۱۹ (۵۰)

اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ یہ تصور کرو کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں، اگرچہ اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر کسی کو بھی نظر نہیں آسکتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلّی کے بے شمار مظاہر دنیا کے اندر پیدا کئے ہوئے ہیں۔

ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ موجود ہے

آدمی اگر غور کرے تو جس جگہ نماز پڑھ رہا ہے، وہاں اس کو کوئی عمارت نظر آئے گی، کوئی صحرا ہوگا، آسمان نظر آئے گا، زمین نظر آئے گی، یہ آسمان، یہ زمین کس کے پیدا کئے ہوئے ہیں؟ اللہ جل شانہ کے۔ لہٰذا اگرچہ براہِ راست اللہ جل شانہ کا جلوہ دیکھنا اس دنیا کے اندر کسی کے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن اگر وہ ذرا سا اپنے ماحول پر نظر ڈالے اور خود اپنے آپ کو دیکھے کہ میں کیسے وجود میں آگیا؟ تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان جائے گا، اور اگر بالفرض تمہارے دل میں یہ دھیان جمنا مشکل ہو رہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو تو کم از کم ذہن میں اتنا تصور کرلو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ ''خشوع'' کا اعلیٰ درجہ یہ ہے۔

الفاظ کی طرف دھیان رکھو

ہم جیسے لوگ جو دنیا کے کام دھندوں میں لگے رہتے ہیں، ان کا دھیان بٹ جائے گا اور دھیان دوسری طرف چلا جائے گا اور دوسرے غیر اختیاری خیالات دل میں آجائیں گے، لیکن جب تنبہ ہو، فوراً دوبارہ واپس الفاظ کی طرف لوٹ آؤ اور زندگی بھر یہ مشق کرتے رہو تو ایک وقت ان شاء اللہ ایسا آئے گا کہ

آپ کو ''خشوع'' والی کیفیت اور ''أن تعبد الله كأنك تراه'' والی کیفیت حاصل ہوجائے گی۔ اور خشوع کا حصول ''اقامتِ صلاۃ'' کا ایک حصہ ہے۔ اور اسی لئے حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے یہ دُعا مانگی کہ یااللہ! مجھے نماز قائم کرنے والا بنادیجئے۔

خشوع میں اور ترقی ہوجائے

آپ اندازہ کریں کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام سے زیادہ اور کون ہوسکتا ہے جو نماز کو خشوع اور خضوع کے ساتھ انجام دے؟ جتنے خشوع وخضوع کے ساتھ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام انجام دیتے تھے، اس کے باوجود ''اقامتِ صلاۃ'' کی دُعا کررہے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ میں چاہے کتنے خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز پڑھ لوں، لیکن اے اللہ! مجھے اس میں اور ترقی چاہیے، اس لئے اے اللہ! مجھے نماز قائم کرنے والا بنادیجئے۔ اس کے ذریعہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے یہ تعلیم دیدی کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگا کرو کہ

''رَبِّ اجْعَلْنِىْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ''

یااللہ! مجھے نماز قائم کرنے والا بنادیجئے۔

لہٰذا جب تم نماز کے لئے مسجد کی طرف آرہے ہوتو راستے میں یہ دُعا مانگتے ہوئے آجاؤ کہ یااللہ! میں نماز پڑھنے جارہا ہوں، معلوم نہیں شیطان کیا کیا خیالات دل میں ڈالے گا، اے اللہ! مجھے نماز میں خشوع کی توفیق عطا فرما۔

نماز کے لئے آتے ہوئے یہ دعا کرو

اور یہ دُعا کرتے ہوئے نماز کے لئے آؤ کہ

''اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ قَلْبًا خَاشِعًا''

اے اللہ! مجھے خشوع والا دل عطا فرمائیے جو آپ کی طرف متوجہ ہو۔

اس دُعا کے مانگنے میں کیا دِقّت اور مشقت ہے؟ کوئی پریشانی؟ کوئی خرچہ؟ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور جب یہ دُعا مانگنے کے بعد نماز شروع کروگے تو اوّل تو ان شاء اللہ خشوع حاصل ہوجائے گا اور اگر خشوع حاصل نہ بھی ہوتو پھر اللہ میاں سے کہہ دینا کہ یااللہ! میں نے آپ سے خشوع مانگا تھا، اگر آپ مجھے خشوع نہیں دیں گے تو پھر مجھ سے عدمِ خشوع پر مؤاخذہ بھی نہ فرمائیے، لہٰذا جب نماز کے لئے آؤ تو اللہ تعالیٰ سے خشوع مانگتے ہوئے آؤ اور اللہ تعالیٰ سے ''اقامتِ صلاۃ'' مانگتے ہوئے آؤ۔ اگر آپ نے اس پر عمل کرلیا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ ان شاء اللہ جو خشوع مطلوب ہے وہ حاصل ہوجائے گا۔

نماز سے پہلے یہ دُعا پڑھو

اسی لئے بعض روایات[1] میں یہ منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تھے تو یہ دُعا فرماتے کہ:

إِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ[2]

یعنی میں نے اپنے چہرے کا رُخ اس ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ٥٣٤ (٧٧١)

(۲) سورة الأنعام: آیت (٧٩)

حنفی مسلک [1] میں تکبیرِ تحریمہ کے بعد ثناء پڑھی جاتی ہے ''سبحانك اللّٰهم وبحمدك '' لیکن شافعی مسلک [2] میں تکبیرِ تحریمہ کے بعد یہی آیت پڑھی جاتی ہے کہ:

إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ ...الخ

اور حنفیہ فرماتے ہیں کہ نماز شروع کرنے سے پہلے یہ دُعا پڑھ لو اور آتے ہوئے یہ دُعا پڑھتے ہوئے آؤ ''رب اجعلني مقيم الصلاة '' اور یہ دُعا کرتے ہوئے آؤ ''اللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ قَلْبًا خَاشِعًا '' اے اللہ! مجھے خشوع والا دل عطا فرمادیجئے اور میری نماز کو خشوع والی نماز بنادیجئے اور دُعا کے یہ کلمات ''إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ '' بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ ہیں۔

اپنی اولاد کے لئے بھی دُعائیں کرو

پھر فرمایا: ''ومن ذرّيتي '' یعنی اے اللہ! مجھے بھی نماز قائم کرنے والا بنادیجئے اور میری ذریت کو بھی نماز قائم کرنے والا بنادیجئے۔ ''ذریت'' میں اولاد بھی داخل ہے، اور اولاد کی اولاد بھی، اور اولاد کی اولاد کی اولاد بھی داخل ہے۔ اس کے ذریعہ یہ سکھادیا کہ انسان کو صرف اپنے لئے دُعا نہیں کرنی چاہئے، بلکہ اپنی اولاد کے لئے اور اپنی نسلوں کے لئے بھی دُعا کرنی چاہئے۔ اور ہر باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کے حق میں یہ دُعا کرے اور انسان یہ کوشش کرے کہ اس کی اولاد باجماعت نماز کی پابند بنے اور ان کے لئے دُعا بھی کرے۔

---

(۱) تحفة الفقهاء ۱ / ۱۲۷

(۲) مختصر المزني ۸ / ۱۰۷

اولاد کے لئے یہ دو دُعائیں کرنی چاہئیں

بہت سے لوگ اپنی اولاد کی طرف سے پریشان ہوتے ہیں کہ میری اولاد نماز نہیں پڑھتی، یا جماعت سے نماز نہیں پڑھتی، نماز کی طرف ان کا دھیان نہیں ہے، ایسے والدین یہ دُعا ضرور کریں کہ:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (۱)

اور یہ دُعا کریں کہ:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا (۲)

اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بیوی بچوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا بنا۔

اے اللہ! ہماری بیویوں کو، شوہروں کو اور ہماری اولاد کو ہمارے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنائیے اور آنکھوں کی ٹھنڈک یہی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول دیکھیں۔

والدین کی دُعا اولاد کے حق میں ضرور قبول ہوتی ہے

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں لکھاہے کہ والدین کی دُعا

---

(۱) سورۃ ابراھیم: آیت (٤٠)

(۲) سورۃ الفرقان: آیت (٧٤)

اپنی اولاد کے حق میں بہت زیادہ قبول ہوتی ہے۔ لہٰذا والدین ہمت نہ ہاریں، مایوس نہ ہوں، اگر ماں باپ یہ دیکھیں کہ اولاد کو بار بار نصیحت کی جارہی ہے، لیکن اولاد پوری طرح عمل نہیں کرتی تو اس کی وجہ سے مایوس نہ ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یااللہ! میری اولاد کو نیک بنادیجئے، یااللہ! میری اولاد کونماز کا پابند بنادیجئے، یہ دُعا کرنا بھی والدین کے فرائض میں داخل ہے۔

اللہ کی مغفرت کی ضرورت سب کو ہے

آگے فرمایا: ''رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ'' اے ہمارے پروردگار! ہماری اس دُعا کو قبول فرمایئے۔ پھر فرمایا: ''رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ''۔ اے ہمارے پروردگار! میری بھی مغفرت فرمایئے، اور میرے والدین کی بھی مغفرت فرمایئے اور سارے مؤمنین کی مغفرت فرمایئے اس دن، جس دن آپ بندوں سے حساب لیں گے۔

یہ دُعا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام مانگ رہے ہیں، جنہوں نے کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں کی، نبیٔ معصوم ہیں، لیکن وہ دُعا کررہے ہیں کہ یااللہ! میری مغفرت فرمادیجئے۔ معلوم ہوا کہ آدمی چاہے عبادت اور طاعت کے کتنے ہی بلند رتبے تک پہنچ جائے، لیکن اس کو پھر بھی اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی ضرورت ہے، اس لئے کہ تم چاہے کتنا ہی بنا سنوار کر اللہ کی عبادت کرلو، حقیقت میں وہ عبادت اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگو۔

سلام کے بعد تین مرتبہ استغفار

چنانچہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ ہر نماز کا جب سلام پھیرتے تو اس کے بعد تین مرتبہ استغفار کرتے "استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ"(۱) کیوں کرتے؟ اس لئے کہ یااللہ! میں نے نماز تو پڑھ لی، لیکن وہ نماز آپ کی شایانِ شان نہیں ہو پائی، لہٰذا میری مغفرت فرما دیجئے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا یہ ہر بندے کا کام ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو استغفار سے کبھی بے نیاز نہ سمجھو، چاہے کوئی کیسا ہی ولی اللہ بن جائے، کیسا ہی لوگوں کا مقتدا بن جائے، لیکن استغفار سے مستغنی نہیں ہوسکتا، اس کو اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتے رہنا چاہئے۔

والدین کے لئے مغفرت کی دُعا

آگے فرمایا: "وَلِوَالِدَیَّ" میرے والدین کی بھی مغفرت فرما۔ اس کے ذریعہ بتلادیا کہ آدمی کو صرف اپنے لئے ہی نہیں، بلکہ اپنے والدین کے لئے بھی دُعا کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ فرمایا:

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (۲)

اے پروردگار! ان پر رحم فرمایئے جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ٤١٤ (٥٩١)

(۲) سورة الاسراء: آیت (٢٤)

بہرحال! والدین کے لئے دعا کرنا بندے کے معمولات میں شامل ہونا چاہئے۔

تمام مؤمنین کے لئے مغفرت کی دُعا

آگے فرمایا:

وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ

اے اللہ! سارے مؤمنین کی مغفرت فرما۔ یہ بھی ایک مسلمان کا کام ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی طرف نہ دیکھے بلکہ اپنی پوری ملت کی طرف دیکھے اور ان کے لئے بھی مغفرت مانگے جو بظاہر دیکھنے میں معصیتوں کے مرتکب نظر آتے ہیں، گناہوں کے مرتکب نظر آتے ہیں کہ اے اللہ! ان کی بھی مغفرت کردیجئے اور مغفرت کے معنی یہ ہیں کہ ان کو معصیت کے راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لے آیئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ''کافر باپ'' کے لئے دعا کرنا

اب یہاں ایک بات عرض کردوں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے یہ دُعا کی کہ اے اللہ! میرے والدین کی بھی مغفرت فرما۔ اور یہ اس زمانے کی دُعا ہے جب آپ بوڑھے ہو چکے تھے۔ روایات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ تو مؤمن تھیں لیکن باپ ''آذر'' کافر تھا، لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کو چھوڑ کر جانے لگے تو اس وقت یہ الفاظ کہے کہ:

سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ إِنَّهُ كَانَ بِیْ حَفِیًّا [1]

میں اپنے پروردگار سے آپ کے لئے مغفرت مانگتا رہوں گا

بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔

یہ ایک وعدہ تھا، اسی وعدہ کی وجہ سے اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی اور اس دُعا میں ''آذر'' بھی شامل ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ مؤمن ہو کر مرا یا کفر کی حالت میں مرا، اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اس کو عراق میں چھوڑ کر آگئے تھے۔

زندہ کافر کے لئے دُعاءِ مغفرت کا مطلب

اور اگر کسی زندہ کافر کے لئے مغفرت کی دُعا کی جائے تو اس دُعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے اللہ! اس کو ایمان کی توفیق دیدے، جس کے نتیجے میں اس کی مغفرت ہو جائے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لئے یہ دُعا مانگی کہ اے اللہ! اس کی مغفرت کر دے، یعنی اس کو ایمان کی توفیق عطا فرما۔ اسی لئے کہا گیا کہ کسی زندہ کافر کے حق میں اس نیت سے مغفرت کی دُعا کر سکتے ہیں کہ اس کو ایمان کی توفیق ہو جائے۔

غیر مسلم کو سلام کرنا

عام طور پر غیر مسلم کو ''سلام'' نہیں کیا جاتا، لیکن فقہاءِ کرام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی کافر کو ''السلام علیکم'' کہے اور اس نیت سے کہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں

(۱) سورۃ مریم: آیت (٤٧)

اسلام کی توفیق دیدے تو ''سلام'' کرنے کی گنجائش ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کافر باپ کے لئے دعا فرمائی۔ لیکن بعد میں یہ آیت قرآنِ کریم میں آئی کہ:

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ [1]

یعنی بعد میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو پھر ان سے براءت اختیار کرلی اور پھر ان کے لئے دعا نہیں مانگی، لیکن جب تک یہ پتہ نہیں چلا تھا، اس وقت تک ان کے لئے دعا کرتے رہے۔

والدین کے لئے دعا کرنا فرائض میں داخل ہے

لہٰذا ماں باپ بظاہر دیکھنے میں کتنے ہی فاسق اور فاجر ہوں، لیکن ان کے حق میں دعا کرنا، یہ اولاد کے فرائض میں داخل ہے۔ لہٰذا اپنے والدین کے لئے بھی دعا کرے اور اپنی اولاد کے لئے بھی دعا کرے اور ان کے لئے عملِ صالح کی دعا کرے اور نماز کا پابند ہونے کی دعا کرے اور سارے مؤمنین اور مؤمنات اور سارے مسلمانوں کے لئے دعائیں کرے۔ آج ہم جس مصیبت میں مبتلا ہیں اس سے نجات کے لئے خاص طور پر دعائیں کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس واقعہ سے یہ سارے سبق لینے کی توفیق عطا فرمائے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) سورۃ التوبہ: آیت (۱۱٤)

دعا نمبر ١٦

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۱۶

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! ''مناجاتِ مقبول'' میں جو قرآنی دُعائیں آئی ہیں، ان کی تشریح کرنے کا سلسلہ گزشتہ کئی مہینوں سے چل رہا ہے، آخری دُعا جس کی تشریح کی تھی وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دُعا تھی، اس کے بعد آگے یہ دُعا آئی ہے کہ:

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا (۱)

اے پروردگار! میرے والدین پر رحم فرمایئے جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

(۱) سورۃ الاسراء: آیت (۲۴)

اس دعا کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دُعا ''سورۂ اسراء'' میں آئی ہے جس کو ''سورۂ بنی اسرائیل'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس سورت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج کا ذکر فرمایا ہے، یعنی نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایک غیر معمولی معجزے کے ذریعہ ساتوں آسمانوں سے اُوپر ملاِ اعلیٰ میں اپنی بارگاہ میں بلایا اور معراج کا اور قربِ خداوندی کا اعزاز عطا فرمایا۔

نماز مؤمن کی معراج ہے

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ یہ پانچ نمازیں اسی معراج کے موقع پر فرض کی گئیں، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلایا تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ نمازوں کا تحفہ دیا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا تصور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ملاً اعلیٰ میں بلا کر اپنا قرب عطا فرمایا تو میری اُمت کا کیا ہوگا؟ اور میری اُمت اس معراج کے مقام تک کیسے پہنچے گی؟ آپ کو ہر وقت اپنی اُمت کی فکر لگی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے نماز کا تحفہ عطا فرمایا۔ وہ نماز عطا فرمائی جس کی ہر رکعت میں دو سجدے ہیں اور فرمایا کہ تمہاری اُمت کا کوئی بھی فرد میری بارگاہ میں سربسجود ہوگا اور اپنی پیشانی میری بارگاہ میں رکھے گا، اس کو ''معراج'' حاصل ہو جائے گی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ:

اَلصَّلَاةُ مِعْرَاجُ المؤْمِنِیْنَ (۱)

نماز مؤمن کی معراج ہے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: روح المعانی ۱ / ۹۱

اس لئے کہ جب سجدہ میں سر رکھ دیا تو اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا قرب بندے کو اور کسی حالت اور وقت میں حاصل نہیں ہوتا جیسا سجدے کی حالت میں حاصل ہوتا ہے۔

جب سجدہ میں ''سر'' رکھ دوں

اس سجدے کے مقام کو سمجھو، یہ تمہاری معراج ہے، ان کی بارگاہ میں ایک لمحہ کے لئے سر کا ٹیک دینا یہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے، حضرت خواجہ عزیزالحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، پہلے یہ ''ڈپٹی کلکٹر'' تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت کی خدمت میں لاکر کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ آپ کا حلیہ بدل گیا، آپ کے اعمال بدل گئے، اخلاق بدل گئے، کردار بدل گیا، شاعر تھے، لیکن شاعری کا انداز بدل گیا، ان کا ایک مصرعہ ہے کہ ؎

میں سر سجدے میں جب رکھ دوں، زمیں کو آسماں کر دوں

یعنی بندہ جب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سربسجود ہوتا ہے تو وہ آسمانوں سے بھی اُونچا جارہا ہوتا ہے اور اسے معراج حاصل ہورہی ہوتی ہے، بہرحال! معراج کے موقع پر ایک عظیم نعمت ''نماز'' کی نعمت ملی۔

اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرنا

اور ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ آیات اور کچھ احکام نازل فرمائے جو سورۂ اسراء میں ہیں، ان آیات میں زندگی گزارنے کے بڑے اہم اور بنیادی

اصول اور قواعد و احکام عطا فرمائے۔ سورۂ اسراء ان احکام سے بھری ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معراج کے نتیجے میں اس اُمت کو جو احکام عطا فرمائے ہیں کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو، سورۂ اسراء میں ان احکام کا ایک طویل سلسلہ ہے، ان احکام کا آغاز اس آیت سے فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (1)

اور تمہارے پروردگار نے تمہارے لئے یہ فیصلے کئے ہیں کہ تم زندگی کس طرح گزارو، ان میں سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کی عبادت مت کرنا اور اس کے سوا کسی کو اپنا معبود مت سمجھنا، کسی کو حاجت روا، مشکل کشا مت سمجھنا، سوائے اللہ تعالیٰ کے۔

توحید کے بعد والدین کے ساتھ نیک سلوک

آگے فرمایا:

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے بعد سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ تم والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ ذرا اندازہ کریں کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے عمل کو اپنی ''توحید'' کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا اور اس کی اہمیت کی طرف اشارہ فرمادیا کہ جب تم میری عبادت کررہے ہوگے تو تمہارے اُوپر سب سے بڑا حق تمہارے والدین کا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں دوسری جگہ

---

(۱) سورۃ الاسراء:آیت (۲۳)

پر بھی والدین کے حق کو اپنے حق کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا کہ:

أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ [1]

یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو۔

اپنے ساتھ والدین کا ذکر کر کے اس کی اہمیت کہیں سے کہیں پہنچادی ہے کہ سب سے بڑا حق تمہارے اُوپر اور سب سے بڑا فریضہ اور سب سے بڑی تمہاری فضیلت اس میں ہے کہ تم والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔

ان کے سامنے ''اُف'' مت کرنا

اور پھر آگے اس کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا [2]

اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہاری زندگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تم ان کے سامنے کبھی ''اُف'' مت کرنا۔ اور نہ کبھی ان کو جھڑکنا اور جب ان سے بات کرنا تو عزت کے ساتھ بات کرنا، ان کی عزت اور احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرنا۔

---

(۱) سورۃ لقمان: آیت (۱٤)

(۲) سورۃ الاسراء: آیت (۲۳)

ان کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کردینا

آگے فرمایا:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا (۱)

اور ان کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کردینا۔ یعنی ایسے انداز سے ان کے ساتھ سلوک کرنا جیسے کسی کے آگے انسان اپنے آپ کو ذلیل کردیتا ہے۔ اور یہ دعا کرنا کہ اے میرے پروردگار! میرے دونوں والدین پر رحم فرمایئے جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔ یہ دو مکمل آیات والدین کے حق کے لئے نازل فرمائیں۔

اصل امتحان کا وقت وہ ہے

بڑھاپے کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ جب بڑھاپا آتا ہے تو والدین کی فہم میں بھی، سمجھ میں بھی، یادداشت میں بھی بسا اوقات ضعف اور کمزوری آجاتی ہے، اور بعض اوقات ان کی خدمت کرتے ہوئے بڑی مشقت بھی اُٹھانی پڑتی ہے، اس لئے اصل امتحان تمہارا اس وقت ہے، جب تک والدین تمہاری خدمت کررہے ہیں، تمہیں پال پوس رہے ہیں اور تمہاری ضروریات پوری کررہے ہیں، اس وقت اگر تم ان کی عزت کرو، اور ان کے ساتھ احترام کا معاملہ کرو اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو تو کیا نیکی ہوئی؟ اس لئے کہ بچپن میں تمہاری زندگی ان

---

(۱) سورة الاسراء: آیت (۲٤)

پر موقوف ہے، اصل امتحان تمہارا اس وقت ہے جب وہ بڑھاپے کو پہنچ جائیں اور بڑھاپے میں بعض اوقات ان کے حواس بھی صحیح طرح کام نہیں کرتے، ایک ہی بات کو بار بار پوچھتے رہتے ہیں، ناراض ہوجاتے ہیں، غصہ ہوجاتے ہیں، اس وقت تمہارا امتحان ہے کہ اس وقت تم ان کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہو یا نہیں؟ بعض اوقات کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، اور تمہیں وہ بات ان کو سمجھانا پڑتی ہے۔

سبق آموز واقعہ

میں نے ایک کتاب میں ایک قصہ پڑھا تھا۔ معلوم نہیں کہ سچا ہے یا جھوٹا، لیکن بڑا سبق آموز واقعہ ہے، وہ یہ کہ ایک صاحب بوڑھے ہوگئے، انہوں نے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلا کر فاضل بنا دیا، ایک دن گھر کے صحن میں باپ بیٹا بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک کوّا گھر کی دیوار پر آکر بیٹھ گیا تو باپ نے بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا چیز ہے؟ بیٹے نے کہا: ابا جان! یہ کوّا ہے، تھوڑی دیر کے بعد باپ نے پھر پوچھا کہ بیٹے! یہ کیا ہے؟ بیٹے نے کہا: ابا جان! ابھی تو آپ کو بتایا تھا کہ یہ کوّا ہے۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد باپ نے پھر پوچھا کہ بیٹا: یہ کیا ہے؟ اب بیٹے کے لہجے میں تبدیلی آگئی اور اس نے جھڑک کر کہا کہ ابا جان! کوّا ہے کوّا، پھر تھوڑی دیر کے بعد باپ نے پوچھا کہ بیٹا! یہ کیا ہے؟ اب بیٹے سے نہ رہا گیا، اس نے کہا کہ آپ ہر وقت ایک بات پوچھتے رہتے ہیں، ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ یہ کوّا ہے، آپ کو سمجھ میں نہیں آتی۔ بہرحال! اس طرح بیٹے نے باپ کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باپ اپنے کمرے میں اُٹھ کر گیا اور ایک پرانی

ڈائری نکال لایا اور اس ڈائری کا ایک صفحہ کھول کر بیٹے کو دکھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا! یہ ذرا پڑھنا، کیا لکھا ہے؟ چنانچہ اس نے پڑھا تو اس میں یہ لکھا تھا کہ آج میرا چھوٹا بیٹا صحن میں بیٹھا ہوا تھا اور میں بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں ایک کوّا آ گیا، تو بیٹے نے مجھ سے ۲۵/مرتبہ پوچھا کہ ابا جان! یہ کیا ہے؟ تو میں نے ۲۵/مرتبہ اس کو جواب دیا کہ بیٹا! یہ کوّا ہے اور مجھے اس اَدا پر بڑا پیار آیا۔ اس کے پڑھنے کے بعد باپ نے کہا: بیٹا! دیکھو! باپ اور بیٹے میں یہ فرق ہے، جب تم بچے تھے تو تم نے مجھ سے ۲۵/مرتبہ پوچھا اور میں نے ۲۵/مرتبہ بالکل اطمینان سے نہ صرف جواب دیا بلکہ میں نے اس بات کا اظہار کیا کہ مجھے اس اَدا پر بڑا پیار آیا، آج جب میں نے تم سے صرف ۵/مرتبہ پوچھا تو تمہیں اتنا غصہ آ گیا۔

انسان یہ باتیں بھول جاتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ جب والدین بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہیں تو اس وقت انسان یہ بھول جاتا ہے کہ کس مشقت کے ساتھ انہوں نے مجھے پالا تھا؟ اور کس طرح میں نے ان کو تنگ کیا تھا؟ کس طرح راتوں کو یہ میرے لئے جاگے تھے؟ کس طرح میری صحت کا خیال کرنے کے لئے ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس گھومتے پھرتے تھے، اور کس طرح میرے سوالات کا جواب دیتے تھے، یہ سب باتیں وہ بھول جاتا ہے۔ اب ماشاء اللہ بیٹا بڑے منصب پر ہے اور گھر میں بوڑھا باپ پڑا ہوا ہے، بوڑھی ماں پڑی ہے، لیکن اس وقت اپنے بارے میں سوچتا ہے کہ مجھے کس چیز سے فائدہ پہنچ رہا ہے اور کس چیز سے تکلیف ہو رہی

ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے خاص طور پر فرمایا کہ جب والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تمہارا امتحان ہے کہ اس وقت بھی تم ان کو "اُف" نہ کہو اور کبھی جھڑک کر بات نہ کہو، بلکہ ان کے ساتھ عزت کا برتاؤ کرو۔

والدین کے لئے یہ دعا کیا کرو

اور یہ دعا کرو "رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا" اور یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے خود سکھلائی کہ یوں دعا کیا کرو۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ بہت سی دُعائیں تو وہ ہیں جو کسی نے مانگ لیں، لیکن بعض دُعائیں وہ ہیں جو باری تعالیٰ لفظ "قُل" کہہ کر ہمیں سکھلاتے ہیں کہ تم یہ دعا کرو اور جب دُعا خود سکھلائی جارہی ہے تو اس کی قبولیت میں کیسے شک ہوسکتا ہے؟ مثلاً ایک شخص دوسرے سے کہے کہ مجھ سے ایک ہزار روپے مانگو، دوسرے شخص نے ہزار مانگ لئے، اب پہلا شخص کہے کہ میں تو نہیں دیتا تو یہ کمینگی ہے۔ اللہ جل جلالہ اس سے کہیں بلند و بالا ہے کہ وہ ہم سے کوئی دعا کرنے کو کہے اور جب ہم دعا کریں تو وہ یہ کہہ دیں کہ میں نہیں مانتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ناممکن ہے، اس لئے یہ دُعا "رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا" ضرور قبول ہوگی۔

زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی

اور یہ دُعا والدین کی زندگی کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ زندگی میں بھی دعا کرو کہ یااللہ! ان پر رحم فرما۔ اور "رحم فرما" اتنی جامع دعا ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو اس دُعا میں ان کی صحت بھی آگئی، ان کی خوشحالی بھی آگئی، ان کی خوشیاں بھی

آگئیں، گویا کہ ساری چیزیں آگئیں اور اگر والدین کا انتقال ہوچکا ہے تو اس وقت بھی یہ دعا کرو۔

والدین کے جانے کے بعد ”حسرت“

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص والدین کی زندگی میں اس نعمت کی قدر نہیں کر پاتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتنی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے۔ خاص طور پر جب والدین بوڑھے ہوگئے اور وہ کسی کام کے نہ رہے، تو اس وقت اس نعمت کی ناقدری کا اندیشہ ہوتا ہے، لیکن والدین کا سایہ بہت عظیم سایہ ہوتا ہے، اس لئے بسا اوقات والدین کے انتقال کے بعد آدمی کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنے والدین کی جیسی خدمت کرنی چاہئے تھی، جیسی عزت کرنی چاہئے تھی، جیسی محبت کرنی چاہئے تھی، میں نے نہیں کی اور میں نے ان کا حق ادا نہیں کیا۔ اللہ جل شانہ نے اس حسرت کی تلافی کا راستہ بھی رکھا ہے، وہ راستہ یہ ہے کہ ان کے حق میں یہ دعا کرو کہ:

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا

مرنے کے بعد عمل کا دروازہ بند

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاث ....الخ [1]

---

(۱) صحیح مسلم ۳ / ۱۲۵۵ (۱۶۳۱)

کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے سارے اعمال بند ہوجاتے ہیں، اب وہ ہزار کوشش کرلے کہ اس کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوجائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ آج ہم جو غفلت میں وقت گزار رہے ہیں، وہ اس لئے کہ ہمیں زندگی کے اوقات کی قدر نہیں ہے، زندگی کا ایک ایک لمحہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے وہ بڑا قیمتی ہے، اس کے ذریعہ ہم نیک اعمال کے خزانے جمع کرسکتے ہیں، جنت کماسکتے ہیں، لیکن جب ہم دنیا سے چلے گئے تو عمل کا ''باب'' بند ہوگیا، دفترِ عمل بند ہوگیا، اب ہزار حسرت کرو، کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ایک مرتبہ پھر دنیا میں بھیج دیجئے

قرآنِ کریم نے بیان فرمایا کہ بعض اوقات ایسا ہوگا کہ جب بندہ دنیا سے جائے گا تو وہ یہ درخواست کرے گا کہ یااللہ! مجھے ایک مرتبہ پھر دنیا میں بھیج دیجئے:

فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ [1]

وہاں جاکر خوب صدقہ کروں گا اور نیک بنوں گا۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا [2]

کہ جب بندے کی موت کا وقت آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کے لئے

---

(۱) سورۃ المنافقون: آیت (۱۰)

(۲) سورۃ المنافقون: آیت (۱۱)

بھی مہلت نہیں دیتا، اور اگر وہ بندہ کہتا ہے کہ مجھے دوبارہ بھیج دیجئے تا کہ نیک عمل کروں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ:

أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ [1]

کہ میں نے تمہیں اتنی عمر اتنی زندگی نہیں دی تھی کہ اس میں اگر کوئی شخص نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر لیتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا تھا، یعنی انبیاءِ کرام اور ان کے وارثین علماء، داعیان، مبلغین، یہ سب تمہیں ڈرانے کے لئے آتے رہے، اب تمہیں مزید مہلت نہیں مل سکتی، اب عمل کا دروازہ بند ہو چکا۔

علم کا فائدہ مرنے کے بعد ملتا ہے

لیکن حدیث شریف میں فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے اعمال میں اضافہ کرتی رہتی ہیں:۔

① ایسا علم انسان چھوڑ جائے جس سے لوگ فائدہ اُٹھاتے رہیں، مثلاً لوگوں کو علم سکھا دیا، تعلیم دے دی، تو جب تک لوگ اس علم پر عمل کرتے رہیں گے یا وہ لوگ دوسروں کو وہ علم پہنچاتے رہیں گے، اس کا ثواب پڑھانے والے کو ملتا رہے گا یا مثلاً کسی نے کوئی کتاب لکھ دی اور اس کتاب سے لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے تو جب تک لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچتا رہے گا، اس کے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

---

(۱) سورۃ الفاطر: آیت (۳۷)

صدقۂ جاریہ کا ثواب ملتا رہے گا

④ صدقۂ جاریہ۔ کوئی ایسا صدقہ چھوڑ کر چلا گیا، جس سے لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں، مثلاً کوئی مسجد بنادی، کوئی کنواں کھود دیا، کہیں پانی کا انتظام کر دیا، کوئی شفاخانہ، ہسپتال بنا دیا، کوئی بھی ایسی چیز جس سے آنے والے فائدہ اُٹھاتے رہیں، وہ چیز اس کے نامۂ اعمال میں اضافہ کرتی رہے گی۔

نیک اولاد، صدقۂ جاریہ ہے

③ نیک اولاد: ایسی نیک کوئی اولاد چھوڑ گیا جو اس کے لئے دُعا کرتی رہے، کیا دُعا کرتی ہو؟ یہ دُعا کہ ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا'' اور اس کے لئے ایصالِ ثواب کرتی ہو، کبھی تلاوت کر کے ایصالِ ثواب کر دیا، کبھی صدقہ کر کے ایصالِ ثواب کر دیا، کبھی نماز پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دیا، کبھی تسبیح کر کے ایصالِ ثواب کر دیا، ان سب کاموں کا ثواب بھی والدین تک اللہ کے فضل وکرم سے پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرشتے ان اعمال کو لے کر ان کے پاس جاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ تحفہ ہے جو فلاں شخص نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔

والدین کے لئے دُعا سب سے بڑی چیز ہے

لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ ایصالِ ثواب اپنی جگہ، اس کی حقانیت اپنی جگہ، لیکن والدین کے لئے ''دُعا'' سب سے بڑی چیز ہے، وہ یہ دُعا کہ ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا'' ایصالِ ثواب سے زیادہ دُعا کا فائدہ ہے، کیوں؟ اس لئے کہ مثلاً آپ نے ایک قرآنِ کریم کی تلاوت کی، اور اس کا ثواب

والدین کو بخش دیا یا ایک ہزار روپے صدقہ دے کر اس کا ثواب والدین کو بخش دیا، والدین کو کیا ملا؟ ایک ہزار روپے کا ثواب یا ایک قرآنِ کریم کا ثواب۔ لیکن جب تم نے یہ دعا کی ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيْرًا'' اے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما اور اپنی شان کے مطابق رحم فرما تو اب سارا صدقہ، سارا ایصالِ ثواب ایک طرف اور میرے پروردگار کا رحم ایک طرف۔

رحمان اور رحیم کا رحم

اس لئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایصالِ ثواب والدین کے لئے ضرور کرنا چاہئے، جتنا ایصالِ ثواب کروگے، تمہاری طرف سے فرشتے تحفوں کے پیکٹ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، لیکن زیادہ اہتمام دعا کرنے کا کرو اور قرآنِ کریم نے ہمیں چھوٹی سی دُعا سکھادی، وہ یہ کہ ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيْرًا'' اے پروردگار! ان پر رحم فرمایئے جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا، کس کا رحم؟ رحمان کا رحم، رحیم کا رحم۔ جس کے رحم سے بڑھ کر کسی کا رحم نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کا ایک فیصد حصہ ہے

حدیث شریف (۱) میں آتا ہے کہ ''رحم'' اللہ تعالیٰ کی ''رحمانیت'' کا ایک ٹکڑا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت تو غیر متناہی ہے، لیکن بندوں کو سمجھانے کے لئے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ''رحمت'' کے سو حصے کئے جائیں تو ان میں سے ایک حصہ

---

(۱) صحيح البخاری ۸ / ٦ (٥٩٨٨)

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے درمیان تقسیم فرمایا ہے، لہٰذا باپ بیٹے کے ساتھ جو رحم کرتا ہے، اس ایک فیصد میں داخل ہے، بیٹا باپ کے ساتھ، ماں اپنے بچوں کے ساتھ، پرندے جو اپنے بچوں کو چونچ کے ذریعہ کھلاتے ہیں، وہ سب اس ایک فیصد میں داخل ہے، لہٰذا باپ کی رحمت، ماں کی رحمت، دوست کی رحمت، بھائی کی رحمت، میاں بیوی کی آپس میں محبت اور رحمت۔ ساری کائنات میں جتنی رحمتیں ہیں، وہ سب صرف ایک فیصد ہے اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کا اور باقی ننانوے حصے اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔

''رحم'' میں ہر چیز شامل ہے

لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ سے یہ درخواست کرنا کہ یااللہ! مجھ پر رحم فرما، یا میرے والدین پر رحم فرما۔ یہ لامتناہی رحمتوں کی دعا ہے، اس میں ہر چیز آگئی، والدین کو مرنے کے بعد وہاں پر ان کو جن جن چیزوں کی حاجت ہے، وہ سب ان کو ملے گی، اگر مغفرت کی حاجت ہے وہ ملے گی، جنت کی نعمتیں ہیں وہ ملیں گی، جہنم سے نجات کی حاجت ہے وہ ملے گی، اور ان پر بے انتہا نعمتوں کا نزول ہوگا۔

ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب

بہرحال! معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے پاس بلاکر جو احکام دینے تھے اور جو ہدایات دینی تھیں، ان ہدایتو ں کا آغاز توحید سے کیا اور توحید کے بعد سب سے پہلے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

سے کیا اور ہماری شریعت کتنی آسان ہے کہ والدین کی خدمت کرنے کا اور ان کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھ لینے کا ثواب ایک حج اور ایک عمرہ کے ثواب کے برابر ہے، بس والدین کو محبت کی نگاہ سے دیکھو، اور ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب گھر بیٹھے بیٹھے حاصل کرلو۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کتنی عظیم چیز بنادی ہے۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں موجود ہیں، اور مسلمان ہیں اور وہ چاہتے بھی ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کی زیارت کروں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت وہ سعادت اور خوش نصیبی ہے کہ شاید اس روئے زمین پر اس سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی کوئی اور نہیں ہوگی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جائیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانے کے بعد یہ شرف حاصل نہیں ہوسکتا۔ لیکن حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں لیکن میری والدہ بیمار ہیں اور ان کو میری خدمت کی ضرورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حاضر ہونے سے منع فرمادیا اور یہ فرمایا کہ تم یہاں میری زیارت اور ملاقات کے لئے مت آؤ، بلکہ والدہ کی خدمت کرو۔ (۱)

بھلا بتلائیے! کیسا بھی صاحبِ ایمان ہو، اس کے دل میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کا کتنا شوق ہوگا۔ اور جب آپ اس دنیا میں

---

(۱) صحیح مسلم ٤ / ١٩٦٩ (٢٥٤٢)

بقیدِ حیات تھے، اس وقت آپ سے ملاقات اور آپ کی زیارت کے شوق کا کیا عالم ہوگا جب کہ آج یہ حالت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لئے کتنے بیتاب اور بے چین رہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حاضری ہوجائے اور روضۂ اقدس کی زیارت ہوجائے، لیکن آپ کی زیارت کے شوق، اس کی بے چینی اور بیتابی کو ماں کی خدمت پر قربان کردیا، آپ نے حکم فرمادیا کہ ماں کی خدمت کرو اور میری زیارت اور ملاقات کی سعادت کو چھوڑ دو۔ چنانچہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اس سعادت کو چھوڑ دیا، جس کے نتیجے میں ''صحابیت'' کا مقام چھوٹ گیا، اس لئے کہ ''صحابیت'' کا درجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور زیارت پر موقوف ہے اور ''صحابی'' وہ مقام ہے کہ کوئی شخص ولایت اور بزرگی کے چاہے کتنے بڑے مقام پر پہنچ جائے، مگر وہ کسی ''صحابی'' کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔

ماں کی خدمت کرتے رہو

بہرحال! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو یہ فرمادیا کہ ہماری زیارت کی ضرورت نہیں اور ''صحابیت'' کا مقام حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ماں کی خدمت کرو۔ اگر ہم جیسا کوئی نااُداشناس ہوتا تو یہ کہتا کہ یہ ''صحابیت'' کی دولت بعد میں تو ملنے والی نہیں، اگر ماں بیمار ہے تو کیا ہوا؟ کسی نہ کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنا ہوتا ہی ہے، اس لئے اس ضرورت کے تحت گھر سے چلے جاؤ اور جاکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرکے واپس آجاؤ، مگر وہاں تو اپنا شوق پورا کرنا پیشِ نظر نہیں تھا، اپنی ذاتی خواہش پوری نہیں کرنی تھی،

بلکہ وہاں تو صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا شوق تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو چھوڑ دیا اور گھر میں ماں کی خدمت میں لگے رہے، حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا اور حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کر سکے۔

ماں کی خدمت کا صلہ

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو ماں کی خدمت کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے عمر! کسی زمانے میں ''قرن'' یعنی یمن کے علاقے سے ایک آدمی مدینہ آئے گا، جس کے یہ اوصاف اور یہ حلیہ ہوگا، جب یہ آدمی تمہیں مل جائے تو اے عمر! اپنے حق میں ان سے دعا کرانا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دُعائیں قبول فرمائیں گے۔

چنانچہ روایات [1] میں آتا ہے کہ جب بھی یمن سے کوئی قافلہ مدینہ طیبہ آتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جا کر ان سے سوال کرتے کہ اس قافلے میں اویس قرنی نامی کوئی شخص ہیں؟ جب ایک مرتبہ قافلہ آیا اور آپ کو معلوم ہوگیا کہ اس میں اویس قرنی تشریف لائے ہیں تو آپ بہت خوش ہوئے، جا کر ان سے ملاقات کی اور ان کا نام دریافت کیا اور جو حلیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا وہ حلیہ بھی موجود تھا، تو پھر آپ نے ان سے درخواست کی کہ آپ میرے حق میں دُعا فرمائیں۔ حضرت اویس قرنی نے سوال کیا کہ آپ مجھ سے دعا کرانے کیوں کر تشریف لائے؟ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ

---

(۱) صحیح مسلم ٤ / ١٩٦٩ (٢٥٤٢)

وصیت فرمائی تھی کہ جب ''قرن'' سے یہ صاحب آئیں تو ان سے اپنے حق میں دعا کرانا۔ اللہ تعالیٰ ان کی دُعا کو قبول فرمائیں گے۔ جب حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے یہ سنا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ نسبت عطا فرمائی۔

دیکھئے! حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی سے یہ کہا جارہا ہے کہ اپنے حق میں دعا کراؤ۔ یہ چیز ان کو کس طرح حاصل ہوئی؟ یہ چیز ان کو والدہ کی خدمت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی بدولت حاصل ہوئی۔ انہوں نے دیکھا کہ میرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے جس کام کا حکم دیا ہے، اب میں اس پر عمل کروں گا چاہے کچھ بھی ہوجائے۔

والدین کی خدمت

ایک اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آکر عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں جہاد کروں، اور جہاد سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہوجائیں اور اس پر مجھے اجر وثواب عطا فرمائیں۔ صرف اسی غرض کے لئے جہاد میں جانا چاہتا ہوں، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم واقعی ثواب حاصل کرنے کے لئے جہاد کرنا چاہتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، جی ہاں! یارسول اللہ! میں صرف ثواب حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہارے واُلدین زندہ ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے والدین زندہ ہیں، آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور جا کر ان کی

خدمت کرو، اس لئے کہ اگر تمہیں اَجر حاصل کرنا ہے تو پھر والدین کی خدمت کر کے تمہیں جو اَجر حاصل ہوگا وہ اَجر جہاد سے بھی حاصل نہیں ہوگا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ:

فَفِيْهِمَا فَجَاهِدْ

یعنی جا کر ان کی خدمت کر کے جہاد کرو، ان روایات میں والدین کی خدمت کو جہاد سے بھی زیادہ فوقیت عطا فرمائی۔ (۱)

جا کر ماں باپ کو ہنساؤ

دیکھئے! اس حدیث میں اپنے ساتھ جہاد کرنے کی فضیلت کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک پر قربان کر دیا اور ان کو واپس فرما دیا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ جہاد کی تیاری ہو رہی تھی، ایک صاحب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں جہاد میں شریک ہونے کے لئے آیا ہوں اور فخر کے طور پر بیان کیا کہ میں جہاد میں شرکت کرنے کا اتنا سچا طالب ہوں کہ جہاد میں شرکت کے لئے اپنے والدین کو روتا چھوڑ کر آیا ہوں، مطلب یہ تھا کہ میرے والدین مجھے نہیں چھوڑ رہے تھے اور مجھے جہاد میں شرکت کی اجازت نہیں دے رہے تھے، لیکن اس کے باوجود میں ان کو اس حالت میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ میری جدائی کی وجہ سے رو رہے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا:

---

(۱) صحيح البخاري ٤ / ٥٩ (٣٠٠٤) و٨/ ٣ (٥٩٧٢)

اِرْجِعْ فَأَضْحِكْهُمَا كَمَا أَبْكَيْتَهُمَا[1]

واپس جاؤ اور ان کو جس طرح روتا چھوڑا تھا، اب جا کر ان کو ہنساؤ اور ان کو راضی کرو۔ تمہیں میرے ساتھ جہاد پر جانے کی اجازت نہیں۔

مجھے جلدی مت بھول جانا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب میرے والد بوڑھے ہوگئے اور میرے والد ہمارے دادا کے اکلوتے بیٹے تھے، کوئی آپ کا حقیقی بھائی نہیں تھا، البتہ والد صاحب اور بہنیں تھیں۔ والد صاحب ہمارے دادا کی بڑی خدمت فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن دادا نے میرے والد صاحب سے فرمایا کہ "میاں شفیع" لوگ والدین کو مرنے کے بعد بھول تو جایا کرتے ہیں، مگر میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ مجھے جلدی مت بھولنا۔ مطلب یہ تھا کہ کچھ عرصہ تک تو ایصالِ ثواب کرتے رہنا، دُعائیں کرتے رہنا، والد صاحب ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ ان کے یہ الفاظ آج بھی کان میں گونجتے ہیں اور دل پر نقش ہوگئے ہیں، الحمدللہ! کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ ان کے لئے کچھ نہ کچھ ایصال نہ کرتا ہوں اور دُعا نہ کرتا ہوں۔

والدین سے ملنے جلنے والوں سے حسنِ سلوک

لہٰذا اگر کسی کے والدین رخصت ہوگئے ہوں اور اس کے دل میں یہ حسرت ہو کہ میں ان کا حق ادا نہیں کرسکا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے کھولے ہوئے

(۱) سنن أبي داؤد ۳ / ۲۹۳ (۲۵۲۰) وسنن ابن ماجه ٤ / ۳۲٦ (۲۷۸۲)

ہیں، ایصالِ ثواب کا راستہ، دعا کا راستہ اور ایک تیسرا راستہ یہ کھولا ہوا ہے کہ والدین کے جو خاص ملنے جلنے والے تھے یا ان کے خاص عزیز واقارب تھے، ان کے ساتھ صلہ رحمی کا برتاؤ کرو، مثلاً ان کے بھائی، بہن ہیں، ان کے دوست واحباب ہیں، ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے سے بھی ان کو فائدہ پہنچتا ہے اور ان کو خوشی ہوتی ہے۔

خلاصہ

بہرحال! جن کے والدین زندہ ہیں، اللہ تعالیٰ صحت اور عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے، آمین۔ والدین کی زندگی کو بہت بڑی غنیمت سمجھنا چاہئے، جنت کمانے کا بہترین راستہ والدین کی خدمت ہے اور جن کے والدین فوت ہوچکے یا کوئی ایک فوت ہوچکا، اس کی تلافی ایصالِ ثواب سے کریں اور اس دعا کے ذریعہ کریں کہ:

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا

بتایئے! اس جملے کو زبان سے ادا کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ اس میں کیا محنت ہوتی ہے؟ کیا خرچ ہوتا ہے؟ یہ دُعا بار بار تسلسل کے ساتھ کرتے جاؤ تو جو والدین کے حقوق میں کوتاہیاں ہوچکی ہیں، ان شاء اللہ اس کی تلافی ہوتی چلی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس نعمت کی قدر کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دعا نمبر ١٧

رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۱۷

رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ''مناجاتِ مقبول'' کی قرآنی دُعاؤں کی تشریح کرنے کا سلسلہ چل رہا ہے، آگے یہ دُعا آئی ہے:

رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا (۱)

یہ بھی ان قرآنی دُعاؤں میں سے ہے جو خود اللہ تعالیٰ بندے سے کہلوا رہے ہیں کہ تم یوں کہو۔ یہ بھی عجیب وغریب دعا ہے، اس دعا کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ:

(۱) سورۃ الاسراء: آیت (۸۰)

اے میرے پروردگار! مجھے جہاں بھی آپ داخل کریں تو اچھائی کے ساتھ داخل کریں اور جہاں بھی نکالیں تو اچھائی کے ساتھ نکالیں، اور مجھے اپنی طرف سے ایسی طاقت عطا فرمادیجئے جس کی آپ کی طرف سے مدد کی جاتی ہو۔

اچھائی کے ساتھ نکلوں، اچھائی کے ساتھ داخل ہوں

مطلب یہ کہ میں جہاں بھی داخل ہوں، چاہے گھر میں داخل ہوں یا کسی مکان میں یا دوکان میں یا کسی شہر میں داخل ہوں تو داخل بھی اچھی طرح ہوں اور جب وہاں سے نکلوں تو اچھی طرح نکلوں، یعنی داخل جب ہوں تو کسی رکاوٹ اور پریشانی کے بغیر آسانی کے ساتھ داخل ہوجاؤں اور جب نکلوں تو اس طرح نکلوں کہ میں جس مقصد کے لئے گیا تھا، وہ مقصد پورا ہوجائے اور مجھے نکلنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہ آئے اور مجھے اے اللہ! اپنی طرف سے ایسی طاقت عطا فرمادیجئے کہ جس کے ساتھ آپ کی مدد شامل ہو۔ اس لئے کہ اگر طاقت تو مل گئی، لیکن اس کے ساتھ آپ کی مدد نہیں ہے اور آپ کی طرف سے اس طاقت کو صحیح استعمال کرنے کی توفیق نہیں ہے تو وہ طاقت بیکار ہے، لہٰذا ایسی طاقت عطا فرمایئے جس کے ساتھ آپ کی مدد ہو۔

ہر جگہ اچھائی کی ضرورت ہے

اس دعا کا ایک خاص پسِ منظر ہے جو میں بعد میں عرض کروں گا، لیکن اس دُعا کا جو ظاہری مفہوم ہے، وہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں کہیں نہ کہیں داخل ہو رہا ہوتا ہے اور کہیں نہ کہیں سے نکل رہا ہوتا ہے، مثلاً جب آدمی گھر میں

داخل ہو رہا ہے تو اس وقت بھی اس کو خیریت اور عافیت اور اچھائی چاہئے، لہٰذا جب وہ گھر میں داخل ہو تو منظر اچھا نظر آئے، گھر والے اور بچے خوش وخرم ہوں، عافیت سے ہوں۔ اسی طرح جب وہ گھر سے نکل رہا ہو تو اس وقت بھی عافیت چاہئے کہ جس کام کے لئے میں نکل رہا ہوں مجھے اس میں کامیابی ہوجائے۔ اگر آدمی کسی جگہ ملازم ہے اور اپنی ملازمت کی جگہ میں داخل ہو رہا ہے تو وہاں پر بھی اس کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اچھائی کے ساتھ داخل ہو، اس کا ماحول درست ہو اور اس کے فرائضِ منصبی ہیں وہ ان کو ٹھیک طریقے سے بجالا سکے اور جب وہ دفتر سے نکل رہا ہے تو اس وقت بھی اس کو عافیت اور خیریت کی ضرورت ہے۔

مدرسہ، اسکول، کالج میں اچھائی کی ضرورت

اگر کوئی طالبِ علم مدرسہ میں پڑھنے کے لئے داخل ہو رہا ہے یا اسکول میں یا کالج میں پڑھنے کے لئے داخل ہو رہا ہے تو اس کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ میرا داخلہ آسان ہوجائے اور جس مقصد کے لئے داخل ہو رہا ہوں، اس میں مجھے کامیابی حاصل ہوجائے اور جو سبق پڑھوں وہ اچھی طرح میری سمجھ میں آجائے اور مجھے یاد بھی رہے اور جب نکلوں تو میں اچھائی کے ساتھ اسکول سے نکلوں۔ ہسپتال میں علاج کے لئے داخل ہو رہا ہوں تو میں اچھائی کے ساتھ داخل ہوں اور کوئی اچھا ڈاکٹر مل جائے اور اللہ تعالیٰ اس ڈاکٹر کے دل میں صحیح دوا تجویز کردے اور وہ دوا میرے لئے مؤثر اور مفید ہوجائے، جب ہسپتال سے نکلوں تو صحت یاب ہو کر نکلوں۔

جب بھی کسی جگہ داخل ہو، یہ دُعا مانگ لیا کرو

غرض یہ کہ اگر آدمی اپنی شب وروز کی زندگی میں غور کرے تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ وہ کسی وقت کہیں نہ کہیں داخل ہورہا ہوتا ہے اور کہیں نہ کہیں سے نکل رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جامع دُعا ہمیں تلقین فرمادی کہ جب بھی کسی جگہ داخل ہورہے ہوں تو یہ دُعا مانگ لیا کرو ''رَبِّ أَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِیْ مِنْ لَدُنْکَ سُلْطَانًا نَصِیْرًا'' یا آپ سواری پر بیٹھ کر کہیں سفر پر جارہے ہوں یا ٹرین میں بیٹھ رہے ہوں یا بس میں بیٹھ رہے ہوں یا ہوائی جہاز میں بیٹھ رہے ہوں تو اس وقت یہ دُعا پڑھو

رَبِّ أَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ... الخ

اس دعا کو اپنا وظیفہ بنالو

یوں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہر موقع کے لئے ایک دُعا تلقین فرمادی ہے مثلاً یہ کہ جب سواری پر بیٹھوتو یہ دُعا پڑھو:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ○ وَإِنَّا إِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۱)

اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ (۲)

---

(۱) سورۃالزخرف:آیت (۱۳ - ۱٤)

(۲) صحیح مسلم ۲ / ۹۷۸ (۱۳٤۲)

وہ سب دُعائیں تو اپنی جگہ ہیں، لیکن یہ عام دُعا ایسی ہے کہ جب بھی کہیں داخل ہورہے ہوں تو اللہ تعالیٰ سے داخلے کی اچھائی بھی مانگو اور وہاں سے نکلنے کی اچھائی بھی مانگو، یہ نہ ہو کہ اندر داخل ہوکر کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ اس لئے ہر انسان کو اس دعا کو اپنا وظیفہ بنانا چاہئے، ہر اس موقع پر جب انسان کسی نئی چیز میں داخل ہورہا ہو، اس وقت یہ دُعا مانگنی چاہئے۔

طاقت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اللہ کی مدد کی ضرورت

اس دُعا میں آخری جملہ یہ ہے کہ:

وَاجْعَلْ لِیْ مِنْ لَدُنْکَ سُلْطَانًا نَصِیْرًا

یعنی اے اللہ! مجھے اپنی طرف سے ایک طاقت اور قوت عطا فرمائیے۔

دیکھئے جب بھی انسان کسی جگہ میں داخل ہوتا ہے تو داخل ہوکر فائدہ اُٹھانے کے لئے کسی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً آپ کسی ہسپتال میں داخل ہورہے ہیں تو آپ کے پاس ڈاکٹر کی فیس اور ہسپتال کے اخراجات کی رقم ہونی چاہئے، تاکہ آپ ہسپتال میں ڈاکٹر سے اپنا علاج کراسکیں، لہٰذا ہر کام میں طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن کوئی طاقت اس وقت تک کارآمد نہیں ہوسکتی، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے ساتھ شامل نہ ہو، مثلاً ایک شخص بڑا کڑیل جوان ہے، طاقتور ہے، لیکن اگر اللہ جل شانہ کی توفیق نہ ہو تو اس کی طاقت بیکار ہے، وہ اپنی طاقت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاسکتا۔

اپنی طاقت اور صلاحیت پر اِتراؤ نہیں

اور پھر اس دُعا میں صرف طاقت نہیں مانگی کہ مجھے طاقت دیدیجئے، بلکہ ایسی طاقت دیدیجئے جس کے ساتھ آپ کی مدد ہو۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ سکھادیا کہ کبھی بھی اپنی طاقت اور صلاحیت پر اِتراؤ نہیں، اکڑو نہیں، وہ طاقت چاہے جسمانی طاقت ہو، ذہنی طاقت ہو، علمی طاقت ہو، اس طاقت پر اگر اِتراہٹ میں مبتلا ہوگئے کہ میں بڑا طاقتور ہوں اور میں ساری دنیا کا مقابلہ کرسکتا ہوں اور میرا یہ کمال ہے اور یہ میری طاقت ہے تو وہ طاقت وقوت سب بیکار ہے اور وہ طاقت اس وقت تک کارآمد نہیں، جب تک اللہ جل شانہ کی مدد اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔

علماء کے لئے بڑا عظیم سبق

اس میں ہم جیسے طالب علموں کے لئے بھی بڑا عظیم سبق ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں لکھنے، پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی استعداد دے دی ہے، اگر اس پر گھمنڈ ہوگیا کہ میں بڑا عالم ہوں، بڑا تعلیم یافتہ ہوں اور اس گھمنڈ کے ساتھ تم نے اس استعداد کو استعمال کرنا شروع کیا تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے اور اس صورت میں اللہ کی مدد شاملِ حال نہیں ہوتی۔ اور پھر یہی علم انسان کو گمراہیوں کی وادی میں لے جاتا ہے، لیکن اگر علم پر ناز نہ ہو، گھمنڈ نہ ہو، بلکہ دل میں یہ استحضار ہو کہ جو کچھ علم اور استعداد ہے یہ سب اللہ جل شانہ کی عطا ہے، میرے پاس کوئی طاقت نہیں ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد میرے ساتھ نہیں ہوگی، اس وقت تک میرا یہ علم کارآمد نہیں ہوگا۔

حق کے متلاشی کو گھمنڈ نہیں ہوتا

ایسا شخص جب حق کی تلاش میں نکلتا ہے تو اس کو اپنے علم پر گھمنڈ نہیں ہوتا، بلکہ ایسے شخص کو رجوع الی اللہ کی توفیق ہوتی ہے اور اس کو اس دعا کی توفیق ہوتی ہے کہ یااللہ! یہ مسئلہ میرے سامنے آگیا ہے، اے اللہ! آپ ہی اپنی رحمت سے مجھے حق کی ہدایت عطا فرمایئے:

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا، وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی دُعا

حضرت علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے علماء میں سے تھے، ان سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے علم میں کسی کو کوئی کلام نہیں۔ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا علم میں اتنا اُونچا مقام ہے کہ اگر اس کی طرف کوئی سر اُٹھا کر دیکھے تو اس کی ٹوپی گر جائے، لیکن جب کسی مسئلے کی تحقیق کی ضرورت ہوتی تحقیق شروع کرنے سے پہلے یہ دعا کرتے کہ:

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْنِیْ كَمَا عَلَّمْتَ جِبْرَئِیْلَ

اے اللہ! مجھے ایسا علم عطا فرمایئے، جیسا علم آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔

یعنی ان کے ذریعہ انبیاء پر وحی نازل ہوتی تھی، تو آپ ان کے ذریعہ میرے دل پر ایسی بات نازل فرما دیجئے جو آپ کی رضا کے مطابق ہو۔

رجوع الی اللہ سے اللہ کی مدد آجاتی ہے

یاد رکھئے! جس شخص کو اپنے علم پر گھمنڈ ہوتا ہے اس کو رجوع الی اللہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی، وہ تو اپنے علم پر ناز کر کے چلتا ہے، لیکن جس شخص کو رجوع الی اللہ کی توفیق ہوتی ہے تو وہ ''سلطانًا نصیرًا'' کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے، یعنی وہ قوت ایسی ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد ہے، بہرحال! یہ عجیب وغریب دعا ہے کہ ''رَبِّ أَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَ أَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِیْ مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِیْرًا'' یہ تو اس دعا کا سادہ سا مطلب میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا۔

اصل مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں اس دُعا کا وظیفہ بنالیں۔

حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت

اب اس دعا کا پسِ منظر سنئے کہ یہ آیت کس موقع پر نازل ہوئی تھی؟ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا تھا، جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اعلانِ نبوت کے بعد کافروں نے مسلمانوں پر مکہ مکرمہ میں عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور طرح

طرح کی اذیتوں اور طرح طرح کی تکلیفوں سے مسلمانوں کو سابقہ تھا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں رہنا بہت مشکل ہوگیا تھا، اس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت کی اجازت دی، بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے۔

مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت

پھر بعد میں جب مدینہ منورہ کے لوگوں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاہدہ ہوگیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی تعداد مدینہ منورہ کی طرف حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے ہجرت کر گئی۔ کفارِ قریش جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن تھے، ان کو یہ خیال ہوا کہ آپ کے صحابہ تو ایک ایک کر کے مکہ مکرمہ چھوڑ کر جارہے ہیں اور مکہ مکرمہ مسلمانوں سے خالی ہورہا ہے، اب ظاہر یہ ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی کچھ عرصہ کے بعد یہاں سے تشریف لے جائیں گے۔

دارالندوہ میں کفار کی مشاورت

چنانچہ انہوں نے ایک ''مجلسِ شوریٰ'' بنائی اور آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ ان کی ایک مجلس ''دارالندوہ'' کہلاتی تھی، اور جس جگہ حطیم ہے اس کے بالمقابل بالکل سامنے وہ ''دارالندوہ'' تھا جس میں وہ لوگ جمع ہوتے تھے، اس ''دارالندوہ'' میں سب کو جمع کیا اور یہ مشورہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اب شاید مکہ مکرمہ سے نکل کر چلے جائیں گے اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ جہاں جاتے ہیں لوگ

ان کے پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں، ان کا معاملہ دن بدن آگے بڑھے گا، اب بتاؤ کیا کرنا چاہئے؟

گرفتار کرلو، یا جلاوطن کردو

کسی نے یہ مشورہ دیا کہ ان کو گرفتار کرلیا جائے۔ دوسروں نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر ان کو گرفتار کروگے تو جتنے مسلمان ہیں، وہ سب ان کے گرد آکر جمع ہوجائیں گے اور ہمارے لئے مصیبت کھڑی کریں گے، لہٰذا گرفتار کرنے سے معاملہ حل نہیں ہوگا۔ بعض لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ ان کو جلاوطن کردو، ان کو یہاں سے نکال دو، کسی دوسرے ملک میں بھیج دو، وہاں جا کر رہیں، تو ہم ان کے دین سے محفوظ ہوجائیں گے، اس کے جواب میں دوسروں نے کہا کہ ہم تو یہاں اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اگر یہ باہر جائیں گے تو ان کے اِردگرد بہت سے لوگ جمع ہوجائیں گے اور ان کو اپنا دین پھیلانے میں اور مدد ملے گی، اس سے کوئی فائدہ نہیں۔

ان کو قتل کردو

تیسرے شخص نے تیسری رائے دی کہ اس کا کوئی راستہ نہیں ہے تو پھر اس کو قتل کردو۔ اس رائے پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ اگر تم ان کو قتل کروگے تو ان کا قبیلہ ان کا انتقام لئے بغیر نہیں چھوڑے گا، لہٰذا ''قبیلہ بنو عبد مناف'' والے اُن کا قصاص لیں گے، چنانچہ اس کے نتیجے میں ہمارے آدمی بھی قتل کئے جائیں گے۔

ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک نوجوان مل کر قتل کرے

چوتھے نمبر پر ایک شخص نے یہ رائے دی کہ اس شخص کے بارے میں بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ ''شیطان'' تھا جو کسی نجدی کے بھیس میں اس مجلس کے اندر موجود تھا۔ واللہ اعلم۔ اس نے کہا کہ آپ لوگ جو باتیں کررہے ہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، نہ گرفتار کرنے سے فائدہ ہوگا اور نہ جلاوطن کرنے سے فائدہ ہوگا، نہ تنہا قتل کرنے سے ہوگا، بلکہ ایسا کرو کہ مکہ مکرمہ میں جتنے قبیلے ہیں ان میں سے ہر قبیلے کے ایک نوجوان کا انتخاب کرو اور وہ سب نوجوان مل کر ایک ہی بار میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کریں اور آپ کو۔ معاذ اللہ!۔ قتل کردیں۔ اور جب قتل کرنے میں بہت سے قبیلوں کے لوگ شامل ہوں گے تو ''قبیلہ بنو عبد مناف'' کس کس قبیلے سے قصاص لیں گے؟ اس قبیلے کو یہ طاقت نہیں ہوگی کہ وہ سب سے قصاص لے۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔

آپ کے گھر کا محاصرہ

چنانچہ ہر قبیلے سے ایک ایک نوجوان کا انتخاب کیا گیا، اور بڑے بڑے سردار بھی ساتھ شامل ہوئے، اس میں ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ بھی شامل تھے، اور انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ ہم آج رات ہی یہ کام کریں گے کہ آپ کے گھر کا محاصرہ کرکے آپ کو قتل کردیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ چاروں طرف دشمنوں نے محاصرہ کیا ہوا ہے، سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا، باوجودیکہ مکہ کے لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن

تھے، مگر آپ کو ''صادق وامین'' سب مانتے تھے، لہٰذا لوگ اپنی امانتیں لاکر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھوایا کرتے تھے کہ ان سے زیادہ امانتدار کوئی نہیں، انہی کے پاس امانتیں رکھوائیں، جب ضرورت ہوگی، ان سے واپس لے لیں گے، لہٰذا ہجرت سے پہلے آپ کو یہ فکر تھی کہ کسی طرح یہ امانتیں میں امانتداروں تک پہنچادوں۔[1]

اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لٹانا

آپ ذرا اندازہ لگائیں کہ وہ لوگ جو کافر ہیں، آپ کے خون کے پیاسے ہیں اور آپ کے گھر کا محاصرہ کررکھا ہے اور قاتلانہ حملہ کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر اِن کافروں کی جو اَمانتیں ہیں، ان کی فکر اپنی جان سے زیادہ ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ساری امانتیں ان کے حوالے کیں اور کہا کہ جب میں چلا جاؤں توتم یہ ساری امانتیں ان تک پہنچادینا، اور فرمایا کہ تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ، ڈرنا نہیں اور کوئی بھی تمہارا بال بیکا نہیں کرسکے گا -ان شاء اللہ- چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اتنے بہادر تھے، لیکن چونکہ اس وقت تک کافروں کا جواب دینے، ان پر حملے کرنے اور ان کے خلاف جہادکرنے یا ان کو قتل کرنے کا حکم اس وقت تک نہیں آیا تھا، بلکہ حکم یہ تھا کہ کوئی تم پر ہاتھ اُٹھائے توتم جواب مت دو، کوئی تلوار اُٹھائے تو جواب مت دو، بلکہ صبر کرو، صبر کرو، ۱۳/ سال تک یہی حکم رہا کہ:

---

(۱) مسند أحمد ٥ / ٣٠١ (٣٢٥١) و دلائل النبوة للبيهقى ٢ / ٤٦٨ وتاريخ الاسلام للذهبى ١ / ١٨٧ وسيرة ابن هشام ٢/٩٠.

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ (1)

ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا انسان جن کو اللہ تعالیٰ نے شجاعت، قوت، طاقت عطا فرمائی تھی، شاید اگر اکیلے بھی گھر سے نکل جاتے تو تمام محاصرے والوں کو بھگا دیتے، لیکن اللہ کا حکم یہ تھا کہ ابھی تلوار نہیں اُٹھانی۔

سورہ یٰسین کی آیت پڑھتے ہوئے باہر آگئے

بہرحال! حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹادیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے باہر نکلے، جبکہ چاروں طرف سے کافروں نے محاصرہ کیا ہوا ہے، اور اس وقت آپ کی زبانِ مبارک پر سورہ یٰسین کی یہ آیت تھی:

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (2)

یعنی ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار کھڑی کردی ہے اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار کھڑی کردی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے اور ان کو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔

یہ آیت پڑھتے ہوئے گھر سے باہر نکلے اور محاصرہ کرنے والوں میں ابوجہل، ابولہب، امیہ بن خلف وغیرہ جیسے بڑے بڑے سردار شامل تھے، لیکن آپ کے نکل جانے کا کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔

---

(1) سورۃ النحل: آیت (127)

(2) سورۃ یس: آیت (9)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رفاقت کا شرف

اور وہاں سے نکل کر سیدھے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، اس لئے کہ سفرِ ہجرت میں رفاقت کا شرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہونا تھا، اس موقع پر دو آیات نازل ہوئیں، ایک آیت سورۂ انفال میں ہے کہ:

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللهُ وَاللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۱)

اس وقت کو یاد کرو، جب کافر لوگ آپس میں یہ تدبیریں کررہے تھے کہ آپ کو گرفتار کرلیں یا آپ کو قتل کردیں یا آپ کو جلاوطن کردیں، وہ لوگ اپنی تدبیریں کررہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیریں کررہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر سب سے اعلیٰ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہم دعا کی تلقین

اور دوسری یہ آیت بھی اسی موقع پر نازل ہوئی کہ:

قُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا

اب ذرا غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرنی تھی اور یہ مدد کرنا تقدیر میں لکھا ہوا تھا اور جو پہلی آیت سورۂ انفال میں آئی ہے،

---

(۱) سورۃ الأنفال: آیت (۳۰)

اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ واضح کردیا تھا کہ کفار کی یہ ساری تدبیریں ناکام ہوں گی اور ہم تمہاری مدد کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تم ہم سے یہ کہو:

رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ ....الخ

اس کے ذریعہ یہ بتایا جارہا ہے کہ بیشک تقدیر اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لی ہوئی ہے اور فیصلہ وہی کرتا ہے، لیکن تمہاری بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ اگرچہ تم کو یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، لیکن تم پھر بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی کوئی مشکل پیش آئے تو تم اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

یقین ہونے کے باوجود دعا کرنا

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات ایک جگہ بیان فرمائی ہے کہ آپ کو پیاس لگ رہی ہے اور آپ سے کسی نے پانی منگوایا اور وہ شخص پانی لے کر آرہا ہے، بہتر تو یہ ہے کہ جب پیاس لگے، اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور یہ کہے کہ یا اللہ! پیاس لگ رہی ہے، پانی پلوادیں، بہرحال! آپ کے لئے ایک شخص پانی لا رہا ہے اور آپ کو اپنی آنکھوں سے نظر آرہا ہے کہ وہ شخص پانی لا رہا ہے، اس بات میں کوئی شبہ ہے کہ پانی نہیں ملے گا؟ بظاہر کوئی شبہ نہیں ہے، فرمایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا اور کہنا کہ یا اللہ! جو پانی لا رہا ہے، وہ پانی مجھ تک پہنچ جائے اور میں پی لوں، لہٰذا جب انسان کو پکا یقین ہو کہ میرا یہ مقصد حاصل ہوجائے گا، تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا یہ بندگی کا تقاضا ہے۔

سب کچھ طے ہونے کے باوجود دعا کا حکم

یہاں پر بھی اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے شر سے محفوظ رہیں گے اور اس بات کا یقین تھا کہ آپ ان شاء اللہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور ہجرت کا عمل بھی پورا ہوگا اور آپ مدینہ منورہ میں داخل بھی ہوں گے اور وہاں پر آپ کا استقبال بھی کیا جائے گا اور مدینہ منورہ کے لوگ آپ کے تابع فرمان بھی بنیں گے، سب کچھ طے تھا، لیکن اس کے باوجود ہجرت کے لئے روانہ ہونے سے پہلے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ ہم سے یہ کہو:

رَبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ

اس کے ذریعہ اشارہ اس طرف فرمادیا کہ تم رسول تو ہو، لیکن تم پہلے ہمارے بندے ہو:

وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ

تمہارے تمام درجات ایک طرف، تمہارے تمام مراتب ایک طرف، لیکن یہ کہ تم ہمارے ''بندے'' ہو، یہ مقام تمام مقامات سے اعلیٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی انتظام

لہٰذا بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ ان حالات میں بھی جبکہ تم کو پکا یقین ہے کہ ہم تمہاری مدد کریں گے، تب بھی ہم سے مانگو۔ یہ بات کسی محبت والے ہی کے سمجھ میں آسکتی ہے، جس کے دل میں ''عشق'' کی بھٹی سلگ رہی ہو، اس کا لطف وہی جانتا ہے، ''بندگی'' جو عشق کا بھی ایک اعلیٰ درجہ ہے، جب آدمی اس درجہ کا

تصور کرے تو جھوم جاتا ہے کہ اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ نے سارا انتظام کر رکھا ہے، لوگوں کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے جائیں گے، جب آپ ''غارِثور'' میں جا کر قیام کریں گے تو مکڑی اس کے منہ پر جال تن دے گی، کبوتر انڈے دیدیں گے اور جاہلیت کے لوگ اس غار تک پہنچیں گے، مگر یہ دیکھ کہ یہاں تو مکڑی نے جالا تنا ہوا ہے، واپس لوٹ جائیں گے اور پہلے سے ایک ''راہبر'' سے تعلق ہوگیا تھا، وہ آپ کو ایسے راستے سے مدینہ منوّرہ لے جائے گا جو عام راستے سے ہٹا ہوا ہے، مدینہ والے آپ کا استقبال کررہے ہوں گے اور بچے بچیاں وہاں پر یہ ترانہ پڑھیں گے کہ:

طَلَعَ الْبَــدْرُ عَلَيْنَا ... مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعْ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا ... مَا دَعا لِلّٰهِ دَاعْ[1]

یہ سارا منظر اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور یہ سب کچھ طے تھا، لیکن اس کے باوجود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ کہا جارہا ہے کہ کہو:

رَبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ
وَاجْعَلْ لِيْ مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيْرًا

چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت یہ دُعا مانگی۔

''اللّٰھم'' کے بجائے لفظ ''رب'' سے آغاز

ایک بات اور سمجھنے کی ہے، وہ یہ کہ اس دعا کے آغاز میں لفظ ''اللّٰھم''

(۱) ملاحظہ فرمائیں: السيرة النبوية واخبار الخلفاء لابن حبان ١ / ١٢٧

نہیں آیا، جبکہ عام طور پر جب دعا کی جاتی ہے تو ''اللّٰھم'' اے اللہ! کہہ کر دعا کی جاتی ہے، لیکن یہاں پر لفظ ''رب'' آیا ہے، یعنی اے میرے پروردگار۔ لیکن لفظ ''رب'' سے کہہ کر اللہ تعالیٰ کو پکارنا ایسا ہے جیسے کوئی اپنے باپ کو ''ابّو'' کہہ کر پکارے، یعنی اے اللہ! میرا آپ سے جو تعلق ہے، وہ ''ربوبیت'' کا ہے، لہٰذا میں اس ''ربوبیت'' کے تعلق کا حوالہ دے کر آپ سے مانگتا ہوں، جیسے دوسری دُعا میں فرمایا کہ ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا''۔ ''رب'' کے معنیٰ وہ پروردگار جس نے مجھے پالا پوسا، جس نے مجھے نوازا، اور آپ کی ان نوازشوں کا حوالہ دے کر میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ ''رَبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ.....الخ'' ایک بات تو یہ تھی۔

اچھائی کے ساتھ داخل ہوں

دوسری بات یہ ہے کہ جب میں نے اس دعا کا ترجمہ کیا تھا تو میں نے یہ ترجمہ کیا تھا کہ جہاں بھی داخل ہوں، اچھائی کے ساتھ داخل ہوں اور جہاں سے نکلوں، اچھائی کے ساتھ نکلوں۔ ''اچھائی'' کے لفظ سے جو ترجمہ کیا، یہ سادہ طریقے سے سمجھانے کے لئے کیا تھا، لیکن قرآنِ کریم نے یہاں جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ ہے ''صدق'' ۔ ورنہ اچھائی کے لئے تو یوں کہا جاسکتا تھا کہ ''رَبِّ أَدْخِلْنِيْ مُدْخَلًا حَسَنًا وَأَخْرِجْنِيْ مُخْرَجًا حَسَنًا''۔ یعنی اچھا داخل ہونا اور اچھا نکلنا۔ لیکن قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ''مدخلِ صدق'' اور ''مخرجِ صدق'' کے الفاظ لائے۔ اس لفظ کو اُردو زبان میں پوری طرح منتقل کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

صدق کا صحیح مفہوم

اس کے لفظی معنیٰ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتے ہیں کہ یااللہ! مجھے سچائی کے ساتھ داخل کردیجئے، یا سچی جگہ پر داخل کردیجئے اور سچائی کے ساتھ نکال دیجئے، لہٰذا ''صدق'' کے معنیٰ عام طور پر ''سچائی'' سے کردیتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ''صدق'' کا مفہوم بہت وسیع ہے، وہ صرف زبان کی سچائی میں منحصر نہیں ہے، اور صرف زبان سے سچ بولنے کا نام ''صدق'' نہیں ہے۔ بلکہ ایک ''عمل'' کا صدق بھی ہے اور ''صدقِ عمل'' یہ ہے کہ جو کام جس طرح کرنا چاہئے، آدمی وہ کام اس طرح کرے اور اس کام کو ادا کرنے کے طریقے میں کمی کوتاہی نہ رہے، یہ ''صدقِ عمل'' ہے۔

اس طرح نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا

مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے تو نماز کا جو طریقہ مسنون ہے یعنی وہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا کہ:

صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ [1]

یعنی جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اس طریقے سے نماز پڑھو۔

لہٰذا تلاوت اس طریقے سے کرے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا ہے، تکبیر اس طرح کہے، ہاتھ اس طرح اُٹھائے، ہاتھ اس طرح باندھے، رکوع

(۱) صحیح البخاری ۱ / ۱۲۸ (۶۳۱)

اس طرح کرے اور سجدہ اس طرح کرے، یہ ''صدقِ عمل'' ہے، یعنی جو کام جس طریقے سے کرنا چاہئے، اس طریقے سے وہ کام کرے۔

''صدقِ عمل'' کے ساتھ ''صدقِ مقصد''

دوسری چیز اس کے اندر ''صدقِ مقصد'' ہے کہ ''مقصد'' بھی درست ہو اور ظاہر اور باطن ایک ہو۔ ظاہر بھی صحیح ہو اور باطن بھی صحیح ہو، مثلاً نماز پڑھ رہا ہے تو اس نماز کے ذریعہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو، کوئی اور مقصد نہ ہو اور قرآنِ کریم نے بیشمار جگہوں پر ''صدق'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور بڑے عام مفہوم میں استعمال کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (1)

ایمان والے آخرت میں ایسی جگہ پر بیٹھیں گے جو صدق سے بھرپور ہوگی، یعنی جیسا ظاہر ہوگا، ویسا باطن بھی ہوگا، یہ سب مفہوم ''صدق'' میں داخل ہیں۔

ظاہر اور باطن دونوں اچھے ہوں

خلاصہ یہ کہ ہر کام اس طریقے سے ہو جس طرح ہونا چاہئے اور اس کام کا ظاہر اور باطن دونوں اچھے ہوں تو وہ ''صدق'' ہے۔ اسی طرح یہاں اس دُعا میں اللہ تعالیٰ ''حسن'' کا لفظ لانے کے بجائے ''صدق'' کا لفظ لائے، جس سے اشارہ اس طرف فرمایا کہ یا اللہ! جس وقت آپ مجھے مدینہ منورہ میں داخل فرمائیں تو وہ ''صدق'' کے ساتھ ہو اور ''صدق'' کے ساتھ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ جس طرح

---

(1) سورۃ القمر: آیت (۵۵)

اچھے طریقے سے داخل ہونا چاہئے، اس طرح داخل ہوں اور پھر اس داخل ہونے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی جونیت ہونی چاہئے، وہ نیت بھی میری صحیح ہو اور آپ کی رضا کے مطابق ہو۔

اللہ کی ربوبیت اور اپنی بندگی کا اعتراف

اور سب سے بڑا ''صدق'' یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو ''بندہ'' اور اللہ تعالیٰ کو اپنا ''رب'' قرار دے کر داخل ہو، کہ میں وہاں جاکر آپ کی بندگی کا حق ادا کرسکوں، اور جس مقصد کے لئے میں جارہا ہوں، اس مقصد کے اندر مجھے کامیابی حاصل ہو، یہ سب باتیں ''مدخلِ صدق'' کے اندر شامل ہیں۔ لہٰذا ہم بھی جب کسی جگہ داخل ہوتے وقت یہ دُعا کریں، اس وقت ان باتوں کا تصور کریں کہ سچائی کے ساتھ اس طرح داخل ہوں جس طرح مجھے داخل ہونا چاہئے اور میرا ظاہر اور باطن درست ہو اور میری توجہ اپنے پروردگار کی خوشنودی کی طرف ہو، اس کی ربوبیت اور اس کی بندگی کی طرف ہو۔ یہ سب باتیں اس ''صدق'' کے اندر داخل ہیں، چونکہ اُردو میں کوئی اور لفظ مجھے نہیں ملا، اس لئے میں نے یہ ترجمہ کردیا کہ ''اچھائی کے ساتھ داخل ہوں اور اچھائی کے ساتھ نکلیں۔'' لیکن حقیقت میں قرآنِ کریم نے جو لفظ استعمال فرمایا، وہ اس سے بہت زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

نیکی کیا ہے؟

دیکھئے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ.... الخ [1]

یعنی ''نیکی'' یہ نہیں ہے کہ تم نے مشرق کی طرف رُخ کرلیا یا مغرب کی طرف رُخ کرلیا، بلکہ نیکی یہ ہے کہ وہ اللہ پر، فرشتوں پر، یوم آخرت پر، کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لائے اور مال کی محبت کے باوجود اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، ایک طویل فہرست اعمال کی بیان فرمائی کہ یہ عمل کرو، یہ عمل کرو اور جو لوگ یہ عمل کرتے ہیں، ان کے بارے میں آخر میں فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ

وہ لوگ جو یہ سب اعمال کرتے ہیں وہ ''صدق'' کے حامل ہیں اور سچے ہیں، یعنی بات کے سچے، کام کے سچے، عمل کے سچے، نیت کے سچے اور یہی لوگ متقی ہیں۔

ہر کام طریقے اور سلیقے سے کرنے کا حکم

بہرحال! یہ ''صدق'' حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ جو کام بھی کریں، وہ ٹھیک طریقے سے انجام دیں اور اس عمل کو اللہ کی رضاجوئی کے لئے کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہوئے وہ عمل کریں اور جو کام کریں اس کو سلیقے سے انجام دیں، بے ڈھنگے انداز میں نہ کریں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زرہیں بنانے کا حکم دیا، ''زرہ'' جو جنگ کے دوران حملے سے بچاؤ کے لئے سینے پر باندھی جاتی ہیں، حکم دینے کے ساتھ یہ فرمایا کہ:

---

(۱) سورۃ البقرۃ: آیت (۱۷۷)

وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ [1]

یعنی جب ''زرہ'' کے حلقے بناؤ تو ناپ ناپ کر برابر کر کے بناؤ، ایسا نہ ہو کہ ایک حلقہ بڑا ہوجائے اور ایک حلقہ چھوٹا ہوجائے، بلکہ توازن کے ساتھ بناؤ۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر وہ کام پسند ہے جو سلیقے کے ساتھ کیا جائے، بے ڈھنگے طریقے سے کیا ہوا کام اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت

لہٰذا عمل کا ''صدق'' یہ ہے کہ اس طریقے سے کرو، جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے اور دوسرا یہ کہ اس عمل سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہو۔ یہ سب مل کر ''صدق'' بنتا ہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں اس طرح شہید ہوتے ہیں کہ انہوں نے لشکرِ اسلام کا جھنڈا اُٹھایا ہوا تھا، ان پر کافر نے حملہ کیا اور ان کا ایک ہاتھ کٹ گیا تو انہوں نے جھنڈا دوسرے ہاتھ سے پکڑلیا۔ دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا تو انہوں جھنڈا گرنے نہیں دیا، بلکہ گردن اور کندھے کے سہارے جھنڈے کو بلند رکھا، اور پھر ان کو شہید کر دیا گیا اور شہداء اُحد میں شامل ہوگئے، [2] ان کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے یہ [3] آیت نازل فرمائی کہ:

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى

---

(۱) سورۃ سبا: آیت (۱۱)

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۳ / ۱۱۲

(۳) دلائل النبوۃ للبیھقی ۳ / ۲۸٤

نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ (۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو عہد کیا تھا کہ ہماری جانیں بھی آپ پر قربان ہیں، انہوں نے اس عہد کو سچا کر دکھایا، یہ ''صدق'' تھا کہ انہوں نے اپنی جان اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دی ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اللہ تعالیٰ سے ایک عہد

میرے بھائیو اور بہنو! ہم سب نے بھی اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کر رکھا ہے، وہ عہد یہ ہے کہ:

لا إله إلا الله محمد رسول الله

یہ کوئی جنتر منتر نہیں ہے کہ اس کے نتیجے میں آدمی ''فائر پروف'' ہو گیا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپ جو حکم دیں گے، ہم اس حکم کے تابعِ فرمان ہوں گے، یہ عہد ہے۔ لہٰذا جب ہم اپنی زندگی میں کوئی بھی کام کریں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کریں تو یہ ''صدق'' ہے اور یہ ''صدق'' ہی انسان کو جنت تک لے جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۱) سورۃ الاحزاب: آیت (۲۳)

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۱۸

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو دُعائیں سکھلائی ہیں، ان کا بیان کچھ عرصہ سے چل رہا ہے، آگے جو دُعا آئی ہے، وہ یہ ہے کہ:

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا [1]

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ

اے ہمارے پروردگار! ہمیں خاص اپنی جانب سے رحمت عطا فرمایئے اور ہمارے معاملات میں جو راستہ بھلائی کا ہو، وہ ہمارے لئے تیار کردیجئے۔

---

(۱) سورۃ الکھف :آیت (۱۰)

یہ دُعا ''سورۂ کہف''میں آئی ہے اور یہ ''اصحابِ کہف'' کی مانگی ہوئی دعا ہے۔ ''اصحابِ کہف'' وہ حضرات تھے جن کواللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور رحمت کی ایک نشانی بنایا تھا، ''کہف'' کے معنیٰ ہیں''غار''۔ ''اصحابِ کہف'' یعنی غار والے۔

اصحابِ کہف کا واقعہ

ان کا واقعہ روایات[1] میں یہ آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے بعد آپ کے متبعین تھوڑی تعداد میں رہ گئے تھے اور رفتہ رفتہ ان پر مختلف بادشاہوں کا تسلط ہوتا رہا اور انہیں اپنے ایمان کی وجہ سے بہت دکھ اور تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ کبھی ایک بادشاہ ان پر مسلط ہوگیا، کبھی دوسرا بادشاہ ان پر مسلط ہوگیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بہت کم رہ گئی۔

''دقیانوس'' بادشاہ کی حکومت

یہ تقریباً تیسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں ایک بادشاہ ہوتا تھا، جس کا نام''دقیانوس'' بتایا جاتا ہے اور آج بھی اس کی طرف نسبت کرکے پرانی چیزوں کو کہہ دیا جاتا ہے کہ''دقیانوسی'' چیز ہے۔ یہ اسی بادشاہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے، وہ بادشاہ خود بت پرست تھا اور جولوگ بت پرستی سے باز رہتے، ان پر بہت زیادہ ظلم ڈھایا کرتا تھا۔ وہ لوگ شہر کے باہر ایک سالانہ جشن منایا کرتے تھے، اس جشن میں بادشاہ اپنی تمام رعایا کے ساتھ جشن منانے کے

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: البداية والنهاية ٢ / ٥٦١، قصة أصحاب الكهف.

لئے شہر سے باہر نکلا اور وہاں پر بڑے بڑے بت رکھے ہوئے تھے اور سب کا یہ ارادہ تھا کہ وہ ان بتوں کی پرستش کریں اور ان کی عبادت کریں۔

اصحابِ کہف کا قوم سے علیحدہ ہوجانا

ان رعایا میں سات افراد ایسے تھے جو کسی طرح بھی شرک کا ارتکاب کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، یہ سب سات افراد الگ الگ تھے، ایک دوسرے کو جانتے نہیں تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ بادشاہ ہم پر ظلم کررہا ہے اور ہمیں اس بات پر آمادہ کررہا ہے کہ ہم بت پرستی کریں اور توحید کو چھوڑ دیں تو ان میں سے ایک آدمی اس جگہ سے ہٹ کر کسی دور جگہ پر جا کر بیٹھ گیا، اس کے بعد دوسرے صاحب بھی اسی طرح چھپ کر اس جگہ پہنچ گئے، اس کے بعد تیسرے صاحب وہاں پہنچ گئے، اس کے بعد چوتھے، پانچویں پہنچ گئے، اس طرح کل سات افراد جمع ہوگئے اور ایک دوسرے کو پتہ نہیں کہ ہم کیوں الگ ہوئے ہیں، اور ان میں کوئی دوسرے کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟ کیونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر یہ بات بادشاہ پر کھل گئی کہ یہ لوگ بت پرستی سے بچ کر یہاں جمع ہوئے ہیں تو وہ بادشاہ ظلم وستم کا ارتکاب کرے گا۔ اس وجہ سے ایک دوسرے سے بھی نہیں پوچھ رہے تھے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟

بادشاہ کا مہلت دینا

جب کافی دیر گزر گئی تو ان میں سے ایک شخص نے ہمت کرکے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہ بادشاہ ہم سے

شرک کرانا چاہتا ہے اور ہم شرک سے بچ کر یہاں آئے ہیں، رفتہ رفتہ ایک ایک کرکے سب نے ظاہر کردیا کہ یہ سب اسی ایک مقصد کے لئے الگ ہوئے ہیں۔ سب نے مل کر مشورہ کیا کہ اب ہم کیا کریں؟ اور بادشاہ کے ظلم سے ہم کیسے نجات حاصل کریں؟ وہاں بادشاہ کو ان کے بارے میں پتہ چل گیا، چنانچہ اس نے کارندے بھیج کران کو پکڑوالیا اور اپنے پاس بلالیا اور ان سے کہا کہ یا توتم بت پرستی کرو، ورنہ ہم تمہیں ہلاک کردیں گے، قتل کردیں گے، انہوں نے کہا کہ اچھا! ہمیں سوچنے کے لئے کچھ مہلت دیدیں، جس میں ہم غور کریں اور پھر ہم فیصلہ کریں گے کہ ہمیں یہ کام کرنا ہے یا نہیں؟ چنانچہ ان لوگوں کو بادشاہ نے مہلت دے دی۔

دعا کرنا اور غار میں پناہ لینا

جب مہلت مل گئی اس وقت ساتوں افراد نے یہ دعا کی کہ:

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا (۱)

اے پروردگار! ہمیں اپنی طرف سے ایک ایسی رحمت دیدیجئے کہ ہمارے لئے ہدایت کا راستہ اور بھلائی کا راستہ تیار شدہ مل جائے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی تو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ:

(۱) سورۃ الکھف :آیت (۱۰)

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا (۱)

جب تم نے ان لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن خداؤں کی وہ لوگ عبادت کرتے تھے، ان کو بھی تم نے چھوڑ دیا تو ایسا کرو کہ ایک غار میں پناہ لے لو۔ اللہ تعالیٰ ضرور ہمارے لئے اپنی رحمت پھیلا دے گا اور اللہ تعالیٰ ضرور ہمارے لئے آسانی کا راستہ تیار کردیں گے۔

اصحابِ کہف ۳۰۹ سال تک سوتے رہے

چنانچہ یہ ساتوں افراد ایک غار میں جا کر چھپ گئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب وہ لوگ غار میں جا کر لیٹ گئے تو:

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا (۲)

کہ وہ تین سو نو سال غار میں سوتے رہے۔

شمسی لحاظ سے ۳۰۰ سال

بعض حضرات نے یہاں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ قرآنِ کریم نے یوں بیان فرمایا کہ وہ لوگ غار میں تین سو سال رہے اور نو سال زیادہ۔ تو تین سو سال تو شمسی حساب سے ہیں اور قمری حساب سے ۹ سال اور بڑھ گئے۔ اس لئے کہ

---

(۱) سورۃ الکھف :آیت (۱۶)

(۲) سورۃ الکھف :آیت (۲۵)

قرآنِ کریم نے یہ نہیں کہا کہ وہ تین سو نو سال تک غار میں رہے۔ بلکہ الگ الگ بیان فرمایا کہ تین سو سال رہے اور نو سال کا اضافہ کرلو۔ اس لئے کہ قمری سال چھوٹا ہوتا ہے، ہر سو سال پر ۳ سال قمری کے حساب میں بڑھ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ دیتے رہے

وہ لوگ غار میں کس طرح سوتے رہے؟ اس کا نقشہ قرآنِ کریم نے اس طرح کھینچا ہے کہ:

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ

یعنی ہم ان کو پلٹتے رہتے تھے، کبھی داہنی طرف اور کبھی بائیں طرف۔

اور اسی نیند کی حالت میں ان کو کروٹیں دیتے رہتے تھے، کیونکہ اگر وہ لوگ لمبے عرصہ تک سیدھے لیٹے رہتے تو ان کی پشت پر زخم ہوجاتے، اس طرح تین سو سال تک کروٹیں دِلواتے رہے اور سورج کے بارے میں فرمایا کہ وہ ان کے دائیں بائیں سے گزر جاتا تھا اور ان کے اُوپر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔

کتے کے کروٹ دِلانے کا ذکر کیوں نہیں

اور کتے کے بارے میں فرمایا کہ:

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (۱)

---

(۱) سورۃ الکھف: آیت (۱۸)

اور ان کا کتا اس غار کی چوکھٹ پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا۔

ایک ڈاکٹر نے لکھا ہے کہ یہ جو قرآنِ کریم میں ہے کہ ہم ان اصحابِ کہف کو دائیں اور بائیں کروٹ دیا کرتے تھے، کسی آدمی کو زندہ رکھنے کے لئے طبی اعتبار سے یہ ضروری ہے کہ اس کو بار بار دائیں بائیں کروٹ دِلواتے رہیں، اس لئے کہ اگر وہ سیدھا لیٹا رہے گا تو اس کی پیٹھ پر زخم ہوجائیں گے۔ لیکن کتے کے بارے میں یہ نہیں آیا کہ اس کو کروٹیں دلاتے رہے بلکہ وہ چوکھٹ پر بازو پھیلائے ہوئے تین سو سال تک بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ انسان اور کتے میں یہ فرق ہے کہ انسان کی پشت میں تو زخم ہوجاتے ہیں، لیکن کتے کی کھال میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ اسے زیادہ دیر زمین پر رکھنے کی وجہ سے اس میں زخم نہیں ہوتے۔

اگر تم دیکھتے تو رُعب طاری ہوجاتا

آگے اللہ تعالیٰ نے ان کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ:

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا [1]

اگر تم ان کو اس حالت میں دیکھتے، جس حالت میں وہ سوئے ہوئے تھے اور کتا ان کی دہلیز پر بیٹھا ہوا تھا تو وہ اتنا خوفناک منظر تھا کہ تم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے اور تمہارے دل پر اس کا رُعب طاری ہوجاتا۔ تین سو نو سال

(۱) سورۃ الکھف: آیت (۱۸)

تک اسی طرح سوتے رہے۔ پھر ان کو ہم نے نیند سے بیدار کیا اور بیدار ہونے کے بعد آپس میں ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے کہ ہم کتنی دیر سوتے رہے؟ کسی نے کہا کہ ایک دن سوئے، کسی نے کہا کہ دن کا کچھ حصہ سوئے، آخرکار انہوں نے کہا کہ تمہارا رب ہی زیادہ جانتا ہے کہ تم کتنے عرصہ تک سوئے، لیکن بھوک لگی ہوئی ہے، کچھ کھانے پینے کا انتظام کرنا چاہیئے۔

کھانا لانے کے لئے شہر بھیجنا

ان کے پاس کچھ سکّے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ کسی کو چاندی کے یہ سکے دے کر شہر بھیجو، تاکہ وہ جاکر یہ دیکھے کہ کون سا کھانا حلال ہے؟ چونکہ ان کے خیال میں شہر کے لوگ بت پرست تھے اور اس لئے جانے والے سے کہا کہ حلال کھانا تلاش کرو، اس حالت میں بھی یہ فکر تھی کہ کھانا حرام نہ ہو اور دیکھو، چھپ کر جانا، کسی کو پتہ نہ چلے کہ تم کہاں سے آرہے ہو؟

اب حقیقت کھل کر سامنے آگئی

بہرحال! جب ایک شخص سکے لے کر گیا اور دوکان پر لے جاکر سکے دیئے، جب دوکاندار نے وہ سکے دیکھے تو اس نے ان کی شکل اُوپر سے نیچے تک دیکھی اور ان کے سکے دیکھے اور ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں کھانا خریدنے کے لئے سکے لے کر آیا ہوں۔ دوکاندار نے کہا کہ یہ تین سو سال پرانے سکّے ہیں اور یہ سکے اب نہیں چلتے۔ دوکاندار کی بات سن کر ان کو احساس ہوا کہ ہم تین سو سال تک غار میں پڑے سوتے رہے۔ دوکاندار نے

پوچھا کہ تمہارے پاس یہ سکّے کہاں سے آئے؟ پھر انہوں نے پوری تفصیل بتائی کہ ایک ظالم بادشاہ بت پرست تھا، اس کے ظلم سے بچنے کے لئے ہم غار میں جا کر سو گئے تھے، اس دوکاندار نے بتایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ ظالم بادشاہ وغیرہ سب ختم ہوگیا اور اب اچھے لوگ آگئے ہیں اور اب کوئی ظلم کرنے والا نہیں، اب تم آرام سے رہو، اور آرام سے کھاؤ پیو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ سورۂ کہف میں بیان فرمایا۔

اصحابِ کہف کی دعا کے الفاظ

اور اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ:

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيَاتِنَا عَجَبًا، إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا[1]

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ غار اور رقیم والے لوگ ہماری نشانیوں میں سے کچھ (زیادہ) عجیب چیز تھے؟ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ان نوجوانوں نے غار میں پناہ لی تھی اور (اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے) کہا تھا کہ: اے ہمارے پروردگار ہم پر خاص اپنے پاس سے رحمت نازل فرمایئے، اور ہماری اس صورت حال میں ہمارے لیے بھلائی کا راستہ مہیا فرما دیجیے۔

---

(۱) سورۃ کہف: آیت (۹- ۱۰)

ان آیات میں وہ دُعا بھی مذکور ہے جو دُعا اصحابِ کہف نے مانگی تھی، قرآنِ کریم میں جتنی دُعائیں ہیں، ان میں سب جگہ یا تو ''رب'' کے الفاظ ہیں یا ''ربّنا'' کے الفاظ آئے ہیں، کسی جگہ ''اللّٰھم'' کے الفاظ مجھے یاد نہیں کہ کہیں آئے ہوں۔ اس کے ذریعہ یہ طریقہ سکھایا کہ جب اللہ تعالیٰ کو پکارو تو ان الفاظ سے پکارو ''اے میرے پروردگار!'' ''اے ہمارے پروردگار!'' یہی اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت ہے، پالنے والا'' پرورش کرنے والا۔''

خطاب کے مختلف انداز

دیکھئے! جب کسی سے خطاب کیا جاتا ہے تو ایک طریقہ خطاب کا یہ ہے کہ اس کا نام لیا جائے، اے فلاں! اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس سے جو رشتہ ہے اس رشتہ کا حوالہ دے کر خطاب کیا جائے۔ مثلاً باپ اپنے بیٹے کو اس کے نام سے پکارے تو اس میں اتنا مزہ نہیں، لیکن باپ اگر لفظ ''بیٹا'' کہہ کر پکارے تو اس کے اندر ایک اپنائیت اور ایک پیار ہے اور اس رشتہ کا حوالہ دیا جارہا ہے جو اس کے ساتھ ہے۔ اسی طرح اگر بیٹا اپنے باپ کو ''اباجان'' کے الفاظ سے پکارے تو اس میں پیار زیادہ ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے گھر تشریف لایا کرتے تھے، ہم اس زمانے میں بچے تھے، ہماری ''دادی'' کو وہ ''ممانی'' کہتے تھے، اور ہماری ''دادی'' حضرت علامہ کو ''بیٹا'' کہہ کر خطاب کرتی تھیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں یہاں کسی اور مقصد سے تو آتا ہی ہوں اور یہ لفظ ''بیٹا'' سننے کے لئے

بھی آتا ہوں، کیونکہ دنیا میں مجھے ''بیٹا'' کہہ کر پکارنے والا کوئی نہیں ہے، اس لئے کہ اس لفظ میں جو اپنائیت ہے، جو لطف ہے، وہ لفظ ''علامہ'' اور لفظ ''شیخ الاسلام'' میں نہیں ہے۔

لفظ ''رب'' سے پکارنے میں رشتہ کا حوالہ

لہٰذا مخاطب سے جو رشتہ ہوتا ہے اگر اس رشتہ کے حوالے سے خطاب کیا جائے، اس میں اپنائیت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ جب تم مجھ سے کچھ مانگو تو اس رشتہ کا حوالہ دے کر مانگو، جو میرا تمہارے ساتھ ہے، وہ رشتہ یہ ہے کہ میں تمہارا ''رب'' ہوں اور تمہارا ''پروردگار'' ہوں، میں تمہیں پالنے پوسنے والا ہوں، ''رَبَّنَا'' کہہ کر پکارو۔ اس لئے اس دُعا میں بھی ''اصحابِ کہف'' نے ''رَبَّنَا'' کہہ کر پکارا۔

اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائیے

آگے فرمایا:

اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً

ہمیں رحمت عطا فرمائیے۔ ''من لدنك'' کے معنیٰ ہیں ''خاص اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائیے۔'' اس لفظ میں اس طرف اشارہ فرمادیا کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں ہے کہ ہم آپ پر اپنا حق جتائیں کہ آپ پر یہ حق آتا ہے کہ آپ ہمیں رحمت عطا فرمائیے۔ بلکہ آپ کی طرف سے جو رحمت ہوگی وہ آپ کا فضل ہوگا اور آپ کا کرم ہوگا، آپ کی اپنی طرف سے ہوگا، ہمارے کسی عمل کے صلے

میں نہیں ہوگا۔ یہ عبدیت اور بندگی ہے کہ میں اپنے کسی عمل کی وجہ سے نہیں مانگ رہا ہوں کہ اس عمل کے نتیجے میں میرا یہ حق پیدا ہوگیا ہے کہ آپ میری دُعا قبول کریں اور مجھے رحمت عطا فرمائیں، ایسا نہیں۔ بلکہ آپ کی طرف سے جو کچھ ہوگا، وہ آپ کی طرف سے انعام ہوگا، فضل وکرم ہوگا۔

آپ کی رحمت کا سوالی ہوں

لہٰذا عبدیت اور بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے تو اس بات کا دل میں احساس بھی ہو اور زبان سے اس کا اظہار بھی ہو کہ یا اللہ! میری حقیقت کچھ نہیں ہے، نہ میرے پاس کوئی عمل ہے جو آپ کی بارگاہ میں پیش کروں، نہ میرے پاس کوئی ایسی نیکی ہے جو آپ کی بارگاہ میں پیش کروں، میں تو براہِ راست آپ کی رحمت کا سوالی ہوں۔

محبت کا وسیلہ افضل ہے

ایک بات اس حوالے سے ذہن میں آگئی، وہ یہ کہ ''توسّل'' یعنی کسی وسیلے سے دعا کرنا، ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اعمالِ صالحہ کے وسیلے سے دعا کرنا کہ یا اللہ! میں نے فلاں عمل صرف آپ کے لئے کیا تھا، میں اس عمل کے وسیلے سے آپ سے دُعا مانگتا ہوں کہ آپ میرا یہ کام بنادیجئے، اس کو ''توسل بالأعمال الصالحة'' کہا جاتا ہے۔ یہ توسل جائز ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔[1] اور دوسرا طریقہ توسل کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کرے کہ

(۱) ملاحظہ فرمائیں: صحیح البخاری ۳ / ۹۱ (۲۲۷۲)

یااللہ! میرے پاس اور تو کچھ نہیں ہے، کوئی عمل میرے پاس نہیں ہے، لیکن مجھے آپ کے فلاں مقرب بندے سے محبت ہے، اس محبت کا واسطہ دے کر آپ سے مانگتا ہوں، بتایئے دونوں میں کون سا ''وسیلہ'' افضل ہوا؟ ''محبت کا وسیلہ''۔

نیک عمل کا وسیلہ جائز ہے

اس لئے عملِ صالح میں یہ ہے کہ میں نے فلاں عمل کیا تھا، میں اس کا وسیلہ دے کر آپ سے مانگ رہا ہوں، گویا کہ میں اپنے عمل کو کوئی اہمیت دے رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اس کے توسل سے مانگ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی جائز کردیا کہ ٹھیک ہے، اس طرح مانگ لو، لیکن اگر آدمی اپنے کسی عملِ صالح کی بجائے کسی اللہ کے نیک بندے کا ''توسل'' کرے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے پاس کوئی نیک عمل نہیں ہے جو آپ کی بارگاہ میں پیش کروں اور اس کو وسیلہ بناؤں، البتہ فلاں بزرگ جو آپ کے مقرب بندے ہیں، مجھے ان سے محبت ہے، اس محبت کا واسطہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ زیادہ افضل ہے، توسل بالعمل کے مقابلے میں۔ اس لئے محبت کے وسیلے میں بندگی اور عبدیت ہے، شکستگی ہے اور باری تعالیٰ کے سامنے عاجزی ہے۔

رحمت مانگ لی تو سب کچھ مانگ لیا

اسی طرح اصحابِ کہف نے دُعا میں ''من لدنك'' فرمایا کہ یااللہ! ہمارے پاس کوئی عمل نہیں ہے جس کو آپ کی بارگاہ میں پیش کرکے اس کے وسیلے سے مانگیں، لہٰذا ''من لدنك'' یااللہ! آپ اپنے پاس سے دیدیجئے۔ کسی استحقاق

کے بغیر محض اپنے فضل وکرم سے دیدیجئے۔ عبدیت اور بندگی سے دعا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

کیا دیدیجئے؟ رحمت دیدیجئے۔ ''رحمت'' اتنا عام لفظ ہے کہ اس میں دنیا اور آخرت کی ساری حاجتیں اور ساری ضرورتیں داخل ہیں، جب اللہ سے رحمت مانگ لی تو سب کچھ مانگ لیا۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت رحمت کی طلب

مسجد میں داخل ہوتے وقت ہم یہ دُعا پڑھتے ہیں کہ:

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ [1]

اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیجئے۔

اگر صرف یہ ایک دُعا ہی پوری طرح قبول ہوجائے تو انسان کا بیڑہ پار ہوجائے، کیونکہ ''رحمت'' میں دنیا کی تمام حاجات بھی آگئیں، آخرت کی تمام حاجات بھی آگئیں، اگر وہ مل گئیں تو سب کچھ مل گیا، اس لئے اصحابِ کہف نے رحمت مانگی کہ ''من لدنك رحمة''۔ اپنی طرف سے رحمت عطا فرمائیے۔

بھلائی کا راستہ آسان کردیجئے

آگے یہ دعا کی کہ:

(۱) صحیح مسلم ۱ / ٤٩٤ (۷۱۳)

وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

اے ہمارے پروردگار! ہمارا جو معاملہ ہے اور جس میں ہم گرفتار ہیں کہ ہم توحید کا عقیدہ رکھتے ہیں اور ہمارا دشمن ہمیں شرک پر مجبور کررہا ہے، اگر ہم اس کی بات نہیں مانیں گے تو وہ ہمیں قتل کردے گا اور ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے تو ہمارے لئے "رَشَد" کا راستہ عطا فرمادیجئے۔ "رَشَد" ایک ایسا عام لفظ ہے کہ کسی بھی کام میں جو صحیح راستہ ہوتا ہے وہ "رَشَد" اور "رُشد" کہلاتا ہے، مثلاً اگر آدمی تجارت کر رہا ہے تو وہ اچھے طریقے سے تجارت کرے تو یہ تجارت کا "رُشد" ہے۔ اگر زراعت کررہا ہے اور اچھی طرح کرے تو زراعت کا "رُشد" ہے۔ اگر گھر والوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا وہ طریقہ اختیار کرے جو صحیح طریقہ ہے تو یہ "رُشد" ہے، لہٰذا زندگی کے تمام پہلوؤں میں بھلائی حاصل کرنے کا راستہ ہمارے لئے آسان کردیجئے۔

اس دعا کی قبولیت کا نتیجہ

یہ بھی "بندگی" اور "عبدیت" ہے، مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہم کمزور لوگ ہیں، اب اگر ہدایت کا راستہ حاصل کرنے کے لئے کوئی بڑی مشقت اُٹھانی پڑی تو ہم اس کے متحمل نہیں ہیں، وہ ہماری استطاعت سے باہر ہے، لہٰذا اب ہمارے لئے راستہ بھی ایسا تیار کردیجئے کہ جس میں کوئی دقت اور پریشانی زیادہ نہ ہو۔ "اصحابِ کہف" نے یہ دعا کس دل سے مانگی تھی؟ کس اخلاص سے کی تھی؟ کن حالات میں کی تھی؟ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی وہ دُعا قبول فرمالی اور یہ راستہ پیدا کردیا کہ آج تک ایک مثال بنی ہوئی ہے کہ سات آدمی ایک غار میں تین سو

نو سال تک پڑے سوتے رہے اور وہاں ان کو موت بھی نہیں آئی اور نہ ان کو کھانے پینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ وہ بیمار ہوئے اور زندہ بھی رہے۔ یہ آسان راستہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پیدا کردیا۔

جب بیدار ہوئے تو انقلاب آچکا تھا

اب اگر فرض کرو کہ ان کو یہ حکم دیا جاتا کہ تم توحید کے لئے اس بادشاہ کے خلاف جہاد کرو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کی جانیں چلی جاتیں، اگرچہ وہ جان دینا اللہ کے لئے ہوتا، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے آسان راستہ مانگا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آسان راستہ پیدا کردیا، اس سے زیادہ آسان راستہ اور کیا ہوگا؟ اور اس سونے کے زمانے میں اس ظالم بادشاہ کا پورا زمانہ گزر گیا اور جب بیدار ہوئے تو ملک میں انقلاب آچکا تھا۔

تم بھی اصحابِ کہف کی طرح ہم سے مانگو

اللہ تعالیٰ جب کوئی واقعہ قرآنِ کریم میں بیان فرماتے ہیں تو وہ محض ایک داستان اور ایک افسانہ نہیں ہوتا، بلکہ اس واقعہ کے ایک ایک پہلو میں کوئی نہ کوئی سبق ہوتا ہے، اب اس واقعہ میں یہ بیان فرمایا کہ ''اصحابِ کہف'' نے ہم سے یہ مانگا اور ہم نے ان کو یہ دیا۔ اس کا کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ تم بھی ہم سے اسی طرح مانگو اور جہاں تمہیں دشواریاں پیش آرہی ہوں اور تمہارے سامنے دین پر چلنے کے لئے رکاوٹیں آئیں تو اس وقت تم ہمیں پکارو، ہم سے مانگو اور یہ کہو:

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

آج کے ماحول میں ہم کس طرح دین پر عمل کریں؟

آج لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل ہو گیا ہے، سارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے، رشوت کا بازار گرم ہے، ہم کاروبار کریں تو کیسے کریں؟ بغیر رشوت کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو نگاہوں کو پناہ نہیں ملتی، ہم نگاہوں کو کیسے بچائیں؟ جب ہم مجلسوں میں بیٹھتے ہیں تو غیبتیں شروع ہو جاتی ہیں، اس سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں؟ جبکہ پوری مجلس غیبتوں سے گرم ہے۔ نماز باجماعت کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، لیکن ہم ایسے ماحول میں ہیں جہاں کسی کو نماز کی فکر نہیں ہے، تو ہمارے دل میں بھی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ غرض سارا ماحول ایسا بگڑا ہوا ہے کہ اس ماحول میں ایک تنہا آدمی کیسے اس طوفان کا مقابلہ کرے؟

تمہیں دشواری ہے تو ہم سے کیوں نہیں کہتے؟

ایسے موقع کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا تلقین فرمادی ہے کہ ارے بھائی! اگر تمہیں اس ماحول میں مشکل پیش آ رہی ہے، کوئی دشواری پیش آ رہی ہے، تمہیں پریشانی ہو رہی ہے تو ہم کو کیوں نہیں پکارتے؟ ہم سے کیوں نہیں کہتے؟ اور ہم سے کہو کہ:

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا

اے اللہ! میں اس ماحول کے اندر گِھر گیا ہوں، ظلمتوں کا پہاڑ ہے، تاریکیوں کا اور گناہوں کا پہاڑ ہے، میں ان کے اندر گِھر چکا ہوں، آپ مجھے

آج کے ماحول میں ہم کس طرح دین پر عمل کریں؟

آج لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل ہوگیا ہے، سارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے، رشوت کا بازار گرم ہے، ہم کاروبار کریں تو کیسے کریں؟ بغیر رشوت کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں تو نگاہوں کو پناہ نہیں ملتی، ہم نگاہوں کو کیسے بچائیں؟ جب ہم مجلسوں میں بیٹھتے ہیں تو غیبتیں شروع ہوجاتی ہیں، اس سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں؟ جبکہ پوری مجلس غیبتو ں سے گرم ہے۔ نماز باجماعت کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، لیکن ہم ایسے ماحول میں ہیں جہاں کسی کو نماز کی فکر نہیں ہے، تو ہمارے دل میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ غرض سارا ماحول ایسا بگڑا ہوا ہے کہ اس ماحول میں ایک تنہا آدمی کیسے اس طوفان کا مقابلہ کرے؟

تمہیں دشواری ہے تو ہم سے کیوں نہیں کہتے؟

ایسے موقع کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ دُعا تلقین فرمادی ہے کہ ارے بھائی! اگر تمہیں اس ماحول میں مشکل پیش آرہی ہے، کوئی دشواری پیش آرہی ہے، تمہیں پریشانی ہورہی ہے تو ہم کو کیوں نہیں پکارتے؟ ہم سے کیوں نہیں کہتے؟ اور ہم سے کہو کہ:

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

اے اللہ! میں اس ماحول کے اندر گھِر گیا ہوں، ظلمتوں کا پہاڑ ہے، تاریکیوں کا اور گناہوں کا پہاڑ ہے، میں ان کے اندر گھِر چکا ہوں، آپ مجھے

بچا لیجئے۔ جب آپ صدقِ دل سے اور اخلاص کے ساتھ مانگو گے تو ممکن نہیں ہے کہ یہ دُعا رد ہو جائے، ضرور قبول ہو گی۔

دنیاوی مقاصد کے لئے دُعا

دیکھئے! جب انسان کوئی دُعا دنیاوی مقصد کے لئے مانگتا ہے کہ یا اللہ! مجھے فلاں ملازمت دیدیں، فلاں منصب دیدیں تو ضروری نہیں کہ وہ ملازمت اور وہ منصب مل جائے، کیوں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اگر ہم نے اس کو یہ منصب دے دیا تو یہ منصب اس کو خراب کرے گا اور اس کے اندر تکبر پیدا ہو جائے گا اور یہ دوسروں پر ظلم کرے گا، اس لئے نہیں دیتے اور وہ منصب تمہاری مصلحت کے مطابق نہیں ہوتا، لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ سے دین مانگو، صلاح مانگو، گناہوں سے بچنے کی توفیق مانگو، طاعات اور عبادات اور نیک اعمال کی توفیق اللہ تعالیٰ سے مانگو اور صدقِ دل سے مانگو تو کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری یہ دُعائیں قبول نہ کریں، کیا اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ دشمنی ہے؟

اصحابِ کہف کے واقعے میں ہمارے لئے سبق

بہرحال! اس واقعہ سے یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ جس طرح ''اصحاب کہف'' دقیانوس بادشاہ کی سلطنت میں کفر اور شرک میں گھر گئے تھے اور موت سامنے کھڑی ہوئی تھی، لیکن اس موقع پر انہوں نے جب ہمیں پکارا تو ہم نے ان کو اس معجزانہ انداز سے اس ظلم وستم سے بچالیا۔ اس لئے جب کبھی شیطان کی طرف سے یہ خیال دل میں آئے کہ اگر ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں پیدا ہوئے

ہوتے تو پھر ہمارے لئے دین پر چلنا آسان ہوجاتا، لیکن ہم تو اکیسویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں، جہاں چاروں طرف ظلمتیں بکھری ہوئی ہیں، اس ماحول میں ہم کیسے دنیا والوں سے لڑائی مول لیں؟ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اظہار کرنا چاہئے۔

تم نے ہمیں کیوں نہیں پکارا؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا تصور کرو کہ میدانِ حشر قائم ہے اور وہاں پر تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے، تم سے یہ سوال ہوا کہ تم نے دین کے فلاں حکم پر کیوں عمل نہیں کیا تھا؟ فلاں گناہ کا کیوں ارتکاب کیا تھا؟ اس وقت اللہ تعالیٰ کو تم یہ جواب دے دینا کہ یا اللہ! آپ نے ہمیں ایسے زمانے میں پیدا کیا تھا جہاں ہر طرف فسق وفجور کا بازار گرم تھا، میں اپنے آپ کو اس ماحول سے کیسے بچاتا؟ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں یہ فرمائیں کہ اگر تمہیں یہ مشکل پیش آرہی تھی تو تم مجھ سے کہتے، میں نے جگہ جگہ قرآنِ کریم میں بیان کیا ہے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

تو کیا تم کو میری قدرت پر بھروسہ نہیں تھا؟ کیا میری رحمت پر بھروسہ نہیں تھا؟ مجھ سے اخلاص کیوں نہیں مانگا؟ اس وقت تمہارے پاس کیا جواب ہوگا؟

اپنی سی کوشش کرلو، پھر اللہ کو پکارو

اب آدمی کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے اور اس سے وہ گناہ نہیں چھوڑا جاتا۔ وہ

آدمی کم از کم یہ تو کرے کہ اللہ تعالیٰ سے روزانہ مانگے، چلتے پھرتے مانگے، اُٹھتے بیٹھتے مانگے، اور کہے یااللہ! میں اس گناہ میں پھنسا ہوا ہوں، اپنی رحمت سے مجھے نکال دیجئے۔ اپنی سی کوشش بھی کرے اور اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ دیکھئے! ''اصحابِ کہف'' نے یہ نہیں کیا کہ اسی کفر وشرک کے ماحول میں بیٹھے رہے اور وہیں پر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یااللہ! ہمیں اس ماحول سے نکال دے، بلکہ ''اصحابِ کہف'' نے اپنی سی کوشش پہلے کی کہ ان سے الگ ہو گئے اور پھر بھاگ کر ایک غار میں چلے گئے، اس طرح انہوں نے اپنے حصے کا کام کرلیا اور پھر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ:

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

یہی عمل تم بھی کرو کہ جتنا عمل تم سے ہوسکتا ہے، اتنا عمل کرو اور پھر اللہ تعالیٰ کو پکارو اور کہو:

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا

پھر دیکھنا، ان شاء اللہ، تمہاری زندگی میں انقلاب آجائے گا۔

اس کو نامراد نہیں فرمائیں گے

اور اگر بالفرض انقلاب نہ آیا، جبکہ تم نے اپنی کوشش بھی جاری رکھی تھی، اور اللہ تعالیٰ سے مانگتے بھی رہے تھے تو قیامت کے دن تم کم از کم اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ سکو گے کہ یااللہ! ہم نے اپنی سی کوشش بھی کی تھی اور آپ سے مانگا بھی تھا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو نامراد نہیں فرمائیں گے۔

یہ الہامی دُعا سب کے لئے ہے

بہرحال! اس واقعہ سے بھی اور اس دُعا سے بھی اتنا بڑا سبق مل رہا ہے جو دُعا ''اصحابِ کہف'' نے مانگی اور یہ الہامی دعا تھی، اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دِلوں میں ڈالی۔ یہ دُعا خاص ان کے لئے نہیں تھی، بلکہ یہ دُعا ہم سب کے لئے ہے کہ جب کبھی کوئی دشواری پیش آئے تو اللہ تعالیٰ سے رجوع کرو، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ''منگتے'' بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں ہے۔

کوئی جو نا شناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

مانگنے والا ہونا چاہئے۔ ان کی عطا میں کوئی کمی نہیں۔

جھولی بھی انہی سے مانگو

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ یہی مضمون بیان فرمارہے تھے کہ کوئی جھولی پھیلانے والا چاہئے، ان کے یہاں دینے کی کوئی کمی نہیں ہے، حضرت خواجہ عزیزالحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا سے پوچھا کہ حضرت! اگر کسی کے پاس جھولی ہی نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جھولی بھی انہی سے مانگے کہ یااللہ! مجھے تو دعا کرنی بھی نہیں آتی، اے اللہ! مجھ سے دُعا بھی صحیح کرادے۔ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے جھولی مانگتے ہیں اور عرض کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُكَ خَیْرَ الْـمَسْئَلَةِ وَ خَیْرَ الدُّعَآءِ وَ

خَيْرَ النَّجاحِ [1]

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنے کے لئے بیٹھو تو پہلے یہ کہہ دو کہ یا اللہ! مجھے تو دعا کرنی بھی نہیں آتی، مجھے اچھی دُعا بھی سکھا دیجئے اور اس کو اچھے طریقے سے قبول بھی فرما لیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے اپنا تعلق خاص عطا فرمادے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

---

(۱) المعجم الكبير ۲۳ / ۳۱٦ (۷۱۷) والمعجم الاوسط ٦ / ۲۱٤ (٦۲۱۸) وقال الهيثمی فی "مجمع الزوائد" ۱۰ / ۲۸۰ (۱۷۳۸۵): و رجال الاوسط ثقات، والمستدرك للحاكم۱ / ۷۰۱ (۱۹۱۱) وقال: هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه ووافقه الذهبی فی التلخيص.

دعا نمبر ۱۹

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ○ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِسَانِيْ ○ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ

فہرستِ مضامین

دعا نمبر ۱۹

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ (۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! گذشتہ کافی عرصہ سے قرآنِ کریم کی دُعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا ذوق پیدا ہو اور دعا کرنے کا طریقہ بھی آجائے۔ دعا کا ایک خاص ذوق اور شوق ہوتا ہے اور انسان کو جس چیز کا ذوق اور شوق ہوجاتا ہے تو وہ اس کی طرف لپکتا ہے اور آگے بڑھ کر، خوشدلی کے ساتھ، بڑے اہتمام کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

---

(۱) سورۃ طٰہٰ: آیت (۲۵ تا ۲۸)

اپنے بچے نے مجھے لاجواب کر دیا

بچپن میں ہمیں کھیل کا شوق ہوتا تھا تو کھیلنے میں بڑا مزہ آتا تھا اور کھیلنے کا کوئی موقع آتا تو اس کی طرف لپکتے تھے، کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ میرا چھوٹا نواسا کھیل رہا تھا، بھاگ دوڑ کر رہا تھا، میں نے اس کو روک کر پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں کھیل رہا ہوں، میں نے پوچھا کہ تمہیں اس کھیل میں مزہ آتا ہے؟ کہنے لگا کہ مزہ آتا ہے، میں نے کہا کہ اس کھیل میں کوئی خاص بات نظر نہیں آرہی ہے، تمہیں کیوں مزہ آرہا ہے؟ وہ کیا جواب دیتا ہے؟ ابّا! جب آپ چھوٹے تھے تو آپ کھیلتے تھے تو مزہ آتا تھا یا نہیں؟ اس بچے نے مجھے لاجواب کر دیا، میں نے کہا کہ مزہ آتا تھا، اس نے کہا کہ ہمیں بھی مزہ آرہا ہے۔

جس چیز کا ذوق اس کی طرف لپک

بہر حال! جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ذوق اور شوق پیدا کر دیتے ہیں تو پھر انسان اس کی طرف لپکتا ہے اور دن رات اس کو حاصل کرنے کی لگن دل میں ہوتی ہے، مثلاً اگر کسی کو پڑھنے کا شوق ہو گیا تو آدمی ہر وقت اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب اُستاذ تشریف لائیں گے اور کب سبق شروع ہوگا؟ اور پھر میں سبق سنوں گا اور اس سے مجھے کتنا مزہ آئے گا۔ لہٰذا یہ ذوق اور شوق کسی بھی چیز کا پیدا ہو جائے تو آدمی اس کا انتظار کرتا ہے اور جب مل جائے تو اس کی طرف لپکتا ہے۔

دعا کا ذوق پیدا کرلو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں یہ سکھایا کہ تم دعا کا ذوق پیدا کرلو، اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا ذوق پیدا کرلو، اللہ تعالیٰ کے آگے ''منگتے'' بن جاؤ، ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو اور جب دُعا کا یہ ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو پھر جب دُعا کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اُٹھتے ہیں اور تو پھر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ہم نے اپنے کئی اساتذہ اور کئی مشائخ کو دیکھا کہ جب دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھ گئے تو اب ہر چیز مانگ رہے ہیں، یہ بھی مانگ رہے ہیں، وہ بھی مانگ رہے ہیں، دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں ساری نعمتیں ایک ایک کرکے مانگے جا رہے ہیں، آدھے گھنٹے تک دُعا کر رہے ہیں، اس لئے یہ ''ذوق'' بڑی چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا آسان راستہ

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں یہ بھی سکھایا ہے کہ تم زندگی کے جس مرحلے میں بھی ہو، اس میں اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگو۔ یہ جو اَدعیۂ مسنونہ ہیں کہ صبح کو بیدار ہو کر یہ دُعا مانگو، جب بیت الخلاء جاؤ تو یہ پڑھو، وہاں سے نکلو یہ مانگو، مسجد میں داخل ہو تو یہ مانگو اور راستے میں یہ دُعا مانگتے ہوئے چلے جاؤ وغیرہ۔ اس کے ذریعہ دل کے اندر دعا کا ذوق پیدا کرنا مقصود ہے، جب یہ ''ذوق'' پیدا ہو جاتا ہے تو پھر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ سے ہر وقت کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہوتا ہے۔ اور جب یہ دل اللہ تعالیٰ کی طرف لگ جاتا ہے تو پھر آدمی کسی بھی کام میں مشغول ہو، لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی طرف متوجہ ہوگا اور یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا بہترین، آسان ترین اور مختصر ترین راستہ ہے، وہ ہے ''کثرتِ دُعا''۔

اس لئے قرآنِ کریم نے جو دُعائیں سکھائی ہیں اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دُعائیں مانگی ہیں یا ان کی تعلیم دی ہے، ان کو اس لئے پڑھنا ہے تا کہ دُعا کا ذوق دل میں پیدا ہوجائے۔ جس کو ''دُعا'' کا ذوق ہوجاتا ہے وہ ہر لمحہ اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

سوال پوچھنے پر اللہ تعالیٰ سے دُعا

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ رحمۃ اللہ علیہ سے نہ جانے کتنی مرتبہ سنی کہ آپ نے فرمایا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے تو کبھی اس سے تخلّف نہیں ہوتا کہ اس وقت ایک لمحہ کے لئے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ یااللہ! یہ شخص پتہ نہیں کیا سوال کرے گا؟ اے اللہ! اس کے سوال کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے۔

انسانوں کی حاجتوں کا پلندا

انسان ہر قدم پر حاجتوں کا پلندا ہے، ہر وقت اس کو کوئی نہ کوئی حاجت درپیش ہے، جب بندہ اس کا عادی اور خوگر بن جاتا ہے کہ جو بھی میری حاجت ہوگی، میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرکے اس سے مانگوں گا کہ یااللہ! میری یہ حاجت پوری کردے یا اگر کسی کام کو کرنے میں کوئی کشمکش ہو کہ میں یہ کام کروں یا وہ کروں؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر کہو کہ یااللہ! جو بات صحیح ہو، وہ میرے دل میں ڈال دے۔ دیکھئے! ایک تو استخارہ مسنونہ ہے کہ دو رکعت

استخارہ کی نیت سے پڑھو اور پھر استخارہ کی جو دعا ہے وہ پڑھو، اب اس عمل میں کچھ وقت لگے گا۔

کشمکش کے وقت یہ دعا کرو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان جایئے کہ آپ نے ہمیں آسان طریقہ بتادیا کہ جب کسی عمل کرنے میں کشمکش ہو تو بس یوں کہہ دو:

اَللّٰھُمَّ خِرْلِیْ وَ اخْتَرْلِیْ (۱)

یااللہ! ان دوراستوں میں سے جو میرے سامنے ہیں، جوراستہ میرے حق میں بہتر ہو، اس کو پسند کردیجئے اور اسی کو میرے لئے مقدر کردیجئے کہ میں کروں تو وہی کروں۔ یہ مختصر سا عمل ہے، کرکے دیکھو۔ روزانہ انسان کو کسی نہ کسی عمل میں کوئی نہ کوئی کشمکش پیش آتی ہے، مثلاً اس وقت میں کھانا کھاؤں یا مطالعہ کروں؟ بس فوراً کہو "اَللّٰھُمَّ خِرْلِیْ وَاخْتَرْلِیْ" پھر جو بھی ہوگا وہ ان شاء اللہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اور جب انسان دُعا کرنے کا عادی بن جاتا ہے تو پھر ہر لمحہ اس کا تعلق اللہ جل شانہ سے قائم رہتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے دُعاؤں کی تشریح کا یہ سلسلہ شروع کررکھا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا فائدہ پہنچادے۔ آمین

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانگی ہوئی دُعا

پچھلی مجلس میں "اصحابِ کہف" کی مانگی ہوئی دُعا "رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ

---

(۱) سنن الترمذی ۵ / ۴۹۲ (۳۵۱۶) وقال: هذا حديث غريب لا نعرفه الا من حديث زنفل وهو ضعيف عند أهل الحديث.

رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا"[1] کی تشریح عرض کی تھی، اگلی دُعا یہ ہے:

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝[2]

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانگی ہوئی دعا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی، آپ مدین سے مصر کی طرف سفر کر رہے تھے، راستہ میں صحراء سینا پڑتا ہے، اہلیہ حضرت صفوراء رضی اللہ عنہا ساتھ ہیں اور وہ حمل سے ہیں، رات کا وقت ہے، شدید سردی پڑ رہی ہے، اس فکر میں ہیں کہ کہیں رات گزارنے کی جگہ مل جائے۔

آگ لینے گئے، پیغمبری مل گئی

اچانک ایک آگ نظر آتی ہے، ایک اُمید کی کرن دل میں پیدا ہوتی ہے کہ اس رات کے اندھیرے میں آگ ہے تو اس آگ کا کوئی انگارہ میں لے کر آجاؤں تو رات کی سردی دُور ہو جائے۔ چنانچہ اہلیہ کو ایک جگہ ٹھہرا کر آگ کی طرف بڑھتے ہیں، ان کے دماغ میں کوئی تصور بھی نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے؟ جب آگ کے قریب پہنچتے ہیں تو آواز آتی ہے:

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي[3]

بیشک میں اللہ ہوں۔ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

---

(۱) سورة الكهف: آیت (۱۰)

(۲) سورة طٰهٰ: آیت (۲۵ تا ۲۸)

(۳) سورة طه: آیت (۱٤)

پھر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو معجزے عطا فرمائے۔ فرمایا کہ اپنی عصا زمین پر پھینکو تو وہ سانپ بن گیا اور اپنا ہاتھ بغل میں ڈالا تو اس سے روشنی پھوٹنے لگی۔ پھر حکم ہوا کہ ہم نے تم کو نبی بنادیا ہے، اب تم فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو ایمان کی دعوت دو، شاید وہ نصیحت مان لے، شاید وہ اللہ سے ڈر جائے۔

آپ کے دل میں قتل کئے جانے کا خوف

اب ایک دم سے اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا گیا، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت کا بوجھ ڈالا گیا تو اس کے نتیجے میں آپ کو جاڑا چڑھ گیا۔ [1] اس صحراء میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تو اس وقت آپ کے دل میں کیا کیا خیالات آئے ہوں گے، ان میں سے بعض خیالات کا قرآنِ کریم نے ذکر بھی فرمایا ہے، مثلاً ایک خیال ان کو یہ آیا کہ میں تو فرعون کا مجرم ہوں، اس لئے کہ میں نے انجانے میں ایک قبطی کو قتل کر دیا تھا، وہ قبطی ایک اسرائیلی مظلوم کے پیچھے پڑا ہوا تھا، تو آپ اس قبطی کو صرف اتنا مارنا چاہتے تھے کہ اس سے مظلوم کو چھڑالیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو قوت بہت دی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو ایک ہی مکہ مارا تو وہ ڈھیر ہوگیا اور مرگیا، اور فرعون تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا ہے۔ اس لئے خیال آیا کہ اس جرم کے ساتھ میں اس کے پاس کیسے جاؤں؟ وہ تو میرے خون کا پیاسا ہے " وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ

---

(۱) صحیح البخاری ۹ / ۲۹ (۶۹۸۲)

فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُوْنِ ''[1] میں نے ان کا گناہ کیا ہوا ہے، اس لئے مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کردیں گے۔

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام کی حرکتوں سے فرعون کا ٹھٹک جانا

دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام کی زبان میں لکنت تھی، روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے گھر میں حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام کی پرورش فرمائی تھی، فرعون کی بیوی تو حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ یہ ہمارے پاس رہیں اور ہم ان کو پالیں، لیکن فرعون کو ہروقت یہ ڈرلگا رہتا تھا کہ مجھے نجومیوں نے کہا ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوگا جو تمہاری ہلاکت اور تباہی کا باعث ہوگا۔ اس لئے جب کبھی حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام کی ایسی کوئی حرکت ہوتی تو وہ ٹھٹک جاتا تھا کہ یہ تو بہت ذہین بچہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کے دل میں یہ بات آئی کہ آپ امتحان کرلیں کہ یہ آیا نادان بچہ ہے یا کچھ اور ہے؟

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام کا امتحان

وہ امتحان اس طرح کریں کہ ایک طرف ہیرا رکھ دیں اور دوسری طرف آگ کا انگارہ رکھ دیں، اگر یہ بچہ ہیرا اُٹھالے تو سمجھ لو کہ یہ سمجھدار ہے اور اگر انگارہ اٹھائے تو سمجھ لو کہ یہ نادان بچہ ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلام نے انگارہ اُٹھا کر زبان پر رکھ لیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے یہ کام کرایا، تاکہ فرعون

(۱) سورۃ الشعراء: آیت (١٤)

مطمئن ہوجائے کہ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے، یہ بچہ ہی ہے۔ لیکن زبان پر انگارہ رکھنے کا اثر یہ ہوا کہ زبان میں لکنت پیدا ہوگئی۔ یہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ (۱) واللہ اعلم۔ قرآنِ کریم سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔

اتنے بڑے مطالبات اور تنہا جانا

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ فکر کہ مجھ سے بات پوری طرح کی بھی نہیں جاتی، میری زبان میں لکنت اور ہکلاہٹ ہے، میں کیسے فرعون کے سامنے جا کر بات کروں؟ پھر اکیلا جاؤں، کوئی میرا حامی نہیں، کوئی میرا حمایتی نہیں اور اتنا بڑا مطالبہ اس کے پاس لے کر جارہا ہوں کہ تو اپنی خدائی کا دعویٰ چھوڑ دے اور اللہ کو خدا مان کر سارے اپنے برے عقائد سے توبہ کرلے اور بنی اسرائیل جن کو تو نے اپنا غلام بنا کر رکھا ہے، ان کو ہمارے حوالے کردے۔ اتنے بڑے مطالبات لے کر میں تنِ تنہا اور اکیلا جاؤں گا؟

اس موقع پر یہ دعا کرنا

اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دُعا فرمائی:

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ وَاجْعَلْ لِيْ وَزِيْرًا مِنْ أَهْلِيْ ۝

---

(۱) تفسیر السمعانی ۳ / ۳۲۸ وتفسیر البغوی ۳ / ۲۶۰

هَارُوْنَ أَخِي ○ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِيْ ○ وَأَشْرِكْهُ فِيْ أَمْرِيْ ○[1]

اے میرے پروردگار! میرے لئے میرا سینہ کھول دیجئے۔ اور جو کام آپ نے میرے حوالے کیا ہے، اس کو میرے لئے آسان فرمادیجئے اور میری زبان کے اندر جو گرہ پڑی ہوئی ہے، جو رکاوٹ ہے، اس کو دور کردیجئے، تاکہ وہ لوگ میری بات سمجھ لیں اور میرے گھر والوں میں سے ایک میرا وزیر بھی مجھے دیدیجئے، میرے بھائی ہارون کو، اس کے ذریعہ میری طاقت کو بڑھا دیجئے اور اس کو میرے معاملہ میں میرا شریک بنادیجئے (کہ جس طرح آپ نے مجھے پیغمبر بنایا ہے، اس کو بھی پیغمبر بنادیجئے)۔

آخر میں اصل مقصود بتادیا

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ○ وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ○ إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا[2]

تاکہ ہم دونوں مل کر آپ کی خوب کثرت سے پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں۔

اب دیکھئے! جو مشن سونپا جارہا ہے، وہ تو یہ ہے کہ فرعون کے پاس جانا، اور اس کو دعوت دینا اور اس کی اصلاح کی فکر کرنا، اس کے لئے ساری دُعائیں ہورہی

(۱) سورة طه: آیت (۲۵ تا ۳۲)

(۲) سورة طه: آیت (۳۳ تا ۳۵)

ہیں اور اسی مقصد کے لئے حضرت ہارون علیہ السلام کی معیت مانگی، لیکن آخر میں مقصود یہ بتایا، تاکہ ہم آپ کی کثرت سے تسبیح کریں اور کثرت سے آپ کا ذکر کریں اور یہ بات ہر وقت پیشِ نظر رکھیں کہ آپ ہمیں ہر وقت دیکھ رہے ہیں۔

دیکھئے! سیدھی سی بات یہ تھی کہ یہ دعا کرتے کہ آپ میرا سینہ کھول دیجئے، میری زبان میں طاقت دیجئے، میرے بھائی کو میرا محافظ بنادیجئے، تاکہ ہم مؤثر انداز میں فرعون کو دعوت دے سکیں۔ لیکن اس دُعا میں فرعون کے پاس جانے کا اور اس کو دعوت دینے کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ اس میں فرمایا کہ تاکہ ہم آپ کی تسبیح اور ذکر کثرت سے کر سکیں۔

یہ سب کام بذاتِ خود مقصود نہیں

اس کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ چاہے کسی بادشاہ کو دعوت دی جارہی ہو یا کہیں تبلیغ کے لئے آدمی جارہا ہو یا تعلیم حاصل کرنے کے لئے جارہا ہو، یہ سب کام بذاتِ خود مقصود نہیں، نہ تعلیم بذاتِ خود مقصود، نہ تبلیغ بذاتِ خود مقصود، نہ بادشاہ کی اصلاح بذاتِ خود مقصود۔ بلکہ مقصودِ اصلی یہ ہے کہ ہم آپ کی تسبیح اور آپ کا ذکر کثرت سے کریں، یعنی آپ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہوجائے اور اب چاہے ہم کسی کام میں مصروف ہوں، چاہے فرعون کی اصلاح کررہے ہوں، چاہے بنی اسرائیل کا دفاع کررہے ہوں، چاہے ہم دونوں بھائی مل کر عظیم مشن پر روانہ ہورہے ہوں، لیکن ہمارا مقصودِ اصلی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہمارا تعلق اتنا مضبوط ہوجائے کہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ہر آن ہم آپ کی کثرت سے تسبیح کریں، کثرت سے آپ کا ذکر کریں۔

ذرائع کو مقصود مت بناؤ

اس دُعا میں ہمارے لئے سبق یہ ہے کہ ہم بعض اوقات ''راستے'' کو مقصود بنا لیتے ہیں، مثلاً علم حاصل کرنا فرض ہے، لیکن بذاتِ خود مقصود نہیں، بلکہ علم کا مقصود یہ ہے کہ آدمی اس پر عمل کرے یا مثلاً تبلیغ کرنا اور دوسروں کو دین کا پیغام پہنچانا یا تدریس کرنا، بہت اچھا کام ہے، ثواب کا کام ہے، لیکن بذاتِ خود مقصود نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ تبلیغ اور تدریس کے ذریعہ ہمارا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہوجائے اور جس کو ہم تبلیغ کررہے ہیں یا جس کو ہم پڑھا رہے ہیں اس کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہوجائے۔

جہاد سے مقصود کیا ہو؟

یا مثلاً جہاد کررہے ہیں، جہاد اور کافروں سے لڑائی اپنی ذات میں مقصود نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوں اور تیار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہوجائے۔ یعنی جب ہم جہاد کے میدان میں ہوں اور موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہو تو اس وقت زبان پر یہ الفاظ ہونے چاہئیں کہ:

غَدًا نَلْقَى الْأَحِبَّةَ. . . مُحَمَّدًا وَّ صَحْبَهٗ (۱)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن تھے، وفات کے وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ:

---

(۱) المحتضرين لابن أبي الدنيا ص ۲۰۷ (۲۹٤)

غَدًا نَلْقَى الأَحِبَّةَ... مُحَمَّدًا وَحِزْبَهُ

یعنی کل ہماری ملاقات اپنے دوستوں سے ہوگی، یعنی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ملاقات ہوگی۔

جو مقصودِ اصلی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے تعلق اور حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی معیت، اس کی طرف دھیان ہے۔

بہرحال! ہم دین کے کسی بھی شعبے میں کام کر رہے ہوں، خواہ تعلیم کا شعبہ ہو، لیکن ان سب کا مقصود یہ ہو کہ:

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ○ وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ○ إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا [(۱)]

ہمارے پاس ترجمہ کرنے کے لئے الفاظ نہیں

اس دُعا میں جو الفاظ ہیں ان پر ذرا غور کرو، پہلی دُعا یہ فرمائی:

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ

اے اللہ! میرے لئے میرے سینے کو کھول دیجئے۔ یا کشادہ کردیجئے۔

ہماری ''اُردو'' زبان بہت چھوٹی زبان ہے، اس کے اندر ہر مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی الگ لفظ نہیں ہوتا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ہم ترجمہ کرتے ہیں، ہم اسی محدود دائرے میں رہتے ہوئے کرتے ہیں۔ ''شَرَحَ''

(۱) سورة طه: آیت (۳۳ تا ۳۵)

یَشْرَحُ شَرْحًا" جو عربی زبان کا لفظ ہے، جب ہم اس کا اُردو میں ترجمہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں "کھولنا"۔ بعض اوقات اس کے معنیٰ "کسی چیز کو وسعت دے دینا" کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں معنیٰ اس کے پورے مفہوم کو ادا نہیں کرتے۔

چھپی ہوئی صلاحیتوں کو کھول دینا

عربی کا لفظ "شَرَحَ، یَشْرَحُ شَرْحًا" کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ "کسی چیز کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو کھول کر پھیلا دینا۔" صرف کھولنا نہیں، بلکہ چھپی ہوئی صلاحیتوں کو خوب پھیلا کر تفصیل کے ساتھ کھول دینا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں کتاب کی "شرح" ہے، اس کا کیا مطلب؟ شرح کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو باتیں کتاب کے اندر پوشیدہ تھیں، اور کتاب میں جو اِغلاق تھا، اس شرح نے آکر اس کتاب کے چھپے ہوئے نکات کو اور چھپے ہوئے خزانے کو وسعت کے ساتھ پھیلا دیا۔ "شَرَحَ" کے معنیٰ یہ ہیں۔

شرحِ صدر کا مطلب

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ یا اللہ! میرے سینے کو کھول دیجئے تو کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ اس سینے کے اندر جو اشکالات ہیں، ابہام ہے، جو اجمال ہے، ان سب کو پھیلا کر کھول دیجئے اور مجھے مکمل اطمینان حاصل ہو جائے۔ اسی کو 'اُردو' میں کہا جاتا ہے "شرحِ صدر ہو جانا۔" یعنی کسی بات پر اتنا اطمینان ہو جانا کہ اس میں دوسری جانب کا کوئی امکان باقی نہ رہے، اس کو "شرحِ صدر" کہتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سینہ کھول دیا

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۱)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ کیسے کھولا؟ وحی نازل ہونے اور نبوت ملنے کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طویل زمانہ ایسا گزرا ہے کہ آپ سخت بے چینی کے اندر مبتلا تھے، بعض روایات (۲) میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایسے حالات سے گزرا ہوں کہ دل چاہتا ہے کہ پہاڑ پر چڑھ کر خود کشی کرلوں، ایسی بے چینی کا ہم اور آپ تصور بھی نہیں کر سکتے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس بے چینی کو دور کر کے آپ کا سینہ کھول دیا، اس نعمت کو اللہ تعالیٰ بتارہے ہیں کہ ''أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ'' کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا تھا؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُوپر سے بوجھ ہٹادیا

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْ أَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۳)

اور تمہارے اُوپر سے جو بوجھ تھا، جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی، وہ بوجھ ہم نے ہٹادیا۔

---

(۱) سورة الم نشرح، آیت (۱)

(۲) تاریخ طبری ۲ / ۳۰۰

(۳) سورة الم نشرح: آیت (۲ - ۳)

بہرحال! اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ''شرحِ صدر'' کا لفظ استعمال فرمایا۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو وحی پہنچائی، اس لئے آپ کو پورا یقین تھا، لیکن وہ کیا کیفیات تھیں جن سے آپ گزر رہے تھے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، باوجودیکہ اس کیفیت میں بھی آپ اللہ تعالیٰ کی وحی پر ایمان رکھتے تھے، لیکن طبیعت میں ایک گھٹن تھی، ایک اضطراب تھا، ایک بے چینی تھی اور جب اللہ تعالیٰ نے اس بے چینی کو کھول دیا تو اس وقت آپ کو ''شرحِ صدر'' حاصل ہوگیا۔

ہر چیز میں ''شرحِ صدر'' کی ضرورت

لہٰذا ''شرحِ صدر'' اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ آدمی کو کسی چیز پر اتنا اطمینان ہوجائے کہ اس کے خلاف کوئی تصور اس کو بھٹکا نہ سکے، اس کو ''شرحِ صدر'' کہتے ہیں، ہمیں ہر چیز میں اس ''شرحِ صدر'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک آدمی کو یہ اشکال ہے کہ میں کون سی تجارت شروع کروں؟ اس کے سامنے کئی راستے ہیں، اب وہ بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہے کہ یہ تجارت کروں؟ یا یہ تجارت کروں؟ اس تجارت میں یہ اشکال ہے اور دوسری تجارت میں یہ اشکال ہے، اس موقع پر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور کہے:

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ

اے اللہ! مجھے شرحِ صدر عطا فرمایئے اور میرا سینہ کھول دیجئے کہ میں کون سا راستہ اختیار کروں؟

رشتہ طے کرتے وقت شرح صدر کی ضرورت

اسی طرح اگر کسی کو اپنا رشتہ کرنا ہے یا اپنے بچوں کا رشتہ کرنا ہے، اب اس کے سامنے کئی راستے ہیں، یہاں رشتہ ڈالوں؟ یا وہاں رشتہ ڈالوں؟ اس موقع پر انسان بے چین ہوتا ہے، بس اس موقع پر وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرے اور کہے "رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ"۔ اے اللہ! میرا سینہ کھول دیجئے، یعنی جو صحیح راستہ ہے، اس پر میرا دل اس طرح جم جائے کہ اس میں کوئی شک اور شبہ باقی نہ رہے اور اطمینانِ کامل حاصل ہوجائے، اس کو "شرحِ صدر" کہتے ہیں۔

سب سے پہلے شرحِ صدر مانگا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے اسی "شرحِ صدر" کو مانگا، یعنی سب سے پہلی چیز جس کی مجھے اس وقت ضرورت ہے، وہ "شرحِ صدر" ہے، اس لئے کہ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے آرہے ہیں، طرح طرح کے خدشات پیدا ہورہے ہیں کہ یہ لوگ مجھے ماردیں گے، مجھے قتل کردیں گے، میری بات نہیں سنیں گے، مجھے دھتکار دیں گے، مجھے داخل نہیں ہونے دیں گے، میری قوم کو نقصان پہنچائیں گے۔ اس طرح کے بے شمار وسوسے آرہے ہیں۔ لہٰذا پہلی حاجت میری یہ ہے کہ میرا سینہ کھل جائے اور مجھے اطمینان ہوجائے کہ میں جو کام کرنے جارہا ہوں، بس وہی صحیح ہے۔

ہر قدم پر اطمینانِ کامل کی ضرورت

اسی اطمینانِ کامل کی ہمیں ہر قدم پر ضرورت ہوتی ہے، خاص طور پر جب

کوئی شخص مقتدا اور عالم ہوتا ہے، اور لوگ اس سے مسائل پوچھتے ہیں تو بعض اوقات مسئلے کے اندر انسان کو کشمکش پیش آتی ہے کہ وہ جواب دوں؟ یا یہ جواب دوں؟ اس موقع پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ دُعا کرتا ہے کہ:

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ

تو اللہ تعالیٰ اس کا سینہ کھول کر اس کو اس بات پر اطمینان عطا فرمادیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہوتی ہے۔

''شرحِ صدر'' ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا

لیکن یہ اطمینانِ قلب کس مرحلہ پر جاکر حاصل ہوتا ہے؟ ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا۔ ایک طالبِ علم تھے اور ابھی تازہ تازہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تھے اور فتویٰ لکھنے کی مشق شروع کردی۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک فتویٰ کا جواب لکھا، وہ فتویٰ ایسا تھا کہ اس میں دورائیں ہوسکتی تھیں، جواب لکھنے کے بعد وہ فتویٰ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لے گئے، حضرت نے ان سے سوال کیا کہ تم نے یہ جواب کیسے لکھا؟ اس طالبِ علم نے جواب دیا کہ حضرت! مجھے اس جواب پر ''شرحِ صدر'' ہوگیا۔ حضرت نے فرمایا کہ ماشاء اللہ! آپ کو بھی ''شرحِ صدر'' ہونے لگا۔ مطلب یہ تھا کہ کافی تجربہ کے بعد جاکر آدمی کو یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کسی بات پر ''شرحِ صدر'' عطا فرمادیتے ہیں۔ اب یہ طالبِ علم جو ابھی ''طفلِ مکتب'' تھے اور جمعہ جمعہ آٹھ دن اس کو پڑھے ہوئے ہوگئے اور اب بڑوں کے سامنے کہہ رہے ہیں کہ میرا ''شرحِ صدر'' ہوگیا۔

جہلِ مرکب والے شخص کو شرحِ صدر

بعض اوقات کوئی آدمی ''جہلِ مرکب'' میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ بھی ''شرحِ صدر'' ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس کو پکا یقین ہوتا ہے کہ میں جو سمجھ رہا ہوں، وہ بالکل صحیح ہے۔ ایک شخص چلتے پھرتے آدمی تھے اور بظاہر مولوی بن گئے تھے، ان سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس مسئلہ کا جواب دیا کہ ''میرے نزدیک یہ ناجائز ہے۔''

ایک بڑے عالم نے ایک عربی شعر میں اس کا جواب دیا کہ ؎

يَقُوْلُوْنَ هٰذَا عِنْدَنَا غَيْرُ جَائِزٍ

فَمَنْ أَنْتُمُوْ حَتّٰى يَكُوْنُ لَكُمْ عِنْده

یعنی تم ہو کون؟ کہ تمہیں ''عندی'' کہنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ بہرحال! بعض اوقات ''جہلِ مرکب'' والے کو بھی ''شرحِ صدر'' ہو جاتا ہے تو وہ ''شرحِ صدر'' شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔

''شرحِ صدر'' انسان کے اختیار میں نہیں

لیکن یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں کہ ''رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ'' اے میرے پروردگار! میرا سینہ کھول دیجیے۔ اس کھلے ہوئے سینے کی ہمیں ہر جگہ ضرورت ہے، ہر قدم پر ضرورت ہے، ہم جو کام کر رہے ہیں، اس پر دل مطمئن ہو کہ ہم یہ کام صحیح کر رہے ہیں ''الحمدللہ''۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ہر وقت مانگنے کی بھی ضرورت ہے کہ یا اللہ! میرا سینہ کھول دیجیے۔ یہ سینہ کا کھل جانا اور

کشمکش سے نکل جانا اور صحیح راستہ اختیار کر لینا اور اس پر مکمل اطمینان بھی حاصل ہوجانا، یہ چیز انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہے۔ بہر حال! پہلی چیز جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مانگی، وہ ''شرحِ صدر'' تھی۔

میرے سارے کاموں کوآسان کردے

وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي

اور میرے سارے کاموں کوآسان کردے۔

ان کو کتنے بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں کہ یہاں سے سفر کر کے پہلے مصر جانا، جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں، جہاں ان کے خلاف ''قتلِ عمد'' کا مقدمہ چل رہا ہے، جہاں ان کو پکڑنے والے لوگ موجود ہیں اور وہاں پر فرعون کے دربار تک پہنچنا اور دربار میں پہنچ کر فرعون کی مرضی کے بالکل خلاف بات کرنا، یہ سارے کام پہاڑ کی طرح تھے، لیکن کتنا بھی بڑا پہاڑ ہو، اللہ سے مانگنا ہے کہ یااللہ! میرے لئے اس کو آسان کر دیجئے۔

جس کا اللہ اس کو پریشانی کیوں؟

لہٰذا جب بھی کسی انسان کو کوئی مشکل پیش آئے یا بڑا مسئلہ درپیش ہو اور وہ بہت مشکل نظر آرہا ہو تو اس وقت کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو؟ ارے جس کا اللہ ہو، اس کو پریشانی کیوں ہو؟ یہ مانگو کہ یااللہ! یہ مشکل نظر آرہا ہے اور کہو ''يَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي'' یہی عبدیت اور بندگی کا تقاضا ہے کہ بندہ محتاج بن کر اللہ سے کہے کہ یااللہ! میرے لئے آسان کر دیجئے۔

آپ آسان کام اختیار فرماتے

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ:

مَا خُيِّرَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا[1]

جب آپ کو دو چیزوں میں اختیار دیا جاتا کہ چاہو تو یہ کرلو، چاہو تو یہ کرلو، تو ان میں سے جو آسان چیز ہوتی، آپ اس کو اختیار فرماتے۔

اگر کوئی جعلی پیر ہو تو وہ مشکل راستہ اختیار کرے گا، تاکہ مریدین یہ دیکھیں کہ ہمارا پیر کتنا بڑا مجاہد ہے، اتنا بڑا مشکل کام کر رہا ہے، لیکن سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں تو آسان راستہ اختیار کرتا ہوں۔ یہ بندگی کا تقاضا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے طاقت کا اظہار نہیں کرنا، بلکہ اُس کے سامنے تو بندگی اور عاجزی کا اظہار کرنا ہے کہ یااللہ! یہ کام میرے بس میں نہیں ہے، آپ میرے لئے آسان کردیں گے تو یہ کام ہوجائے گا، آپ کی آسانی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

آسانی کے لئے یہ دُعا مانگو

اللہ تعالیٰ سے ہر کام میں آسانی مانگو اور کہو:

اَللّٰهُمَّ الْطُفْ بِيْ فِيْ تَيْسِيْرِ كُلِّ عَسِيْرٍ، فَإِنَّ تَيْسِيْرَ

(۱) صحیح البخاری ۸ / ۱۶۰ (٦٧٨٦)

كُلُّ عَسِيْرٍ عَلَيْكَ يَسِيْرٌ [1]

اے اللہ! میرے ساتھ مہربانی فرمائیے۔ اور میرے ہر مشکل کام کو آسان بنا دیجئے۔ اس لئے کہ ہر مشکل کو آسان بنانا آپ کے لئے آسان ہے۔

لہٰذا بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ آسان راستے کو اختیار کرے۔ مثلاً مسجد جانا ہے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لمبا راستہ پیدل طے کر کے پہنچے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گاڑی میں بیٹھ کر چلا جائے۔ اب اگر "واک" کرنے یا ورزش کرنے کا خیال ہے یا یہ نیت ہے کہ مسجد میں جانے میں جتنے قدم ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شمار کئے جائیں گے تو الگ بات ہے۔ لیکن گاڑی کی سہولت موجود ہونے کے باوجود اپنے آپ پر زبردستی کر کے آدمی پیدل جا رہا ہے اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ میں تو اتنا مشکل راستہ اختیار کر رہا ہوں اور زیادہ مشقت برداشت کر رہا ہوں تو یہ طریقہ سنت کے خلاف ہے۔ سنت یہ ہے کہ آدمی اپنے لئے آسانی کا راستہ تلاش کرے۔ اس لئے فرمایا کہ یہ دُعا کرو:

وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ

میری زبان کی گرہ کھول دیجئے

تیسری دُعا فرمائی:

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ

---

(۱) الدعوات الكبير للبيهقى ۱ / ۳۵۸ (۲۶۷) وقال عبدالرحمن بن ابراهيم هذا مدنى فى حديثه ضعف

اے اللہ! میری زبان سے گرہ کھول دیجئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک میں ہلکی سی لکنت اور رکاوٹ تھی، لیکن ایک رکاوٹ ظاہری ہوتی ہے اور ایک رکاوٹ معنوی ہوتی ہے، یعنی بظاہر زبان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن بولا نہیں جارہا ہے تو یہ رکاوٹ معنوی ہے، ہم جیسے لوگ جو وعظ اور تقریر کرنے والے ہیں، وہ بعض اوقات اس گھمنڈ میں آجاتے ہیں کہ ہم نے بڑی اچھی تقریر کی، ہم نے بڑا اچھا بیان کیا، ہم نے لوگوں کو بیان کے ذریعہ مسحور کردیا، ہمارے بیان پر لوگ رو رہے تھے، ان پر گریہ طاری تھا۔ یاد رکھئے! یہ سب اللہ جل جلالہ کی ''عطا'' ہوتی ہے، اگر کسی وقت وہ ''عطا'' واپس لے لے، تمہاری مجال ہے کہ تم کچھ بیان کرسکو۔ یہ جو زبان رواں ہوجاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ زبان کی ''گرہ'' کھول دیتے ہیں، اگر ان کی طرف سے ''گرہ'' ڈال دی جائے تو پھر ہزار ہا مضامین بھی تمہارے دماغ میں آرہے ہوں، لیکن زبان پر کوئی لفظ نہیں چلے گا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دُعا فرمائی۔

وہ لوگ میری بات سمجھ بھی لیں

چوتھی دُعا یہ فرمائی ''یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ'' کہ یا اللہ! اگر میری زبان کھل بھی گئی اور میں نے اچھی طرح دعوت بھی دیدی، لیکن میری بات ان کے دل میں نہ اُتری، اے اللہ! ایسا کردیجئے کہ وہ لوگ میری بات کو سمجھ بھی لیں اور وہ بات ان کے دل میں بھی اُتر جائے۔

بہرحال! یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے اور بزرگوں نے فرمایا کہ جب کسی

کوکہیں بیان کرناہو یا کسی کو درس دیناہو، اس درس سے پہلے یہ دُعا پڑھ لینی چاہئے۔ لیکن یہ دُعا صرف بیان، تقریراور درس وتدریس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ آدمی جہاں کہیں کسی کشمکش کا شکار ہوکہ یہ کام کروں یا نہ کروں، اس موقع پر یہ بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرلوکہ

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ۔

اپنی ہر حاجت اللہ سے مانگو

خلاصہ یہ کہ جو حاجت ہو، جو مسئلہ درپیش ہو تو ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ ''رجوع الی اللہ'' کرے، اسی کو ''انابت'' کہتے ہیں اور اسی کو ''اِخبات'' کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے فرمایا: ''مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ''[1] اَللّٰهُ يَجْتَبِيْ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ[2] اسی کو ''مُخْبِتْ'' بھی کہتے ہیں۔ یعنی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا ہو، اس کے ساتھ تعلق رکھنے والا ہو اور وہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے ہی مانگتا ہو۔ وہ ہے ''مُنیب''۔ قرآنِ کریم میں ہے:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ[3]

جب بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیتا ہے، رجوع کرنے کا عادی بن جاتا ہے تو اس کے اُوپر علوم وارد ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے اُوپر ایسے علوم وارد فرماتے ہیں جو دوسروں کے تصور میں بھی نہیں آتے۔

---

(۱) سورۃ الروم: آیت (۳۱)
(۲) سورۃ الشوریٰ: آیت (۱۳)
(۳) سورۃ سبا: آیت (۹)

اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے ہم سب کو رجوع الی اللہ کی توفیق عطا فرمادے اور اپنا ہر کام اور اپنی ہر حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دعا نمبر ۲۰

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۲۰

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! گذشتہ کئی ماہ سے ''مناجاتِ مقبول'' کی دُعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے۔ گذشتہ مجلس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا:

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ۝ (۱)

کی تشریح عرض کی تھی، اس کے بعد جو دُعا ''مناجات مقبول'' میں ذکر فرمائی ہے، یہ وہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلقین فرمائی کہ:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲)

---

(۱) سورۃ طٰہٰ: آیت (۲۵ تا ۲۸)

(۲) سورۃ طٰہٰ: آیت (۱۱۴)

یعنی آپ یہ کہا کیجئے کہ اے اللہ! مجھے علم میں ترقی عطا فرمایئے۔ میرے علم میں زیادتی پیدا فرمایئے اور جتنا علم مجھے حاصل ہے، اس سے زیادہ علم مجھے عطا فرمایئے۔

یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھلائی

یہ وہ دعا ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھائی جس کو اللہ تعالیٰ نے اوّلین وآخرین کا سب سے زیادہ علم عطا فرمایا تھا، اس کائنات میں جو علم نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل تھا، وہ علم نہ کسی کو پہلے حاصل ہوا اور نہ بعد میں کسی کو ہوسکتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے یہ تلقین فرمائی کہ آپ یہ دعا کیا کرو کہ "میرے علم میں اضافہ کردیجئے۔"

وحیِ الٰہی کے بوجھ کی شدت

پہلے تو یہ عرض کردوں کہ یہ دُعا جس سیاق وسباق میں آئی ہے وہ یہ کہ اس دُعا سے پہلے قرآنِ کریم میں الفاظ آئے ہیں کہ:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا [1]

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب وحی نازل ہورہی ہوتی تھی تو اس وقت اتنا بوجھ ہوتا تھا کہ سخت سردی کے موسم میں بھی آپ پسینہ پسینہ

---

(۱) سورۃ طٰہٰ: آیت (۱۱۴)

ہوجاتے تھے[1] اور وحی کا بوجھ اتنا ہوتا تھا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے زانو پر اپنا زانو مبارک رکھ کر لیٹے ہوئے تھے اور اس وقت آپ پر وحی نازل ہونی شروع ہوگئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بوجھ کی وجہ سے میری ران پھٹ جائے گی۔[2]

وہ بوجھ کس چیز کا تھا؟

کیا بوجھ تھا؟ وہ بوجھ یہ تھا کہ ''ملأاعلیٰ'' کے عالم سے جب کوئی چیز اس ''عالَم ناسوت'' کی طرف منتقل ہوتی ہے تو اس کا بوجھ بذاتِ خود اتنا ہوتا تھا کہ سردی کے زمانہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسینہ پسینہ ہوجاتے تھے، بہرحال! ایک طرف تو وحی کا بوجھ، دوسری طرف ایک اور بوجھ یہ تھا کہ یہ اللہ جل جلالہ کا کلام آرہا ہے اور یہ کلام صرف میرے لئے نہیں، بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے آرہا ہے اور مجھے اس کلام کو ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچانا ہے۔ لہٰذا اس کلام کا یاد رہنا بھی ضروری ہے اور صرف یاد رکھنا بھی کافی نہیں، بلکہ اس کلام کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور دوسروں سے عمل کرانا بھی ضروری ہے، لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی لفظ میں بھول جاؤں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لفظ کا مفہوم اور جو معنی اور اس کا جو مضمون ہے، میں اسے سمجھنے سے قاصر رہوں۔

---

(۱) صحیح البخاری ۹ / ۲۹ (۶۹۸۲)

(۲) صحیح البخاری ٤ / ٢٥ (٢٨٣٢)

بوجھ کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل

ایک طرف بذاتِ خود ''وحی'' کا بوجھ، دوسری طرف ''یاد رکھنے'' کا بوجھ اور تیسرے اس کو ''سمجھنے کی کوشش'' کا بوجھ۔ اس بوجھ کی وجہ سے آپ یہ عمل کرتے کہ اِدھر حضرت جبرئیل علیہ السلام ''وحی'' نازل کررہے ہیں اور قرآنِ کریم کی تلاوت کررہے ہیں اور اُدھر ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ آیات دُہراتے جاتے تھے، اس خیال سے کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ چنانچہ اللہ جل شانہ نے اپنے محبوب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے یہ برداشت نہیں فرمایا کہ میرا محبوب اتنے سارے بوجھ اُٹھائے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں دو مقامات پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی کہ چلو ''وحی'' کا جو بوجھ ہے، وہ تو اپنی جگہ ہے، اس لئے کہ یہ ''عالمِ ناسوت'' ہے، یہ انسانوں کا عالم ہے، اور وحی ''عالمِ ملکوت'' سے آرہی ہے اور فرشتہ لے کر آرہا ہے، اس لئے یہ طبعی بات ہے کہ اس کا وزن اور بوجھ ہونا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی

لیکن آپ کو ''یاد رکھنے'' کا جو بوجھ ہورہا ہے اور اس کو سمجھنے کا بوجھ ہورہا ہے، اس کو آپ بھول جائیے، یہ ہمارا کام ہے، چنانچہ سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ[1]

---

(۱) سورة القيامه: آیت (١٦ - ١٧)

آپ جو اپنی زبان پڑھنے کے لئے حرکت دیتے رہتے ہیں، تاکہ یہ وحی جلدی سے یاد ہوجائے، ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اس وحی کو آپ کے سینہ مبارک میں محفوظ کرنا، یاد کرانا ہماری ذمہ داری ہے، آپ یہ فکر چھوڑ دیجئے کہ یہ یادرہے گا یا نہیں۔ اور "وقرانہ" یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم آپ کو اس کے پڑھنے کا سلیقہ بھی سکھائیں کہ جس طرح یہ نازل ہورہا ہے، اسی طرح آپ لوگوں کو پڑھائیں اور سکھائیں۔ جن الفاظ کے ساتھ اور جس تلفظ کے ساتھ اور جس انداز میں نازل ہورہا ہے، اسی انداز میں دوسروں تک پہنچانا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم آپ کی زبان سے اسی طرح پڑھوائیں گے۔

یہ ساری ذمہ داریاں ہم لیتے ہیں

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ [1]

اور جب ہم پڑھیں گے، یعنی ہمارا فرشتہ پڑھ کر سنائے گا تو جس طرح اس نے پڑھا ہے، بعد میں اس کا اتباع کیجئے۔ ہم خود آپ کے دل میں ڈال دیں گے کہ کس طرح پڑھنا ہے اور پھر اس کا اتباع کیجئے۔ پھر ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کا مطلب آپ کو سمجھائیں اور اس کا مضمون آپ کے دل میں محفوظ کریں، اس کی تشریح اور تفسیر کریں۔ یہ ساری ذمہ داریاں ہم لیتے ہیں، آپ بس صرف سنتے جائیں کہ کیا وحی نازل ہورہی ہے؟ سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ تسلی دی۔

---

(۱) سورۃ القیامہ: آیت (۱۸ - ۱۹)

آپ ہم سے صرف یہ دعا کریں

اسی طرح تسلی دیتے ہوئے یہاں پر سورۂ طٰہٰ کی آیت میں بھی اللہ تعالیٰ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمارہے ہیں:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۱)

کہ آپ قرآنِ کریم پڑھنے میں جلدی نہ کیا کریں، جب تک اس آیت کا نزول اور اس کی وحی پوری نہ ہوجائے، بلکہ آرام سے سنیں، آپ کو پڑھنے کی ضرورت نہیں اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم آپ کو یاد کرادیں گے، آپ کا کام یہ ہے کہ آپ ہم سے بس اتنا کہہ دیا کریں:

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

اے میرے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔

بس یہ دعا کرلیا کریں۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سکھادیا کہ جس کا کام ہونا یقینی ہے اور اس کے ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا کہ ہم تم سے پڑھوائیں گے، ہم یاد کرادیں گے، ہم تشریح کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، یعنی جس چیز کا ملنا یقینی ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو اور کہو: یااللہ! میرے علم میں اضافہ کردیجئے۔

---

(۱) سورة طٰهٰ: آیت (۱۱٤)

جس کا ملنا یقینی ہے، وہ بھی مانگو

کتنا بڑا عظیم سبق دیا جارہا ہے، دراصل اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ بندہ اس کے قریب ہو۔ اور قریب کیسے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ سے مانگ مانگ کر قریب ہوگا، اللہ تعالیٰ کے سامنے منگتا بن کر قریب ہوگا، جتنا اللہ تعالیٰ سے مانگے گا، اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا اور صرف وہ چیز نہیں مانگنی جو مشکوک اور مشتبہ ہے، بلکہ وہ چیز جس کا ملنا یقینی ہے، وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے مانگو۔ دیکھیے! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعا کررہے ہیں کہ:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ اَسْاَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ (۱)

اے اللہ! میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور وہ قول وعمل مانگتا ہوں جو مجھے جنت تک پہنچادے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے پہلے ہی اعلان ہوچکا ہے کہ:

قَدْ غَفَرَ اللّٰـهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (۲)

اور یہ اعلان ہوچکا کہ آپ کا جنت میں جانا یقینی ہے، اگر آپ جنت میں نہیں جائیں گے تو کون جائے گا؟ اس کے باوجود مانگ رہے ہیں: "إنی

---

(۱) سنن ابن ماجه ٥ / ٣٦٥ (٣٨٤٦) وقال البوصيرى فى "مصباح الزجاجة" ٤ / ١٤١: هذا اسناد فيه مقال أم كلثوم هذه وعدها جماعة فى الصحابة وفيه نظر لأنها ولدت بعد موت أبى بكر وباقى رجال الاسناد ثقات.

(۲) صحيح البخارى ٦ / ١٣٥ (٤٨٣٦)

أسئلك الجنّة" اے اللہ! میں آپ سے جنت کا سوال کرتا ہوں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

اور یہی سنت ہے۔ یہ جو بعض صوفیاء سے منقول ہے کہ جب ان کی موت کا وقت آیا تو ان کو جنت دکھائی گئی کہ تمہیں ہم یہاں لے جانے والے ہیں، اس جنت کی خوشنمائی، اس کا سبزہ، اس کی نہریں، اس کے دریا وغیرہ، سب دکھائے گئے اور کہا گیا کہ یہ تمہارا مقام ہے۔ ان بزرگ نے منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا:

إِنْ كَانَ مَنْزِلَتِيْ فِي الْحُبِّ عِنْدَكُمْ
مَا قَدْ رَأَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ أَيَّامِيْ

کہ آپ سے محبت میں میرا مرتبہ یہ تھا اور جنت کی یہ لذتیں تھیں، ان کے لئے میں نے عبادت کی تھی، اس لئے میں نے آپ کو پکارا تھا، اس لئے میں نے آپ سے محبت کی تھی کہ جنت کی یہ نعمتیں حاصل کروں؟ تو پھر میں نے اپنی زندگی ضائع کردی۔ مجھے تو کچھ اور چاہئے، یعنی آپ کی رضا چاہئے، آپ کا دیدار چاہئے، آپ کی محبت چاہئے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت نہیں

ان بزرگ کی یہ بات بظاہر تو بہت اُونچی لگتی ہے کہ جنت کی نعمتیں جو مادّی نعمتیں ہیں، یعنی حسین مناظر، کھانا پینا، حوریں، نہریں وغیرہ، وہ یہ سب نعمتیں نہیں چاہ رہے ہیں، بلکہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب اور اللہ کی محبت چاہتے ہیں، لیکن یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت نہیں ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتوں سے

بے نیازی اختیار کی جائے، بندہ کا کام یہ نہیں، بلکہ عبدیت کا اعلیٰ درجہ وہی ہے جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ

اے اللہ! مجھے جنت عطا فرما۔

البتہ وہ بزرگ صاحبِ حال بزرگ تھے، ان پر بھی کوئی تنقید نہیں کی جاسکتی۔

ہمارا جنت مانگنے کا مقصد مزہ ہے

لیکن جنت مانگنے، مانگنے میں فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ میں اور آپ اللہ تعالیٰ سے جو جنت مانگتے ہیں وہ اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں مزہ آئے گا، وہاں پرندوں کا گوشت ہوگا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب بندہ جنت میں پہلی مرتبہ پہنچے گا تو مچھلی کے جگر سے اس کی مہمانی کی جائے گی۔[1] جنت میں ایسی شراب پلائی جائے گی جس میں نشہ نہیں ہوگا اور کوثر اور تسنیم کا پانی پلایا جائے گا اور وہاں ہمارے سامنے سبزہ زار ہوں گے اور نہریں جاری ہوں گی، دریا جاری ہوں گے اور ہم اس سے لطف اندوز ہوں گے اور بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی اور خدمت کے لئے لڑکے ہوں گے جو خدمت کررہے ہوں گے، کتنا مزہ آئے گا، لہٰذا ہم جو جنت مانگ رہے ہیں، وہ مزہ لینے کے لئے مانگ رہے ہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری ٦ / ١٩ (٤٤٨٠)

جنت میں نہ خوف، نہ غم

یہاں دنیا میں تو ہر وقت خوف اور دھڑکا لگا رہتا ہے، جب کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر زیادہ کھالیا تو کہیں بدہضمی نہ ہوجائے اور اگر کوئی مشروب پی رہے ہیں تو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اچھو نہ لگ جائے۔ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی دھڑکا اور تکلیف پہنچنے کا اندیشہ لگا رہتا ہے، لیکن جنت کے بارے میں فرمایا کہ:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ [1]

وہاں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم ہوگا۔

اس لئے جنت کا تصور جب آتا ہے تو وہاں کے مزوں کا اور لطف اندوزیوں کا خیال آتا ہے، اس لئے ہم جنت مانگتے ہیں۔

جنت اللہ کی رضامندی کا مظہر ہے

لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت مانگ رہے ہیں، وہ درحقیقت اس لئے نہیں مانگ رہے ہیں کہ وہ مزے کی چیز ہے، بلکہ جنت کا اصل مزہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی رضامندی کا مظہر ہے، اللہ تعالی کی خوشنودی کا مظہر ہے، لہٰذا جنت کو مانگنے والے ہم اور آپ بھی ہیں اور جنت مانگنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں، ہم اور آپ کسی اور وجہ سے مانگ رہے ہیں اور وہ کسی اور وجہ سے مانگ رہے

---

(۱) سورۃ یونس: آیت (٦٢)

ہیں۔ وہ وجہ یہ ہے کہ وہ جنت اللہ تعالیٰ کی رضا کا مظہر ہے، اس لئے محتاج بن کر جنت مانگیں گے۔

انعام لینے والوں کی سوچیں مختلف

یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی باپ یا کوئی اُستاذ یا کوئی شیخ کسی کو انعام دیتا ہے مثلاً ایک شخص کو سو روپے انعام دیا، اب ایک شخص کو یہ انعام لیتے ہوئے یہ سوچ کر خوشی ہورہی ہے کہ ان سو روپے سے اتنی مرتبہ چائے پئیں گے، اس سے فلاں فلاں چیز خرید کر کھائیں گے اور بڑا مزہ آئے گا۔ دوسرا شخص وہ ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ اس ''سو روپے'' پر نہیں ہوتی، بلکہ دینے والے ہاتھ کی طرف ہوتی ہے کہ کس ہاتھ سے یہ سو روپے مل رہے ہیں؟ اس سوچ کی جو لذت ہے وہ ہزار کھانوں پر، ہزار چائے پر فوقیت رکھتی ہے کہ یہ مجھے بڑے یا باپ کی طرف سے یہ مل رہا ہے۔ بعض اوقات آدمی ان پیسوں کو خرچ بھی نہیں کرتا۔ خود میرے پاس بعض بزرگوں کے دیئے ہوئے پیسے اب تک رکھے ہیں، اور اب تو وہ چلنا بھی بند ہوگئے۔ لیکن وہ رکھے ہیں، وہ اس لئے نہیں رکھے ہیں کہ اس سے فلاں چیز خریدیں گے، بلکہ یہ سوچ کر رکھے ہیں کہ یہ میرے والد نے دیئے ہیں یا فلاں بزرگ نے دیئے ہیں یا میرے شیخ نے دیئے ہیں یا میرے اُستاذ نے دیئے ہیں۔ بالکل یہی فرق ہمارے اور آپ کے جنت طلب کرنے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنت طلب کرنے میں ہے۔

مبتدی اور منتہی کی حالت بظاہر یکساں

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص ''مبتدی'' ہوتا ہے اور جو

شخص ''منتہی'' ہوتا ہے، ظاہر میں ان دونوں کا حال ایک جیسا ہوتا ہے، یعنی جو شخص کام ابھی شروع کر رہا ہے اور جو شخص کام مکمل کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گیا، ان دونوں کی حالت دیکھنے میں ایک جیسی لگتی ہے اور جو لوگ درمیان میں ہوتے ہیں، جنہوں نے کام شروع تو کر دیا، لیکن ابھی انتہاء تک نہیں پہنچے، ان کا حال مختلف ہوتا ہے۔

تین قسم کے حالات

بالکل اسی طرح ہمارا جنت مانگنا یہ ''مبتدی'' کا مانگنا ہے یعنی جنت کے مزے حاصل کرنے کے لئے مانگنا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جنت مانگنا یہ ''منتہی'' کا مانگنا ہے، یعنی جنت کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا مظہر ہونے کی وجہ سے جنت طلب کر رہے ہیں۔ تیسرے ان بزرگ کا حال ہے، جنہوں نے یہ کہا کہ مجھے یہ جنت کی نعمتیں مطلوب نہیں، مجھے تو آپ کی رضا چاہئے، یہ درمیانی حالت ہے۔

ایک مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک مثال دی ہے، فرمایا کہ ایک آدمی دریا کے اس کنارے کھڑا ہے اور دوسرا شخص دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہے اور تیسرا وہ شخص ہے جو دریا کے بیچ میں ہے اور پانی کے اندر غوطے مار رہا ہے۔ فرمایا کہ جو شخص اس کنارے پر کھڑا ہے وہ تو دریا میں داخل ہی نہیں ہوا اور یہ ''مبتدی'' ہے اور جو شخص دریا کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہے وہ ساری

موجوں سے لڑ کر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا، اب دیکھنے میں دونوں ایک جیسے نظر آرہے ہیں کہ وہ بھی کنارے پر ہے اور یہ بھی کنارے پر ہے اور تیسرا شخص جو دریا میں غوطے مار رہا ہے، بظاہر وہ زیادہ بہادر نظر آرہا ہے، لیکن حقیقت میں افضل وہ ہے جو دوسرے کنارے پر پہنچ گیا ہے۔

نہ مانگنے والوں سے ناراض ہوتے ہیں

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس چیز کا حصول یقینی ہو، اس چیز کو بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی دعوت دی گئی ہے، چاہے ہم نے دینے کا وعدہ کر رکھا ہے، لیکن پھر بھی ہم سے مانگو، کیوں؟ اس لئے کہ تم جتنا مانگو گے، تم اتنا ہی میرے قریب آؤ گے اور میرا قرب حاصل ہوگا اور میری محبت بھی حاصل ہوگی، اس لئے کہ جو نہیں مانگتا، اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ:

مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ[1]

جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں کہ یہ ہم سے کیوں نہیں مانگتا؟ اور جو شخص جتنا مانگتا ہے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ چاہتے ہیں کہ مانگیں اور یقینی چیزیں بھی مانگیں۔

حافظہ قوی کرنے کا مجرب نسخہ

اس لئے فرمایا کہ بزرگوں کا تجربہ ہے کہ اگر کسی کا حافظہ کمزور ہو، وہ پڑھتا ہے مگر یاد نہیں رہتا تو وہ یہ دعا کیا کرے ''رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا'' اس سے حافظہ قوی

(۱) سنن الترمذی ۵ / ۳۸۷ (۳۳۷۳) و سنن ابن ماجه ۵ / ۳۵۳ (۳۸۲۷)

ہوگا۔ اسی طرح اگر سبق کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے تو یہ دُعا کیا کرے ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا''۔ اس لئے کہ اس دعا کے ذریعہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دو پریشانیاں دور کی گئیں، آپ کو ایک پریشانی یہ تھی کہ میں اس وحی کو یاد کس طرح کروں؟ دوسری پریشانی یہ تھی کہ اس کو کس طرح سمجھوں؟ ان دونوں پریشانیوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ یہ دعا کیا کرو کہ ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا''۔ لہٰذا اصل میں یہ دُعا حافظہ کی تقویت کے لئے، سمجھنے کی تقویت کے لئے سکھائی گئی، اس لئے بزرگوں نے فرمایا کہ یہ دُعا دونوں کاموں کے لئے فائدہ مند ہے۔

وہ خود کہہ رہے ہیں کہ یوں کہو

اور جب کسی دُعا سے پہلے اللہ تعالیٰ خود فرمائیں کہ ''قُلْ'' کہو تو پھر یہ ناممکن بات ہے کہ وہ ہم سے کہیں کہ یہ مجھ سے مانگو اور پھر جب مانگیں تو وہ یہ کہیں کہ میں نہیں دیتا۔ یہ بات تو اللہ تعالیٰ سے ممکن نہیں۔ لہٰذا جتنا مانگو گے، اتنا ہی ان شاء اللہ نتیجہ نکلے گا، حافظہ بھی بڑھے گا اور سمجھ بھی بڑھے گی۔ بہر حال! یہ باتیں تو اس آیت کے شانِ نزول سے متعلق تھیں جو میں نے عرض کیں۔

کائنات کے تمام علوم آپ پر قربان

اب اگر اس دعا کے مفہوم پر آدمی غور کرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! میرے علم میں اضافہ کیجئے۔ یہ بات اس ذات سے کہی جارہی ہے جو سید الاوّلین والآخرین ہیں، جن پر کائنات کے تمام علوم قربان ہیں ''صلی اللہ علیہ وسلم'' اس سے معلوم ہوا کہ ''علم'' ایسی چیز ہے جس کی کوئی حد ونہایت نہیں، یہ ''علم''

ایسی چیز ہے کہ انسان کو جتنا بھی حاصل ہو جائے، اس پر قناعت نہیں کرنی چاہئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْهُوْمَانِ لَا يَشْبَعَانِ: مَنْهُوْمٌ فِيْ عِلْمٍ لَا يَشْبَعُ، وَمَنْهُوْمٌ فِيْ دُنْيَا لَا يَشْبَعُ (۱)

دو حریص اور لالچی ایسے ہیں جن کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، ایک علم کا حریص جسے کبھی سیری نہیں ہوتی اور ایک مال کا حریص جس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔

حریص کا پیٹ قبر کی مٹی بھرے گی

اور حدیثِ قدسی ہے جس میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَوْ أَنَّ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُوْنَ لَهُ وَادِيَانِ، وَلَنْ يَمْلَأَ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ (۲)

اگر ابن آدم کو ایک وادی سونے کی بھری مل جائے تو وہ یہ کہے گا کہ دوسری وادی بھی چاہئے (اور جب دو وادیاں سونے کی بھری مل جائیں تو کہے گا کہ تیسری بھی چاہئے۔)

اس کے بعد کتنا بلیغ جملہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ

''ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی۔''

---

(۱) المستدرك للحاكم ۱ / ۱۶۹ (۳۱۲) وقال: هذا حديث صحيح على شرط البخاری ولم یخرجاه ووافقه الذهبي فی التلخيص۔

(۲) صحيح البخاری ۸ / ۹۳ (٦٤٣٩)

یعنی جب قبر میں چلا جائے گا تو قبر کی مٹی اس کا پیٹ بھر دے گی۔
بہرحال! ایک تو مال کی حرص ہے۔

علم کی پیاس نہیں بجھتی

اور دوسرے علم کی حرص، اس لئے کہ علم کا جو حریص ہوتا ہے، اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا، وہ ہرآن یہ چاہتا ہے کہ میرے علم میں اور اضافہ ہو اور اضافہ ہو اور اضافہ ہو، اس لئے کہ علم کی جو درگاہ ہے، یہ بے نہایت ہے، اس کی کوئی انتہاء نہیں، علم کے جس مقام پر پہنچ جاؤ، وہاں پر کھڑے مت ہو، بلکہ اپنا سفر جاری رکھو۔

''فارغ التحصیل'' کا لفظ نامناسب ہے

آج کل اُلٹا معاملہ ہوگیا ہے کہ مال میں تو خوب حرص ہے، قناعت نہیں، ہر وقت یہ خواہش بھی ہے اور کوشش بھی ہے کہ میرے مال میں اضافہ ہو۔ لیکن علم کے اندر قناعت ہے، جب درسِ نظامی پڑھ لیا اور دورۂ حدیث کر کے فارغ ہوگئے تو اب اپنے آپ کو لکھتے ہیں ''فارغ التحصیل'' اس کے کیا معنی؟ یعنی اب علم کے حاصل کرنے سے فارغ ہوگئے، اس لئے یہ لفظ ''فارغ التحصیل'' مجھے بہت برا لگتا ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب علم سے فراغت حاصل ہوگئی، اب یہاں آکر ٹھہر گئے، لہٰذا یہ کوئی اچھا لفظ نہیں ہے۔

علم میں اضافہ کی خواہش

حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے تو یہ کہا جارہا ہے کہ آپ یہ دعا کریں:

تو میں اور تم کہاں سے آ گئے جن کو علم پر قناعت ہو جائے کہ بس ہماری آخری سیڑھی آ گئی۔ ''دورۂ حدیث'' کرلینا تو درحقیقت علم حاصل کرنے کا آغاز ہوتا ہے، لہٰذا آدمی کو کسی وقت بھی قانع ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے، بلکہ علم کے میدان میں مسلسل آگے بڑھنا چاہئے۔ یہ صرف ان کے لئے نہیں ہے جو علمِ دین کے طالبِ علم ہیں، بلکہ ہر مسلمان کے لئے ہے، چاہے وہ عالم ہو یا جاہل ہو، پڑھا لکھا ہو، یا اَن پڑھ ہو، سب کے دل میں یہ خواہش اور دُعا ہونی چاہئے کہ میرے علم میں اضافہ ہو جائے۔

علم بمعنی ''جاننا'' کافی نہیں

''علم'' بمعنی ''جاننا'' یہ تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے، اگر آدمی پڑھا لکھا نہیں ہے، تب بھی وہ نماز پڑھ لیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا علم اس کو حاصل ہے۔ اگر وہ تسبیحات پڑھ لیتا ہے تو تسبیحات کا علم اس کو حاصل ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا اور قرآنِ کریم کا فرمانا یہ ہے کہ اس علم پر بس نہ کرے، بلکہ آگے پڑھے اور یہ دعا کرے کہ ''یا اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما۔''

ان باتوں کا علم ہونا چاہئے

اگر ہم سب اس دعا کو اپنی زندگیوں پر منطبق کر کے دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ مثلاً جن لوگوں کو نماز پڑھنی تو آتی ہے، لیکن وہ نماز صحیح پڑھتے ہیں یا اس میں غلطیاں ہوتی ہیں؟ نماز کے فرائض کتنے ہیں؟ اس کے واجبات کتنے ہیں؟ اس

کی سنتیں کتنی ہیں؟ اس کا علم حاصل کرنا ہر مؤمن کے لئے ضروری ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو اس کو یہ علم ہونا چاہئے کہ نماز کے اندر کون سی چیز فرض ہے، کون سی واجب ہے؟ کون سی سنت ہے؟ اور کس چیز کے چھوٹ جانے سے نماز خراب ہو جائے گی اور کس چیز کے چھوٹ جانے سے نماز باقی رہے گی؟ اسی طرح یہ علم ہونا چاہئے کہ وضو کے اندر کتنے فرائض ہیں؟ کتنی سنتیں ہیں؟ ایک صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی، اس سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو پتہ ہے کہ وضو میں کتنے فرائض ہیں؟ اس نے کہا: جی ہاں! ایک ہاتھ دھونا۔ دوسرے کلی کرنا۔ ایک ناک میں پانی ڈالنا۔ ان سب کو اس نے فرائض میں شمار کر دیا۔ مدتوں سے وضو کرتے آرہے ہیں اور نماز بھی پڑھتے آرہے ہیں، لیکن یہ پتہ نہیں کہ کون سی چیز فرض ہے، کون سی چیز واجب ہے، کون سی چیز سنت ہے؟

علم میں اضافہ کرو

بھائی! اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرلیا کرو کہ ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا'' یا اللہ! میرے علم میں اضافہ کیجئے۔ ان سب چیزوں کا جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان کے لئے فرضِ عین ہے، مثلاً کس چیز سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ اور کس چیز سے نماز نہیں ٹوٹتی؟ اسی طرح انسان زندگی میں جن کاموں کے اندر مصروف ہے، مثلاً ایک آدمی تاجر ہے تو اس کو یہ علم ہونا چاہئے کہ کون سی تجارت حلال ہے؟ اور کون سی تجارت حرام ہے؟ کون سا معاملہ جائز ہے؟ اور کون سا معاملہ ناجائز ہے؟ بہرحال! یہ دُعا انسان اس نیت سے کرے کہ یا اللہ! جن چیزوں کا جاننا میرے ذمہ آپ نے ضروری لگایا ہے، اے اللہ! مجھے اس کا علم عطا فرما دیجئے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

اور جب ایک مرتبہ علم کی چاٹ لگ جاتی ہے اور علم کا ذوق اور اس کی طلب پیدا ہوجاتی ہے تو پھر انسان کو کسی وقت بھی علم میں اضافے سے قرار نہیں آتا، ہر وقت وہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتا ہے اور اپنے علم میں اضافہ کر رہا ہوتا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بسترِ مرگ پر تھے، ایک شاگرد آپ سے ملنے آیا، آپ کی خیریت پوچھی، آپ نے اس کو جواب دیدیا اور پھر اس شاگرد سے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ حج کی رمی سوار ہوکر کرنا افضل ہے یا پیدل کرنا افضل ہے؟ اس شاگرد نے جواب دیا کہ پیدل کرنا افضل ہوگی۔ آپ نے فرمایا: نہیں، شاگرد نے کہا کہ تو پھر سوار ہوکر کرنا افضل ہوگی، آپ نے فرمایا: نہیں، اس شاگرد نے کہا کہ حضرت! پھر آپ ہی بتا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ جس رمی کے بعد رمی ہو (جیسے دس اور گیارہ کی رمی) اس کو پیدل کرنا افضل ہے۔ شاگرد کہتے ہیں کہ میں یہ علم حاصل کر کے ان کے گھر سے باہر نکلا اور ابھی چند قدم چلا تھا کہ گھر سے آواز آئی کہ امام صاحب کا انتقال ہوگیا۔[1] گویا کہ آخری وقت میں ایک علمی مسئلہ ذہن میں چکر لگا رہا تھا۔ انہوں نے ''رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا'' کی دُعا مانگی ہوگی، وہ دُعا قبول ہوگئی۔

علمِ ظاہر بھی اور علمِ باطن بھی

میرے والدِ ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جو آخری عمل تھا اور

---

(۱) بدائع الصنائع ۲ / ۱۵۸ طبع دار الکتب العلمیة

جس کے بعد ان کی وفات ہوگئی، وہ ایک استفتاء کا جواب تھا، لہٰذا آخر وقت تک علم میں اضافے کی طلب یہ ہر انسان میں ہونی چاہئے اور جب تک یہ طلب نہ ہو، اس وقت تک انسان ترقی نہیں کرسکتا۔ چاہے وہ ''علمِ ظاہر'' ہو، چاہے ''علمِ باطن'' ہو۔ کہ میں کس طرح اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کروں؟ کس طرح میرا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہوجائے؟ کس طرح میں اللہ تعالیٰ کو راضی کروں؟ یہ سارے علم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہیں۔ لہٰذا اس دعا کو اپنا وظیفہ بنالو کہ ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا''۔ اے اللہ! ہمارے علم میں اضافہ فرمایئے۔ اور پھر اس علم سے فائدہ اُٹھانے کی بھی توفیق عطا فرمایئے اور علمِ نافع عطا فرمایئے۔ اس لئے کہ محض ''جان لینا'' علم نہیں، جب تک کہ وہ علم انسان کی زندگی میں داخل نہ ہو، اور اس کے عمل میں داخل نہ ہوجائے، لہٰذا اے اللہ! ایسا علم عطا فرمایئے جو آپ کے نزدیک علم ہے اور جو علم اہلِ دنیا کے نزدیک علم ہے اور جو صرف ''جاننے کی حد تک'' علم ہے، جو انسان کے عمل پر اور اس کے کردار پر اثر انداز نہیں ہوتا، وہ علم نہیں، بلکہ وہ جہل ہے۔ اے اللہ! ہمیں صحیح علم عطا فرما۔ اور ہر بندہ چاہے وہ عالم ہو، چاہے وہ جاہل ہو، چاہے وہ پڑھا ہوا ہو، چاہے اَن پڑھ ہو، سب کو یہ دُعا مانگنی چاہئے کہ:

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دعا نمبر ۲۱

أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ

فہرستِ مضامین

دعا نمبر ۲۱

أَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ''مناجاتِ مقبول'' کی دُعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے۔ گذشتہ مجلس میں ''رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا'' پر گزارشات پیش کی تھیں، اس کے بعد جو دعا ہے، وہ یہ ہے کہ:

أَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ [1]

یہ بھی عجیب شان کی دعا ہے اور حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو منسوب فرمایا ہے۔ سورۃ الانبیاء میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سے انبیاء کرام کا ذکر فرمایا ہے اور ان انبیاء پر جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے فرمائیں، ان نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور کن کن مشکلات میں اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی،

(۱) سورۃ الانبیاء: آیت (۸۳)

اس کا بھی اس سورت میں ذکر فرمایا ہے۔

مجھے دُکھ چھو گیا ہے

اسی سیاق میں فرمایا:

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ

اور ایوب کو دیکھو، یعنی ان کے حالات پر غور کرو، جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا تھا کہ میری حالت یہ ہے کہ مجھے دُکھ چھو گیا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہہ دو کہ "مجھے دُکھ لگ گیا ہے" اور آپ سارے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔

اس دعا کی شان یہ ہے کہ اس دُعا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کوئی فرمائش نہیں کی، یعنی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے شفاء دے دیجئے، بلکہ یہ فرمایا کہ "مجھے دُکھ چھو گیا ہے" اور آپ سارے رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حالت پیش کردی اور اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان کردی کہ آپ سے زیادہ رحم کرنے والا اس کائنات میں کوئی اور نہیں ہے۔ آپ خود اس صورتِ حال میں میرے حال پر رحم فرمائیں گے۔ یہ چیز آپ کے "ارحم الراحمین" ہونے کے عین شایانِ شان ہے۔

صبر کا بہت اُونچا مقام

یہ واقعہ اللہ تعالیٰ نے چند مختصر لفظوں میں بیان فرمادیا کہ یہاں اللہ تعالیٰ

نے حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے، اس لئے فرمایا ''أَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ'' ہم اگر خود دُعا مانگیں تو یوں کہیں گے ''أَنِّیْ'' حضرت ایوب علیہ السلام کا کیا واقعہ تھا؟ اتنی بات تو اکثر لوگوں کو معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے صبر کا بہت اُونچا مقام عطا فرمایا تھا اور ایک مدت تک ان کو ایک سخت بیماری نے پکڑا ہوا تھا اور اسی بیماری میں انہوں نے یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا عطا فرمادی۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی جائے پیدائش

تاریخی روایات [1] میں اس کی کچھ تفصیلات آئی ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کچھ زمانہ پہلے یا کچھ زمانہ بعد پیدا ہوئے تھے، اور جزیرۂ عرب میں پیدا ہوئے تھے، اس وقت جو ملک ہے ''عمان'' جس کا دارالحکومت ''مسقط'' ہے، جس کی ایک بندرگاہ ''سلالہ'' ہے، وہاں ایک مزار ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کا مزار ہے، میں بھی اس مزار پر حاضر ہوا ہوں، وہاں پر ایک پتھر پر حضرت ایوب علیہ السلام کے پاؤں کا نشان موجود ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت ایوب علیہ السلام نے زمین پر پاؤں مارا تھا، اور وہاں سے پانی اُبل پڑا تھا جس کا قرآنِ کریم میں ذکر ہے، واللہ اعلم

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ [2]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: البداية والنهاية لابن كثير ١ / ٢٢٠ قصة أيوب عليه السلام

(۲) سورة ص: آيت(٤٢)

دین اور دُنیا دونوں اعتبار سے خوشگوار زندگی

لیکن روایات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام جزیرۂ عرب میں تھے اور جزیرۂ عرب کا جو جنوب مغربی حصہ ہے، وہاں پر ایک بستی تھی، اس بستی میں آپ پیدا ہوئے۔ ایک طرف ان کی نیکی، تقویٰ، راست بازی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا پورے علاقے میں شہرہ تھا کہ آپ متقی پرہیز گار آدمی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بہت عبادت کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیاوی مال و اسباب بھی بہت عطا فرمایا تھا۔ اس زمانے میں مال و دولت کا مظاہرہ ''مویشیوں'' کی شکل میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کے پاس سینکڑوں مویشی موجود تھے اور باغات تھے اور اولاد بھی خوشحال تھی اور ان کی اولاد نے آپس میں یہ طے کیا ہوا تھا کہ ہر ہفتہ میں ایک دن ایک بھائی یا ایک بہن تمام بہن بھائیوں کی دعوت کرے گی اور اس دعوت میں سب جمع ہوتے، کھاتے پیتے، گفتگو کرتے اور خوشحالی کے ساتھ زندگی گزارتے، اور حضرت ایوب علیہ السلام ان کے اُوپر سے نظر اُتارا کرتے تھے اور ان کے لئے برکت کی دعا کیا کرتے تھے۔

بائبل کے ''صحیفۂ ایوبی'' میں آپ کے حالات

لیکن اچانک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر ایک آزمائش آئی، پیغمبر تھے، متقی پرہیز گار تھے، عبادت گزار تھے، دنیاوی اعتبار سے انتہائی خوشحال تھے، اس آزمائش کے بارے میں ایک اسرائیلی روایت میں مذکور ہے۔ اسرائیلی روایت کا

حکم یہ ہے کہ نہ اس کی تصدیق کرنا ضروری ہے اور نہ اس کی تکذیب کرنا ضروری ہے، [1] لیکن وہ سبق آموز ہے۔

بائبل میں حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف ایک پورا صحیفہ "صحیفۂ ایوبؑ" کے نام سے موجود ہے، اس صحیفہ میں حضرت ایوب علیہ السلام کے حالات بھی مذکور ہیں اور آپ کے ملفوظات بھی ہیں۔

فرشتہ اور شیطان کا مکالمہ

اس صحیفہ میں یہ بات لکھی ہے کہ ایک مرتبہ ایک شیطان اور فرشتہ کے درمیان مکالمہ ہوا، فرشتہ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیطان سے کہا کہ: تو یہ کہا کرتا تھا کہ میں آدم کے سارے بیٹوں کو گمراہ کروں گا، چاروں طرف سے ان پر حملے کروں گا، ایوب علیہ السلام کو دیکھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کیسے پرہیزگار بندے ہیں، ایک طرف ان کو عبادت میں اُونچا مقام حاصل ہے، دوسری طرف ان کی دنیوی زندگی بھی بڑی شاندار ہے اور ان کے پاس دنیا کا اتنا مال ودولت ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب لوگوں کے پاس دولت آجاتی ہے تو یہ مال ان کو گمراہ کردیتا ہے اور ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے دور کردیتا ہے، لیکن اس نیک بندے کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی اتنی دولت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں کوئی کمی نہیں آئی۔

---

(۱) صحیح البخاری ٦ / ٢٠ (٤٤٨٥)

میں ذرا سا اِن پر سایہ ڈال دوں تو بس

فرشتہ کی یہ باتیں سن کر شیطان نے شیخی بھگارتے ہوئے کہا کہ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ یہ بہت پرہیز گار، نیک اور متقی آدمی ہیں، میں ذرا سا ان کے اُوپر سایہ ڈال دوں تو پھر تم دیکھنا کہ ان کا تقویٰ اور پرہیز گاری کہاں جاتی ہے؟ اور ابھی تو یہ اللہ کے بہت بڑے بندے بنے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق بہت مضبوط نظر آتا ہے، میں اگر ان پر اپنا ایک سایہ ڈالوں، پھر تم دیکھنا کہ یہ اللہ سے کیسے غافل ہوجائیں گے؟

اس صحیفہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ شیطان نے یہ بھی کہا کہ جب میں ان کو جا کر چھوؤں گا تو یہ اللہ تعالیٰ کی تکفیر کردیں گے اور اُسے بھول جائیں گے۔

آپ کے مال اور اولاد کا ہلاک ہوجانا

فرشتے نے کہا کہ مجھے نہیں لگتا کہ یہ اس حالت میں بھی اپنے پروردگار سے جدا ہوجائیں گے۔ چنانچہ شیطان آیا اور اس نے اپنا کرتب دکھایا، جس علاقے میں حضرت ایوب علیہ السلام رہتے تھے، اس کے قریب کافروں کی حکومت تھی جس کا نام ''ملک سبا'' تھا، سبا کے لوگ اچانک ان کی بستی پر حملہ آور ہوئے اور ان کے جتنے جانور اور مویشی تھے، وہ سب اُٹھا کر لے گئے۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ ایک زور کی آندھی آئی اور اس آندھی کے نتیجے میں ان کی آل واولاد سب ہلاک ہوگئے۔ صرف حضرت ایوب علیہ السلام اور ان کی بیوی تنہا رہ گئے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کو جب پتہ چلا کہ میرے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہوگیا ہے کہ میری اولاد

بھی چلی گئی اور میرا ساز و سامان اور مال ومنال سب رخصت ہوگیا تو اس وقت حضرت ایوب عَلَیْہِ السَّلَام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی شکوہ نہیں کیا، بلکہ اس مصیبت پر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ویسا ہی تعلق برقرار رکھا، جیسا پہلے تھا۔

ابھی تو آدھا ہاتھ پڑا ہے

اس موقع پر فرشتہ نے شیطان سے کہا کہ دیکھو! تم نے جا کر ان کی اولاد کو بھی ختم کر دیا اور ان کا مال بھی سارا لوٹ لیا گیا، پھر بھی دیکھو کہ وہ کس طرح صبر کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ تم یہ کہتے تھے کہ جب میں ان پر اپنا سایہ ڈالوں گا تو پھر دیکھنا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق کیسے برقرار رہتا ہے؟ لیکن سارے مصائب آنے کے بعد بھی یہ شخص اللہ تبارک و تعالیٰ سے رجوع کئے ہوئے ہے۔

شیطان نے کہا کہ ابھی تو میرا آدھا ہاتھ پڑا ہے اور جب میں پورا ہاتھ ان پر ڈال دوں گا، اس وقت تم دیکھنا کہ ان کا کیا حال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق کیسے برقرار رہتا ہے؟

آپ جِلدی بیماری میں مبتلا ہو گئے

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ان پر بیماری آگئی، کیا بیماری تھی؟ اس کی تفصیل نہ تو قرآنِ کریم میں بیان ہوئی ہے، نہ کسی صحیح حدیث میں اس کا تذکرہ آیا ہے، البتہ "صحیفۂ ایوبی" جو بائبل میں موجود ہے، اس میں یہ مذکور ہے کہ ان کو جِلدی بیماری ہوگئی تھی اور ان کے جسم پر پھوڑے پھنسی نکل آئے تھے، لیکن

اس پر لوگوں نے قیاس آرائیاں کی ہیں کہ ان کو ایسی بیماری ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں لوگ ان سے گھن کرنے لگے تھے اور اُن کی آل واولاد بھی ان سے نفرت کرنے لگی تھی اور ان کو ''کوڑی'' پر ڈال دیا گیا تھا۔ یہ سب واہیات اور فضول قسم کی روایتیں ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جب اپنے انبیاء علیہم السلام کو بھیجتے ہیں تو ایسی بیماریوں سے اور ایسی حالتوں سے محفوظ رکھتے ہیں جو لوگوں کے لئے نفرت کا باعث ہوں، لہٰذا ان روایات کی کوئی اصل نہیں، بیشک بیماری تھی اور لمبی بیماری تھی، لیکن یہ صورتِ حال ہرگز نہیں تھی۔ بہرحال! ایک طرف تو یہ بیماری آگئی اور بیماری بھی ایسی جو تکلیف دہ بیماری تھی اور اس کے علاوہ یہ کہ مال ومنال ضائع ہوگیا اور اولاد ہلاک ہوگئی۔ لیکن حضرت ایوب علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔

تین دوستوں کا آپ سے مناظرہ

اسی حالت میں ایک اور آزمائش آئی، وہ یہ کہ ان کے تین دوست تھے اور ان کی بیماری کی حالت میں وہ دوست ان کے پاس آئے اور ان میں سے ہر ایک نے ان کے سامنے دلائل پیش کرکے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آپ کو یہ جو بیماری آئی ہے، وہ آپ کے کسی سخت گناہ کی وجہ سے آئی ہے۔ اس گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہیں۔ جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں! میرا مالک مجھ سے ناراض نہیں ہے اور تم مجھے بار بار یہ کہتے ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں، لہٰذا میرے اور اللہ کے درمیان ایک بُعد (دوری) پیدا ہوجائے تو میں تمہاری یہ بات نہیں مانوں گا۔ میرا اللہ مجھ سے

قریب ہے، میرا اللہ مجھ سے راضی ہے اور اس بات پر حضرت ایوب علیہ السلام نے دلائل پیش کئے۔ ''صحیفہ ایوبی'' پورا ان کے مناظروں پر مشتمل ہے۔

بائبل کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب

کہا جاتا ہے کہ ''بائبل'' میں انبیاء کے جتنے صحیفے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قدیم صحیفہ ''صحیفہ ایوبی'' ہے اور بلاغت اور فصاحت کے اعتبار سے بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ اور یہ اصل میں عربی زبان میں تھا، بعد میں اس کا ''عبرانی'' زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اس کے بعد دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا اور یہ جو حضرت ایوب علیہ السلام اور ان کے تین دوستو ں کے درمیان مکالمہ ہے، یہ فصاحت اور بلاغت کا بھی اور دلائل کا بھی بہت بڑا زبردست ذخیرہ ہے۔

عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ہے کہ یہ ''بائبل'' گھڑی ہوئی چیز ہے، خوب سمجھ لیجئے کہ ساری ''بائبل'' گھڑی ہوئی نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سی چیزیں اپنی اسی اصل حالت میں موجود ہیں جس طرح انبیاء پر نازل ہوئی تھیں۔ اور اس میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں بھی موجود تھیں اور اب بھی موجود ہیں، اس لئے اس کی ہر بات کو غلط نہیں کہا جاسکتا اور اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''تم ان کی تصدیق کرو، نہ تکذیب کرو۔''[1]

یعنی نہ یہ کہو کہ بالکل سچ ہے اور نہ یہ کہو کہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس میں

---

(۱) صحیح البخاری ٦ / ٢٠ (٤٤٨٥)

بعض حکمت کی باتیں بھی ہیں اور ان سے ایک نور نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر نازل کیں۔

بیماری کی حالت میں مناظرہ

آپ اندازہ کیجئے! ایک آدمی بیماری میں مبتلا ہے اور اس کی آل اولاد ساری ہلاک ہوچکی ہے اور اس کا سارا مال ختم ہوچکا ہے اور بیماری ایسی ہے جس کی وجہ سے ہر وقت تکلیف میں ہیں، اس وقت میں لوگ آکر یہ مناظرہ کررہے ہیں کہ یہ بیماری تمہارے گناہوں کی سزا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے ناراض ہیں، اس کے جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ میرا اللہ مجھ سے ناراض نہیں ہے، ہاں! اللہ نے مجھ پر یہ آزمائش ڈالی ہے، اور اس آزمائش میں مجھے صبر سے کام لینا چاہئے اور جب میں صبر سے کام لوں گا تو میرا اللہ ضرور مجھے اس مشکل سے نجات دلائے گا۔ یہ ساری گفتگو اس ''صحیفۂ ایوبی'' کے اندر موجود ہے۔

دعا کرنے کا نرالا انداز

آپ دیکھئے کہ ایک طرف حضرت ایوب علیہ السلام کو اتنے زبردست مصائب کا سامنا ہے اور دوسری طرف یہ وساوس ہیں جو ساتھیوں کی طرف سے دل میں ڈالے جارہے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی آپ راضی برضا ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے حق میں جو فیصلہ کیا ہے، میں اس پر راضی ہوں۔ آرام ہو تو راضی ہوں، دُکھ ہو تو راضی ہوں۔ اور ایک طرف دوستوں سے مناظرہ ہورہا ہے اور

جب وہ مناظرہ ختم ہوا، اس وقت حضرت ایوب علیہ السلام نے دُعا مانگی، اس دعا کا انداز کیا نرالا ہے! فرمایا:

أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ (1)

اس دُعا میں کوئی مطالبہ نہیں، کوئی درخواست نہیں، بلکہ صرف اپنی حالت کا بیان ہے کہ اے میرے پروردگار! میری حالت یہ ہے کہ مجھے دُکھ لگ گیا ہے۔ عربی زبان کے قاعدے سے اگر اس دُعا میں ''أَنِّي'' کا لفظ نہ ہوتا تو مسئلہ نہیں تھا، یوں عبارت ہوتی ''رَبِّ مَسَّنِيَ الضُّرُّ'' بات پھر بھی پوری ہوجاتی کہ'' اے میرے پروردگار! مجھے دُکھ لگ گیا ہے اور آپ ارحم الراحمین ہیں،'' لیکن دعا کے شروع میں کہا کہ'' أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ''۔

حالات آپ کے سامنے، فیصلہ آپ کے ہاتھ میں

دراصل دعا کے شروع میں ''أَنِّي'' کہہ کر تین چیزیں اکٹھی کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کررہے ہیں، یعنی ''أَنِّي'' ایک طرف میں ہوں، اور دوسری طرف یہ دُکھ ہے، اور تیسرے آپ ہیں کہ آپ ارحم الراحمین ہیں۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ میرا یہ دُکھ دور کردیجئے یا میری یہ تکلیف دور کردیجئے، بلکہ یہ کہا کہ حالات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اور حالات یہ ہیں کہ ایک طرف میں ہوں، دوسری طرف میرے ساتھ لگی ہوئی بیماری ہے اور آپ ارحم الراحمین۔ آپ خود ہی فیصلہ کرلیجئے کہ آپ میرے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے؟

---

(1) سورۃ الانبیاء: آیت (۸۳)

''زبانِ بے زُبانی'' کی دُعا

یہ وہ دعا ہے جسے میں''زبانِ بے زبانی'' کہتا ہوں، یعنی زبان سے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کرو، بلکہ اپنی حالت پیش کر رہا ہوں کہ میری حالت یہ ہے اور آپ ارحم الراحمین ہیں، اب ''ارحم الراحمین'' کا جو بھی تقاضا ہے، میرے ساتھ وہ معاملہ کردیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فصاحت وبلاغت نہیں دیکھی جاتی، وہاں مانگنے والا ''دل'' دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس درد کے ساتھ اور کس سوز کے ساتھ، میرے اُوپر بھروسہ کرتے ہوئے وہ مجھ سے مانگ رہا ہے، الفاظ وہ معنیٰ نہیں دیتے، جو انسان کی حالت معنیٰ دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کیا مانگوں؟

میرے ساتھ تو اکثر وبیشتر یہ حالت ہوتی ہے، آپ حضرات کے ساتھ بھی ہوتی ہوگی، وہ یہ کہ بعض اوقات اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھالئے، لیکن اس وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے کیا مانگیں؟ حالانکہ دل میں حاجتوں کا طوفان ہے، اگر میں سوچنے بیٹھوں کہ مجھے کیا چاہئے؟ تو پتہ نہیں کتنی حاجتیں سامنے آجائیں۔ ''صحت'' میری حاجت ہے، طاقت اور قوت میری حاجت ہے، علم میری حاجت ہے، رزق میری حاجت ہے، اگر ان حاجتوں کی فہرست بنانا چاہوں تو لاتعداد حاجتیں بیان کردوں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنے بیٹھا تو ہاتھ اُٹھائے ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا مانگوں؟ یہ ہے ''زبانِ بے زبانی''۔ اس وقت انسان کا پورا وجود دُعا بن جاتا ہے، اور زبانِ حال سے وہ یہ کہتا ہے کہ یااللہ! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا

مانگوں؟ آپ ہی میری ساری حاجتوں کو جانتے بھی ہیں اور آپ ہی ان حاجتوں کو پورا کرنے والے ہیں۔

عارف باللہ کا بیت اللہ کے سامنے دعا کرنا

میرے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ سرہ کو دعا کا بڑا ذوق تھا اور جب دُعا کرنے پر آتے تو بعض اوقات مسلسل دُعا کرتے رہتے، ۱۵/منٹ، ۲۰/منٹ، آدھا گھنٹہ دعا کررہے ہیں اور ساری دُعائیں اَزبر تھیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ''حرمِ مکہ'' میں حاضر ہوا اور اللہ تعالیٰ نے طواف کی توفیق دی، طواف کے بعد بیت اللہ شریف کے دروازے کے سامنے بیٹھ گیا، دل میں آیا کہ اب خوب دعا کروں، لیکن جب دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو اب زبان سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے ہیں اور سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا مانگوں؟ اور کیا نہ مانگوں، پھر سوچا کہ میں نے کل بھی تو آدھا گھنٹہ تک دعا کی تھی، وہی یاد آجائے کہ کیا کی تھی، وہ بھی یادنہیں آرہی ہے، پھر ادعیۂ ماثورہ کو سوچا تو وہ بھی یادنہیں آرہی ہیں، پھر میں نے کہا کہ اے بندۂ خدا! تو اس جگہ آکر بھی دعا کرنے سے عاجز ہورہا ہے تو تیرا کیا ہوگا؟

لطف اظہار ہے، اظہار و بیان سے آگے

اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ ارے تو کیا مانگے گا؟ تیرے یہ ہاتھ جس بارگاہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ساری کائنات تیرے ان ہاتھوں کے نیچے ہے، تو جو بھی دُعا زبان سے مانگے گا، وہ متناہی ہوگی، جب ان کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلے

ہوئے ہیں تو وہ زبانِ بے زبانی کے نتیجے میں وہ چیز عطا فرمائیں گے جو تیرے وہم وخیال میں بھی نہیں ہے، یہ ہے "زبانِ بے زبانی" یعنی آدمی زبان سے کچھ نہیں کہہ رہا ہے، لیکن اس کی پوری حالت مجسم دُعا بن جاتی ہے، کافی عرصہ پہلے میں نے ایک شعر کہا تھا ؎

درگہِ حسن میں ٹوٹے ہوئے لفظوں پہ نہ جا
لطفِ اظہار ہے اظہار و بیان سے آگے

اظہار کا لطف، الفاظ کے اظہار سے نہیں ہوتا، بلکہ اس سے آگے ہے، بندے کی حالت ایسی بن جائے کہ اس کا وجود سراپا دُعا ہو۔ وہاں الفاظ نہیں دیکھے جاتے کہ اس کے الفاظ فصیح وبلیغ ہیں یا ٹوٹے ہوئے ہیں، جس حالت میں بھی پروردگار کے سامنے مانگا جائے تو وہ بندہ کی حاجت سمجھ کر اس کو پورا کر دیتے ہیں۔

میں ہوں، میری بیماری، تو ارحم الراحمین

بالکل یہی صورتِ حال حضرت ایوب علیہ السلام کی اس دُعا میں ہے کہ یا اللہ! میں تین باتیں کہہ رہا ہوں، میں ہوں، اور میری بیماری ہے، اور تو ارحم الراحمین ہے۔ میں آپ سے کچھ نہیں کہتا کہ آپ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ اس دعا کا لطف "اظہار وبیان" سے آگے ہے۔ اور ایک جگہ قرآنِ کریم میں حضرت ایوب علیہ السلام کی دوسری دُعا منقول ہے کہ:

أَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ [1]
شیطان مجھے دکھ اور آزار لگا گیا ہے،

---

(۱) سورة ص: آیت (٤١)

یہاں پر بھی صرف اتنا کہا کہ یا اللہ! مجھے شیطان چھوگیا ہے، تکلیف دے کر اور میرے اندر بیماری پیدا کر کے مجھے چھوگیا ہے۔ بس۔ یہاں پر یہ نہیں کہا کہ یا اللہ! مجھے شفا دے دیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حالت پیش کردی اور اس حالت ہی کو دُعا بنا دیا۔

پینے اور غسل کے لئے ٹھنڈا پانی

جب یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (1)

اپنا پاؤں زمین پر مارو! لو یہ ٹھنڈا پانی ہے نہانے کے لیے بھی اور پینے کے لیے بھی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت ایوب عَلَیْہِ السَّلَام کی بیماری کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی تھی کہ چلنا بھی مشکل تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کام کے لئے اُٹھے تو اُٹھنا آسان ہوگیا اور اُٹھ کر چل پڑے، ان کی اہلیہ نے پوچھا کہ کہاں چلے؟ حضرت ایوب عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آگے جا کر پتھر پہ پاؤں ماروں، چنانچہ جا کر پتھر پر پاؤں مارا تو اس سے پانی اُبل پڑا اور یہ حکم آیا کہ دیکھو! یہ چشمہ کا پانی تمہارے غسل کے لئے ٹھنڈا پانی ہے اور تمہارے پینے کے لئے ہے، چنانچہ آپ نے اس پانی سے غسل کیا اور اس پانی کو پیا۔

---

(1) سورۃ ص: آیت (۴۲)

ساری بیماری جا چکی تھی

جب غسل کر کے فارغ ہوئے تو وہ ساری بیماری جا چکی تھی اور بیماری کی وجہ سے چہرے پر جو تغیرات آئے تھے وہ جا چکے تھے اور خوشگوار اور کھِلا ہوا چہرہ جیسا بیماری سے پہلے تھا دوبارہ ویسے ہی ہوگیا تھا، اس چہرے کے ساتھ جب وہاں سے واپس لوٹے تو روایات [(۱)] میں آتا ہے کہ حضرت ایوب عَلَیْہِ السَّلَام کی اہلیہ ان کو پہچان نہیں سکیں کہ یہ میرے شوہر ہیں، اس لئے کہ عرصۂ دراز تک بیماری کی وجہ سے چہرے پر اور جسم پر تغیرات آچکے تھے اور جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے صحت عطا فرمائی تو سب تغیرات بھی ختم کردیئے اور چہرے کی تازگی بھی واپس دے دی، بشاشت بھی واپس دے دی، یہاں تک کہ بیوی کو بھی پہچاننے میں مشکل ہو رہی تھی۔

مال اور اولاد سب واپس دیدیئے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اور کرم فرمایا کہ:

وَاٰتَیْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ [(۲)]

یعنی ان کے بیٹے اور بیٹیاں جو ہلاک ہوگئی تھیں، اس کے بعد ہم نے اتنے ہی گھر والے ان کو دے دیئے، بلکہ اس سے دوگنے دے دیئے۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو ہلاک ہوگئے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کردیا ہو۔ یہ بات اس کی قدرتِ کاملہ سے کیا بعید ہے؟ اور یہ

---

(۱) تفسير السمرقندي ٢ / ٤٣٧، وتفسير القشيري ٢ / ٥١٧

(۲) سورة الانبياء: آيت (٨٤)

مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے یہاں مزید اولاد ہوئی اور اتنی ہوئی اور بلکہ اس سے دوگنی اولاد ہوگئی۔ اور جو مال مویشی چلے گئے تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ نے واپس عطا کردیئے اور پھر دوبارہ اسی طرح خوشحالی کی زندگی گزارنے لگے۔

صبر کا اعلیٰ مقام عطا ہونا

قرآنِ کریم میں جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، وہ محض قصہ کہانی نہیں ہوتی کہ وہ افسانہ طرازی ہو، بلکہ اس کے پیچھے سبق ہوتے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں ہمیں یہ سبق دیا کہ شیطان بڑا دعویٰ کر رہا تھا کہ میں ان کی ساری راست بازی اور سارا تقویٰ ختم کروں گا، اور ان کو بیماری کے اندر مبتلا کردوں گا، لیکن حضرت ایوب علیہ السلام صبر اور استقلال کے پہاڑ تھے، ان کے پاس آنے والے ان سے کہہ رہے ہیں کہ تجھ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہیں، مگر وہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں کہ نہیں، میرے اللہ مجھ سے ناراض نہیں ہیں، بلکہ جب ان کا حکم ہوگا تو سب بیماری ختم ہوجائے گی اور مجھے اس وقت تک صبر کرنا ہے، صبر کا یہ اعلیٰ ترین مقام تھا، اس وجہ سے آج بھی دنیا میں ''صبرِ ایوبی'' کی مثال دی جاتی ہے۔

دنیا میں مصائب آتے ہیں

اس واقعہ سے یہ سبق دیا جارہا ہے کہ اس دنیا میں مصیبتیں سب کو پیش آتی ہیں، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو زندگی میں کبھی کوئی مصیبت پیش نہ آئی ہو، چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا صاحبِ اقتدار ہو، بڑے سے بڑا دولت مند ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو۔ ان میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا

ہے کہ مجھے زندگی میں کبھی کوئی دُکھ پیش نہیں آیا۔ اس دنیا میں سبھی کو دُکھ پیش آتے ہیں، لیکن اس دکھ کے موقع پر ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی جزع فزع کرے، شکوہ وشکایت کرے کہ یااللہ! تو نے مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا -العیاذ باللہ- اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام نے اختیار کیا کہ یااللہ! کوئی گلہ نہیں، کوئی شکوہ نہیں، جو کچھ آپ کی مشیت ہے، وہ برحق ہے، میں اس کے آگے سر جھکاتا ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کی اس تکلیف کو کس طرح دور فرماتے ہیں۔

صبر کے ذریعہ درجات میں تیزی سے ترقی

صبر کے ذریعہ انسان کے درجات اتنی تیزی سے ترقی کرتے ہیں کہ خوشی کی حالت میں اتنی تیزی سے ترقی نہیں کرتے۔ چنانچہ ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ ''مجاہداتِ اضطراریہ'' میں درجات کی ترقی زیادہ تیزی سے ہوتی ہے، بہ نسبت مجاہداتِ اختیاریہ کے۔ لہٰذا بندہ جتنا صبر کرے گا، اتنی اس کی ترقی درجات ہوگی۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے مصیبت مت مانگو، بلکہ عافیت مانگو، لیکن جب مصیبت آئے تو صبر سے کام لو، صبر کا مطلب یہ ہے کہ زبان پر گلہ اور شکوہ نہ ہو۔ جیسے بعض اوقات یہ شکوہ آجاتا ہے کہ یااللہ! میں ہی رہ گیا تھا اس مصیبت کے لئے -العیاذ باللہ- یہ کسی مؤمن کا کام نہیں، مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کرے۔

یہ بیماری عذاب نہیں تھی

دوسری بات یہ ہے کہ اس تکلیف کے دوران تین آدمی آکر مسلسل مناظرہ

کر رہے ہیں کہ یہ تمہارے اُوپر سزا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہیں، لیکن یہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں کہ نہیں، میرے مولیٰ مجھ سے ناراض نہیں ہیں، اور یہ تکلیف بھی ان کے کرم کا ایک عنوان ہے، یہ تکلیف بھی ایک نعمت ہے۔ اس موقع پر بھی ان کے پاؤں ڈگمگاتے نہیں ہیں۔ اگر انسان پر کوئی تکلیف یا مصیبت آئے اور وہ اس تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہ کرے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف بطورِ عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے یہ تکلیف آئی ہے، لیکن جس بیماری اور تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی توفیق ہوجائے، اور زبان پر شکوہ نہ ہو، چاہے وہ ہائے ہائے کرے، چاہے آہیں بھرے، روئے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بیماری گناہ کا عذاب نہیں ہے، بلکہ یہ بیماری بندے کے درجات میں بلندی اور ترقی کے لئے دی گئی ہے، اور گناہوں کی مغفرت کے لئے دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع برقرار تھا

چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ مقام عطا فرمایا تھا کہ اس بیماری میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اسی طرح قائم تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہورہا تھا اور ان کو بھروسہ تھا کہ یہ بیماری ناراضگی کی وجہ سے نہیں ہے، اگر ناراضگی کی وجہ سے ایسا ہوتا تو مجھے رجوع کرنے کی توفیق کیسے ہوتی؟ ان کو یقین تھا، اس لئے وہ اس حالت میں سارے شیطانی وساوس کا مقابلہ کرتے رہے۔

”صابر“ یا ”صابرہ“ نام رکھنا

بہرحال! اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مصیبت

مت مانگو، لیکن جب مصیبت آجائے تو اس پر صبر کرو۔ ایک خاتون کا نام "صابرہ" تھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اپنا نام تبدیل کرلو، کیونکہ "صابرہ" کے معنیٰ ہیں "صبر کرنے والی"۔ مطلب یہ تھا کہ اس میں خود اپنی طرف سے یہ دعویٰ ہورہا ہے کہ میرے اُوپر مصیبتیں آئیں اور میں صبر کروں اور مصیبت کو دعوت نہیں دینی چاہئے اور نہ دعویٰ کرنا چاہئے کہ میں بہت صبر کرنے والا ہوں۔

ایک عبرت آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ "سحنون المحب" کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی حال میں ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا، جس میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ؎

لَیْسَ لِیْ فِیْ سِوَاكَ حَظٌّ
فَكَیْفَ مَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِیْ

اے اللہ! آپ کے علاوہ مجھے کسی کی ذات میں کسی کام میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ آپ جس طرح چاہیں، مجھے آزما کر دیکھ لیں۔

العیاذ باللہ! گویا کہ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی دعوت دے دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا پیشاب بند ہوگیا، اب مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا ہے، لیکن خارج ہونے کا راستہ نہیں۔ کئی دن اس حالت میں گزر گئے، بالآخر تنبہ ہوا کہ کتنی غلط بات میرے منہ سے نکل گئی تھی، ان بزرگ کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، اس حالت میں وہ ان بچوں سے کہتے کہ "اُدْعُوْا لِعَمِّكُمْ

الْكَذَّابِ" اپنے جھوٹے چچا کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ مجھے اس بیماری سے نکال دے۔ اس لئے کہ اس نے جھوٹا دعویٰ کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ کسی چیز میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ ارے! تم کو تو پیشاب کے اندر مزہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں چلا کرتی۔ (۱)

تکلیف میں یہ دو کام کرو

لہٰذا کبھی تکلیف نہ مانگو، اور نہ یہ دعویٰ کرو کہ میں بہت برداشت کرنے والا ہوں، لیکن جب تکلیف آجائے تو دو کام کرو، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر راضی برضا رہو اور کہو: اے اللہ! مجھے کوئی شکوہ اور گلہ نہیں ہے، آپ کی حکمت برحق ہے۔ اور دوسرا کام یہ کرو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور کہو یااللہ! یہ مصیبت آگئی ہے، آپ اس مصیبت کو دور فرما دیجئے یا اس میں میری دستگیری فرمائیے، مجھے صحیح راستہ دکھائیے، جب یہ دو کام کرو گے تو ان شاء اللہ جب وہ مصیبت اور تکلیف رخصت ہوگی تو تمہارے درجات کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔

اور اس دُعا میں یہ سبق بھی ہے کہ جب کچھ سمجھ نہ آرہا ہو کہ میں اللہ میاں سے کیا مانگوں اور کس طرح مانگوں تو بس اس وقت صرف ہاتھ ہی پھیلا دو اور کہو:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ

یہ بھی دعا کا ایک انداز اور اسلوب ہے اور بعض اوقات یہ اسلوب دوسرے

---

(۱) الرسالة القشيرية ١ / ٩١ واحياء علوم الدين للغزالى ٢ / ١٦٥ وفيض القدير للمناوى ٤ / ١٠٧

اسلوب کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے، اپنی رحمت سے ہمیں یہ سبق لینے کی اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

فہرستِ مضامین

دعا نمبر ۲۲

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! ''مناجاتِ مقبول'' میں جو قرآنی دُعائیں منقول ہیں ان کی تشریح کا سلسلہ کافی عرصہ سے چل رہا ہے۔ گذشتہ مجلس میں حضرت ایوب علیہ السلام کی دُعا ''أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ'' پر بیان ہوا تھا۔ اس کے بعد ''مناجاتِ مقبول'' میں جو دُعا منقول ہے، وہ یہ ہے کہ:

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ [1]

جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا مت چھوڑیئے اور آپ بہترین وارث ہیں، یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا ہے، ان کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے انہوں نے یہ دُعا مانگی تھی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شکل میں اولاد عطا فرمائی۔

---

(۱) سورة الانبیاء: آیت (۸۹)

حضرت حنّا کا نذر ماننا

اس کا واقعہ[1] بھی بڑا عجیب اور سبق آموز ہے۔ ''بیت المقدس'' جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، اس بیت المقدس میں مختلف انبیاء کرام علیہم السلام آکر عبادت کرتے رہے ہیں، بیت المقدس کے ایک امام تھے جن کا نام تھا ''عمران'' اور انہی کے نام پر سورۂ آلِ عمران نازل ہوئی۔ ''آلِ عمران'' عمران کی اولاد، عمران کی اہلیہ کا نام ''حنا'' رضی اللہ عنہا تھا اور یہ بڑی عبادت گزار خاتون تھیں اور بیت المقدس کی امامت بہت اُونچے درجے کا مقام اور منصب تھا، یہ ''عمران'' اس منصب پر فائز تھے۔ حضرت ''حنّا'' حالتِ حمل میں تھیں، بچہ پیدا ہونے والا تھا، اس وقت حضرت ''حنّا'' رضی اللہ عنہا نے یہ نذر مانی کہ جو میرا بچہ پیدا ہوگا، میں اس بچے کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے اور بیت المقدس میں عبادت کے لئے وقف کردوں گی۔

حضرت حنّا کے یہاں بچی کی پیدائش

اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا بھی کی:

رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ[2]

اے میرے پروردگار! میں نے نذر مانی ہے کہ یہ بچہ جو میرے شکم میں ہے وہ عبادت کے لئے آزاد ہوگا، آپ

---

(۱) تفسیر طبری ۵ / ۳۳۰ - ۳۳۱

(۲) سورۃ آل عمران: آیت (۳۵)

اس کو مجھ سے قبول کر لیجئے، بیشک آپ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ حضرت حنا کے یہاں جب ولادت ہوئی تو حضرت مریم علیہا السلام کی شکل میں بچی کی ولادت ہوئی، ان کو توقع یہ تھی کہ میں نے جو نذر مانی ہے وہ ایک بچے کی مانی ہے کہ جو بچہ ہوگا میں اس کو "بیت المقدس" کی خدمت کے لئے وقف کروں گی، لیکن یہ تو بچی ہوگئی اور بچی وہ کام نہیں کرسکتی جو خدمت کے اعتبار سے بچہ کرسکتا تھا۔ اس لئے جب بچی کی ولادت ہوئی تو حضرت حنا رضی اللہ عنہا نے اللہ تعالیٰ سے تعجب سے پوچھا کہ:

رَبِّ إِنِّيْ وَضَعْتُهَا أُنْثٰى وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى [1]

(پھر جب ان سے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ (حسرت سے) کہنے لگیں): یا رب یہ تو مجھ سے لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ اللہ کو خوب علم تھا کہ ان کے یہاں کیا پیدا ہوا ہے۔ اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا۔

حضرت مریم علیہا السلام کی عبادت اور بے موسم پھل

اللہ تعالیٰ نے بڑی عجیب انداز سے حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش فرمائی، اور جب بڑی ہوئیں تو حضرت حنا نے حسبِ نذر ان کو بیت المقدس کے ساتھ وابستہ کردیا، ایک چھوٹا سا حجرہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کے لئے بنادیا، جہاں پر وہ تنہائی میں عبادت کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی خاص پرورش کرنی تھی اور

(۱) سورۃ آل عمران: آیت (۳٦)

حضرت عیسی علیہ السلام کو ان سے پیدا کر کے دکھانا تھا، اس لئے شروع ہی سے وہ عبادت میں مشغول رہتی تھیں اور عجیب معاملہ یہ تھا کہ جس حجرہ میں وہ عبادت کرتی تھیں، وہاں بے موسم کے پھل اللہ تبارک و تعالیٰ بھیج دیا کرتے تھے، جس پھل کا ابھی موسم نہیں ہے اور بازار میں دستیاب نہیں ہیں، ایسے پھل اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ذریعہ اور اپنی قدرتِ کاملہ کے ذریعہ بھیج دیتے تھے۔

حضرت حنّا کی بہن ''علیشبع''

دوسری طرف حضرت حنّا کی ایک بہن تھیں جن کا نام ''علیشبع'' تھا، چونکہ وہ بھی ایک مقدس خاتون تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ تھیں، اسی وجہ سے عیسائی لوگ اپنی لڑکیوں کا نام ''علیشابع'' رکھتے ہیں اور انگریزی زبان میں اس کو Alizbit بنادیا اور اردو والوں نے اس کو ''الزبتھ'' بنادیا، جیسے ''ملکہ الزبتھ'' کہتے ہیں اور یہ انہی کے نام پر ہیں۔ ان کی اولاد نہیں ہوتی تھی اور ان کے شوہر حضرت زکریا علیہ السلام بڑے مقدّس نبی تھے، بڑے جلیل القدر نبی تھے، یہاں تک کہ حضرت زکریا علیہ السلام بہت بوڑھے ہوگئے، اور اتنے بوڑھے ہوگئے کہ اب ان سے اولاد ہونا متوقع نہیں تھا۔

حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی

جب حضرت مریم علیہا السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت مریم علیہا السلام بیت المقدس کے لئے وقف کی گئیں تھیں۔ ان کی کفالت کے بارے میں اختلاف ہوگیا کہ ان کی کفالت کون کرے؟ لوگوں نے ''قرعہ'' ڈالا اور اس کا طریقہ یہ مقرر کیا کہ

ہر شخص اپنا قلم دریا میں ڈالے گا، جس کا قلم پانی کے بہاؤ کے خلاف اُلٹی سمت میں بہہ جائے وہ ان کا کفیل ہوگا، چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم جب دریا میں ڈالا گیا تو وہ اُلٹی سمت میں بہنے لگا، اس وقت سب نے اتفاق کرلیا کہ حضرت زکریا علیہ السلام ان کے کفیل ہوں گے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں

حضرت زکریا علیہ السلام ایک طرف حضرت مریم علیہا السلام کے خالو بھی تھے، اس لئے کہ آپ کی اہلیہ حضرت حنا حضرت مریم کی والدہ کی بہن تھیں، اس لحاظ سے بھی وہ کفالت کے حقدار تھے۔ چنانچہ وہ حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کرتے تھے اور ان کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے، اور مختلف اوقات میں جا کر ان کی خیریت معلوم کرتے۔ ایک مرتبہ حضرت مریم علیہا السلام اپنے حجرہ میں عبادت کر رہی تھیں تو حضرت زکریا علیہ السلام ان کی عبادت گاہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں پھل رکھے ہوئے ہیں اور پھل بھی وہ جو موسم کے نہیں تھے، بلکہ بے موسم کے پھل تھے، حضرت زکریا علیہ السلام کو تعجب ہوا، وہ پھل جو اس وقت کہیں بھی موجود نہیں ہیں، وہ پھل ان کے پاس موجود ہیں تو انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے پوچھا:

يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ [1]

اے مریم! تمہارے پاس یہ کہاں سے آئے؟ حضرت مریم نے جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں۔

---

(1) سورۃ آل عمران: آیت (۳۷)

وہ ذات بے موسم کے اولاد بھی دے سکتی ہے

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر موسم کے یہ پھل پیدا کر کے حضرت مریم کے پاس بھیج دیئے ہیں تو اس وقت ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جو ذات بے موسم کے پھل پیدا کر سکتی ہے، وہ ذات بے موسم اولاد بھی دے سکتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی شروع کی کہ یا اللہ! میں بے اولاد ہوں، مجھے کوئی اچھی اولاد عطا فرما اور اس بڑھاپے میں اولاد کی خواہش، جبکہ اہلیہ کے بارے میں قرآنِ کریم نے خود کہا کہ وہ بانجھ تھیں، یہ خواہش صرف اس وجہ سے نہیں تھی کہ میری کوئی اولاد پیدا ہوجائے، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ ان کے بھائیوں اور بھتیجوں میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جو نبوت کی، علم ومعرفت کی اور دین کی میراث پالے، حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل کے بڑے جلیل القدر نبی تھے اور آپ نبوت کا پیغام دنیا تک پہنچانے کے لئے تشریف لائے تھے۔

ایسا بیٹا جو نبوت کا وارث ہو

ظاہر ہے یا تو اولاد اپنے باپ کا علم اور اس کا دین سنبھالتی ہے، یا بھائی ہوتے ہیں یا بھتیجے ہوتے ہیں، ان کے بھائیوں کا اور بھتیجوں کا تو یہ حال تھا کہ ان کو دین کی کچھ پرواہ نہیں تھی اور دین کا پیغام پھیلانے اور نبوت کے فرائض انجام دینے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں تھی۔ قرآنِ کریم میں آتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اولاد کی خواہش کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے بیان کی اور فرمایا:

وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَآءِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ

لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِیۡ وَيَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ وَاجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِيًّا (۱)

اے اللہ! میرے مرنے کے بعد جو میرے بھائی ہوں گے، ان سے مجھے خوف ہے، کیا خوف ہے؟ وہ خوف یہ ہے کہ یہ نبوت کی وہ وراثت جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے وقت سے چلی آرہی ہے، وہ اس کو سنبھال نہیں سکیں گے، جبکہ صورتحال یہ ہے کہ میری بیوی بانجھ ہے، لہٰذا مجھے ایسا بیٹا دیدیں جو اس نبوت کے سلسلے کا صحیح وارث بن سکے اور جو میرے علم کا اور میرے دین کی دعوت کا وارث بن سکے اور ان کو سنبھالے۔

بے موسم پھل دیکھ کر اولاد کی دُعا

اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شکل میں ان کی دُعا قبول فرمائی، اب عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو حضرت زکریا علیہ السلام نے دُعائیں مانگی اور وہ دُعائیں قرآنِ کریم میں مختلف انداز میں منقول ہیں۔ جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم پھل دیکھے تھے تو اس پر حضرت زکریا علیہ السلام نے جو دُعا فرمائی تھی، اس کے بارے میں قرآنِ کریم میں ہے:

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيۡعُ الدُّعَآءِ (۲)

اس موقع پر زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، کہنے لگے:

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (۵-۶)

(۲) سورۃ آل عمران: آیت (۳۸)

''یا رب مجھے خاص اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرمادے۔ بیشک تو دعا کا سننے والا ہے۔''

دھیرے دھیرے آواز دی

اور دوسری جگہ جو سورۂ مریم کے شروع میں ہے اور سورت کا آغاز ہی حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرہ سے فرمایا، وہاں فرمایا:

كهيعص ○ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا ○ إِذْ نَادٰى رَبَّهُ نِدَآءً خَفِيًّا (۱)

یعنی آپ کے پروردگار نے اپنے بندے حضرت زکریا علیہ السلام پر جو رحمت کی تھی، اس کا تذکرہ کررہے ہیں اور پھر آگے بڑے خوبصورت اور پیارے الفاظ میں فرمایا کہ اس وقت کا تذکرہ کررہے ہیں، جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے پروردگار کو دھیرے دھیرے آواز دی تھی، یعنی ایک تو یہ ہے کہ آدمی چیخ چیخ کر دُعا مانگے، ایسا نہیں کیا، بلکہ عاجزی کے ساتھ چھپے ہوئے انداز میں ہم کو پکارا۔ اسی سے علماء کرام نے فرمایا کہ دُعا میں اور ذکر میں افضل یہ ہے کہ وہ خفی ہو، یعنی آہستہ آہستہ آواز میں ہو، یعنی جب حضرت زکریا علیہ السلام اپنی عبادت میں تنہائی میں مصروف تھے، اس عبادت میں پروردگار سے تنہائی میں عرض معروض کررہے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ جوڑا ہوا تھا، وہ تھے اور اللہ تھا۔

دعا کرنے کا بہترین انداز

کیا دعا کی؟ فرمایا:

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (۲ - ۳)

رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا [۱]

اے پروردگار! میری ہڈیاں کمزور پڑگئی ہیں بڑھاپے کی وجہ سے، اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے، یعنی سفید بالوں سے بھڑک اُٹھا ہے۔ اے پروردگار! ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے آپ کو پکارا ہو اور آپ نے میری بات قبول نہ کی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان الفاظ کو نقل فرمایا، یہ بتانے کے لئے کہ دیکھو! دُعائیں اس طرح مانگی جاتی ہیں، ایک طرف اس دعا کے اندر عاجزی ہے، بے کسی ہے اور آہستہ آہستہ بندہ اللہ تعالیٰ کو پکار رہا ہے اور اپنی حالت بیان کر رہا ہے کہ میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں، میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے، سر کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں، لیکن اے پروردگار! میں تو کبھی بھی آپ سے دُعا مانگ کر کبھی ناکام نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے اُمید بھی ہے اور اُمید بھی ایسی کہ کہا یااللہ! میرے ساتھ تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے آپ سے دُعا مانگی ہو اور آپ نے میری دُعا قبول نہ کی ہو۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ سے یقین کے ساتھ مانگتا ہے کہ یااللہ! میں تو یہ چیز آپ سے لے کر رہوں گا، آپ میرے مولیٰ ہیں، آپ میرے خالق ہیں، آپ میرے پروردگار ہیں اور میرے پاس جو کچھ ہے، وہ آپ کی بدولت ہے، اب مجھے بیٹا دیجئے اور میں آپ سے لے کر رہوں گا۔

(۱) سورة مریم: آیت (٤)

اپنے پاس سے کوئی ولی دیدیجئے

آگے فرمایا:

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ [1]

اے پروردگار! اس کو اپنا پسندیدہ بنایئے۔ دیکھو! انسان اپنی اولاد کے لئے بہت کچھ دُعائیں کرتا ہے، یااللہ! اس کو رزق دیدیجئے، اس کو عمر دے دیجئے، اس کو سعادت دارین عطا فرمایئے، اس کو عافیت دیجئے، اس کو اچھی تعلیم دیجئے، اس کی تربیت فرمایئے، اس کو عملِ صالح عطا فرمایئے، اس کو علمِ نافع عطا فرمایئے، انسان اپنی اولاد کے لئے یہ سب دُعائیں مانگتا ہے۔

اس کو اپنا پسندیدہ بنادیجئے

حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے ایک جملہ کہا کہ ''اے اللہ! اس کو اپنا پسندیدہ بنادیجئے۔'' اس ایک جملہ میں انہوں نے سبھی کچھ مانگ لیا، اس لئے کہ جب وہ ''اللہ کا پسندیدہ'' ہوگا تو اس کا دین بھی اچھا ہوگا، اس کی دنیا بھی اچھی ہوگی۔ اس کے سارے معاملات درست ہوجائیں گے۔ دُعا مانگنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، دعا کے لئے کچھ سلیقہ چاہئے۔ یہ سلیقہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو عطا فرماتے ہیں، اتنے چاؤ سے، اتنے پیار سے، اتنی اُمیدوں سے، اتنے یقین کے ساتھ، اللہ تعالیٰ سے مانگا کہ مجھے بیٹا دیدیجئے اور بیٹا بھی ایسا جو آپ کا پسندیدہ ہو۔

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (۵ - ٦)

بچے کی پیدائش کی خوشخبری

اس کے بعد ایک دن حضرت زکریا علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے، نماز کے دوران ملائکہ کے ذریعہ یہ آواز آئی، اس میں آپ سے خطاب کیا:

إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَٰمٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَل لَّهُ مِن قَبْلُ سَمِيًّا (۱)

اے زکریا! ہم تمہیں خوشخبری دیتے ہیں ایک لڑکے کی جو تمہارے ہاں پیدا ہوگا، اس کا نام "یحییٰ" ہوگا۔ (نام بھی اللہ تعالیٰ نے خود بتادیا۔) اور اس نام کا کوئی بچہ اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا۔

خوشخبری مل گئی، بڑے چاؤ سے مانگا تھا اور یہ کہہ کر مانگا تھا کہ یا اللہ! آپ نے میری کبھی کوئی دُعا ردّ نہیں کی، اس لئے یہ دُعا بھی آپ ردّ نہیں کریں گے۔

مانگتے تعجب نہ آیا

لیکن جب خوشخبری مل گئی کہ بیٹا ملے گا تو سوال کیا:

رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَٰمٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (۲)

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (۷)

(۲) سورۃ مریم: آیت (۸)

میرے ہاں بچہ کیسے ہوجائے گا؟ میری بیوی تو بانجھ ہے اور میں بڑھاپے میں آخری حد کو پہنچ چکا ہوں۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی چھوٹی سی تفسیر ہے ''موضح القرآن'' اس میں حضرت شاہ صاحب بعض اوقات بہت پیارے جملے لکھتے ہیں۔ اس آیت میں جہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے تعجب کا اظہار کیا کہ یااللہ! بچہ کیسے ہوگا؟ اس پر حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''مانگتے تعجب نہ آیا، جب کہا: دیدیں گے، تب تعجب کیا۔''

یعنی بچہ مانگ رہے تھے، اس وقت تعجب نہ کیا کہ بچہ کیسے ہوگا؟ لیکن جب اللہ نے کہا کہ ہاں دیدیں گے، تب تعجب کیا۔

ارے ایسے ہی ہوگا

وہ تعجب درحقیقت اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اعتراف تھا کہ یااللہ! یہ کیسے ہوجائے گا؟ دنیائے اسباب کے تحت تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن آپ نے وعدہ کیا ہے، لہٰذا بچہ تو ہوگا، لیکن کیسے ہوگا؟ آپ کی قدرت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ آپ وہ کام کررہے ہیں جو دنیا میں متصور نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا کہ آپ کے تعجب کا مطلب یہ تھا کہ آیا میں جوان ہوجاؤں گا یا میری بیوی کا بانجھ پن دور ہوجائے گا؟ کیا ہوگا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں:

قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (۱)

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (۹)

ارے ایسے ہی ہوگا، یعنی جیسا ہم نے کہہ دیا، ویسے ہی ہوگا، بیٹا ہوگا، ضرور ہوگا اور اس کا نام بھی ''یحییٰ'' ہوگا۔ آپ کے رب نے فرمایا کہ یہ سب میرے لئے آسان ہے، کبھی تم نے اپنے اُوپر غور نہیں کیا کہ تم خود کیا تھے؟ کچھ نہیں تھے، لیکن ہم نے تمہیں پیدا کرکے اتنا بڑا کردیا۔

کوئی علامت تو بتادیجئے

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً

جواب میں حضرت زکریا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یااللہ! جب آپ نے مجھے اتنی بڑی خوشخبری دیدی، ذرا مجھے بھی بتادیجئے کہ کب ہوگا؟ اور مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ بچہ قرار پاگیا ہے؟ کوئی ایسی علامت بتادیجئے جس سے مجھے پتہ چلے کہ حمل قرار پاگیا، تاکہ جب حمل قرار پا جائے تو میں اور زیادہ شکر کروں اور زیادہ عبادت کروں اور زیادہ آپ کا شکر گزار بنوں۔ اس لئے مجھے کوئی نشانی بتادیجئے کہ جب وہ نشانی سامنے آئے تو میں سمجھ جاؤں کہ بچہ قرار پاگیا۔

بچہ کی پیدائش کی نشانی

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہ ہوگی کہ ایک دَم سے تم پر ایسی حالت طاری ہوجائیگی کہ تم زبان سے کسی سے بات نہیں کرسکوگے۔ یہ نہیں ہوگا کہ تم

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (۱۰)

گونگے ہوجاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ایسی حالت پیدا فرمادیں گے کہ تمہاری زبان بند ہوجائے گی اور تین دن تین رات تم اپنی بات کسی سے نہیں کہہ سکو گے اور تین دن، تین رات متواتر ایسے گزریں گے، اس وقت تم سمجھ لینا کہ حمل قرار پا گیا۔ البتہ ان تین دنوں میں لوگوں سے بات کروگے تو اشاروں سے کروگے۔

اس نشانی کا ظہور

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحٰى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا [1]

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت زکریا عَلَیْہِ السَّلَام کی زبان بند ہوگئی اور آپ کچھ بول نہیں سکتے، صرف اشاروں سے بات کرتے تھے اور عبادت گاہ سے باہر نکل کر اپنے متعلقین سے اشارہ سے کہا کہ جو نشانی مجھے بتائی گئی تھی، وہ ہوگئی ہے اور بچہ قرار پا گیا ہے، لہٰذا اب تم سب صبح شام اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تسبیح میں لگ جاؤ، یہاں تک کہ وہ بچہ پیدا ہوجائے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا عَلَیْہِ السَّلَام کو بیٹا عطا فرمایا۔

بیٹے کے لئے تین دُعائیں

حضرت زکریا عَلَیْہِ السَّلَام نے بیٹے کے لئے جو دُعائیں کی تھیں، وہ تین دُعائیں

---

(۱) سورۃ مریم: آیت (۱۱)

قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، ایک دُعا اس وقت کی جب حضرت مریم کے پاس بے موسم کے پھل دیکھے تو اس وقت یہ دعا کی کہ:

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (۱)

اے اللہ! مجھے پاکیزہ اولاد عطا فرما۔

دوسری دُعا سورۂ مریم میں آئی ہے کہ:

فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا (۲)

تیسری دُعا اس آیت میں ہے کہ:

رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ (۳)

اے میرے پروردگار! آپ مجھے اکیلا مت چھوڑیئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی دُعا حضرت زکریا علیہ السلام نے کئی مرتبہ مانگی۔

دعا کم ازکم تین مرتبہ ہونی چاہئے

حدیث شریف (۴) میں ہے کہ جب بندہ کوئی دعا کرے تو کم ازکم تین مرتبہ دعا کرے، کیونکہ یہ دعا کوئی آرڈر نہیں ہے کہ آپ نے اللہ میاں کو آرڈر دیدیا کہ یا اللہ! ایسا کردے۔ بلکہ ''دُعا'' ایک گزارش ہے اور ایک درخواست ہے،

---

(۱) سورة آل عمران: آیت (۳۸)

(۲) سورة مریم: آیت (۵)

(۳) سورة الأنبیاء: آیت (۸۹)

(۴) ماخوذ از صحیح مسلم ۳ / ۱٤۱۸ (۱۷۹٤)

ایک التجا ہے، اس التجا میں تکرار ہونا چاہئے، بار بار التجا کرے، یہ نہ سمجھے کہ بس ایک مرتبہ دعا کرلی، بس کافی ہے اور جب کوئی چیز مانگ رہا ہے تو مانگتا ہی رہے اور جب تک نہ ملے، اس وقت تک مانگتا ہی رہے، زکریا علیہ السلام کو دُعائیں مانگتے ہوئے پتہ نہیں کتنا وقت گزرا ہوگا۔ اس لئے آپ کبھی کسی لفظ سے دُعا مانگ رہے ہیں اور کبھی کسی اور لفظ سے دُعائیں مانگ رہے ہیں کہ یااللہ! میں اکیلا رہ جاؤں گا اور میرے اس مشن میں، میرے اس مقصد میں کوئی میرا ساتھی نہیں رہے گا، اس لئے مجھے ایک بیٹا دے دیجئے۔

بانجھ بیوی سے بیٹا

آگے قرآنِ کریم میں ہے:

وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (۱)

کہ ہم نے ان کو یحییٰ علیہ السلام عطا کئے اور ان کی بیوی کی اصلاح کردی۔ ان کو تندرست کردیا۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ سوال کیا تھا کہ ''أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ''(۲) میرا بیٹا کیسے ہوگا؟ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تمہاری بیوی کو درست کردیں گے، بلکہ اس وقت صرف یہ فرمایا کہ ''کذلك'' یعنی تمہیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کس طرح ہوگا؟ بس جو اللہ نے کہا ہے، وہ ہوگا۔ یہاں جب ان کا واقعہ بیان کیا تو فرمایا کہ ہم نے ان کو ''یحییٰ'' دیدیا۔ اور ہم نے

(۱) سورۃ الانبیاء: آیت (۹۰)
(۲) سورۃ آل عمران: آیت (٤٠)

ان کی بیوی کو درست کردیا اور ان کا بانجھ پن دور ہوگیا، پھر آگے وجہ بیان فرمائی کہ ہم نے ان کو اس بڑھاپے میں اور اس بانجھ پن کی حالت میں بیٹا کیوں دیدیا؟

نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے والے

فرمایا:

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا (1)

یہ وہ لوگ تھے جو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرتے تھے۔

یعنی حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کی بیوی ''علیشبع'' اور ان کی بہن ''حنّا'' اور ''حنّا'' کے شوہر ''عمران'' اور حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام۔ یہ سب وہ تھے جو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرتے تھے، اس لئے یہ ہمارے لاڈلے تھے، ہمارے محبوب تھے، ہم ان کی دعا کیوں قبول نہ کریں اور ہم ان کی خواہشات کو کیوں پورا نہ کریں۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سبق دیدیا کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میری بھی اسی طرح دُعائیں قبول ہوں اور میں بھی ناممکنات کی دُعائیں مانگوں اور وہ قبول ہوجائیں۔ ذرا یہ دیکھو کہ دعا کرنے والا کون تھا؟ یہ دعا کرنے والے وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے سے نیکیوں میں آگے بڑھنے کی فکر کرتے تھے، تم بھی یہی عمل کرو، یعنی نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرو۔

---

(1) سورۃ الأنبیاء: آیت (۹۰)

دنیا کے معاملات میں آگے بڑھنے کی فکر

اب دنیا کے معاملات میں تو تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر کرتے ہو کہ فلاں کے پاس ایسا مکان ہے، میرے پاس اس سے اچھا مکان ہوجائے، فلاں کے پاس ایسی کار ہے، میرے پاس اس سے زیادہ اچھی کار آجائے، فلاں کی آمدنی اتنی ہے، میری آمدنی اس سے زیادہ ہوجائے وغیرہ۔ لیکن کیا کبھی تم نے یہ سوچا کہ فلاں شخص اتنی عبادت کرتا ہے، میں اس سے عبادت کے اندر آگے بڑھ جاؤں، یا فلاں شخص اتنا صدقہ خیرات کرتا ہے، میں اس سے آگے بڑھ جاؤں، فلاں شخص اتنا ذکر کرتا ہے کہ ہر وقت اس کی زبان اللہ کے ذکر سے تر رہتی ہے، میں اس سے آگے بڑھ جاؤں، کبھی ان باتوں کا خیال آیا؟ لہٰذا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو، جیسا قرب اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا تو تم بھی نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

دنیا کی حرص پسندیدہ نہیں

دنیا کے معاملات میں تو ہم یہ سوچتے ہیں کہ فلاں کی اتنی آمدنی ہے، میری اس سے زیادہ ہوجائے، اس کی اتنی شہرت ہے، میری شہرت اس سے زیادہ ہوجائے، اس کا مکان اچھا ہے، میرے پاس اس سے اعلیٰ مکان آجائے، اس کا نام ''حرص'' ہے اور یہ مذموم ہے، یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو دنیا کے معاملات میں ''حرص'' پسندیدہ نہیں۔ لیکن آخرت کے معاملات میں ''حرص'' کرنا کہ فلاں شخص اپنی عبادت میں، اپنے تقویٰ میں اتنا آگے بڑھا ہوا ہے، اسے

اللہ! میں بھی اس سے آگے بڑھ جاؤں، یہ ''حرص'' پسندیدہ ہے، اسی کے بارے میں قرآنِ کریم نے فرمایا:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ [1]

یہ وہ چیز ہے جس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بہرحال! ان کی دعا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ صفت تھی کہ یہ ایک دوسرے سے نیکیوں میں آگے بڑھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

خوف اور اُمید کے ساتھ اللہ کو پکارنے والے

اور دوسری صفت ان کے اندر یہ تھی کہ ''وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا'' یہ لوگ ہمیں اُمید اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، یعنی اس اُمید کے ساتھ مانگتے تھے کہ اے اللہ! ہمیں اُمید ہے کہ آپ ہمیں ضرور عطا فرمائیں گے۔ اور یہ اُمید تھی کہ ہم سے جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہیں، وہ آپ ہمیں اپنے فضل وکرم سے معاف کردیں گے۔ اور ساتھ ساتھ ڈر بھی لگا ہو''رَهَبًا'' کے معنیٰ ڈر اور خوف کے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو پکارتے وقت دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہونی چاہئیں، ایک رغبت اور دوسرے رہبت۔ یعنی ڈر۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت جو ناقابلِ تصور ہے، اس کا جلال ناقابلِ تصور ہے، کہیں مجھ سے کوئی ایسی غلطی نہ ہوجائے جس پر میری پکڑ ہوجائے۔

---

(۱) سورۃ المطففین: آیت (۲۶)

بیمار کی عیادت کی فضیلت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک نوجوان صحابی تھے، وہ بیمار ہوئے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ یہ آپ کی سنت تھی کہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو بیمار ہوتا تو آپ اس کی عیادت کے لئے جاتے۔ [1] ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ جب کوئی مسلمان بھائی بیمار ہو تو دوسرے مسلمان اس کی عیادت کے لئے جائیں [2] اور اس کی بہت فضیلت ہے، حدیث شریف [3] میں ہے کہ جب کوئی بندہ کسی بیمار کی عیادت کے لئے جاتا ہے تو وہ جنت کے باغ میں ہوتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ [4]

اللہ کی رحمت سے اُمید اور اپنے گناہوں کا ڈر

بہر حال! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نوجوان صحابی کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ اب ایک طرف حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام کو دیکھو اور دوسری طرف ایک چھوٹے اور نوجوان صحابی ہیں، لیکن آپ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، آپ نے ان سے پوچھا:

---

(۱) صحیح البخاری ۷ / ۱۱۹ (٥٦٦٤)

(۲) صحیح البخاری ۲ / ۷۱ (١٢٤٠)

(۳) صحیح مسلم ٤ / ١٩٨٩ (٢٥٦٨)

(۴) سنن الترمذی ۲ / ۲۹۰ (٩٦٩) وقال: هذا حديث حسن غريب.

كَيْفَ تَجِدُكَ؟ قَالَ: وَاللهِ يَا رَسُوْلَ اللهِ، إِنِّي أَرْجُو اللهَ، وَ إِنِّيْ أَخَافُ ذُنُوْبِيْ، (۱)

تم اپنے آپ کو کیسا پا رہے ہو؟ کیا حال ہے؟ جواب میں ان صحابی نے کہا: یارسول اللہ! میں اس حالت میں ہوں کہ مجھے اپنے پروردگار کی رحمت کی بھی اُمید ہے کہ میرے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا معاملہ فرمائیں گے اور ساتھ ساتھ اپنے گناہوں کا ڈر بھی ہے کہ کسی گناہ کی وجہ سے پکڑا نہ جاؤں اور میرا انجام خراب ہوجائے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس حالت میں تم ہو، اس حالت میں جس بندے کے دل میں بھی یہ دونوں چیزیں موجود ہوں، یعنی اللہ کی رحمت سے اُمید بھی ہو اور اپنے گناہوں کا خوف بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ معاملہ فرماتے ہیں کہ جس چیز کا اسے خوف ہے، اس سے اس کو بے خوف کردیتے ہیں اور جس چیز کی اس کو اُمید ہے وہ اس کو عطا فرمادیتے ہیں۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا خوف اور اُمید

اَلْإِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا کہ اگر یہ اعلان ہوجائے کہ جتنے بھی لوگ ہیں، سب جنت میں جائیں گے، سوائے ایک آدمی کے کہ وہ جہنم میں جائے گا تو وہ مجھے ڈر ہوگا کہ کہیں وہ شخص میں ہی نہ ہوں اور اگر یہ اعلان ہوجائے کہ سارے لوگ جہنم میں جائیں گے سوائے ایک

(۱) سنن الترمذي ۲ / ۳۰۱ (۹۸۳) وقال: هذا حديث غريب.

آدمی کے کہ وہ جنت میں جائے گا تو مجھے اُمید ہوگی کہ وہ شخص میں ہی ہوں، ایک طرف اتنی اُمید اور دوسری طرف اتنا خوف! (۱)

عاجزی اور مسکنت کا مظاہرہ کرنے والے

بہرحال! حضرت زکریا علیہ السلام کے خاندان کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا'' وہ ہمیں رغبت کے ساتھ پکارتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دُعائیں قبول فرمائے گا اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ کا خوف بھی ہوتا تھا اور تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ:

وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ

اور وہ لوگ ہمارے سامنے خشوع، عاجزی اور مسکنت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

دعا کی قبولیت کا اعلان کرنے اور اس کا ذکر کرنے کے فوراً بعد ان کی یہ تین صفات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائیں کہ ہم نے ان کی دُعا قبول کرلی اور ہم نے یحییٰ علیہ السلام ان کو عطا کردیئے اور ان کی بیوی کو تندرست کردیا۔ وہ لوگ نیکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور ہمیں خوف ورجاء کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے سامنے ان کے دل نرم ہوگئے تھے۔

جو اللہ کا، اللہ اس کا

دل نرم ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس میں تکبر نہیں رہتا، اس میں حسد نہیں

(۱) حلية الأولياء لأبي نعيم ١ / ٥٣

رہتا تھا اور دل میں اپنی بڑائی کا احساس نہیں رہتا تھا، بس وہ لوگ تو ہمارے سامنے عاجزی اور انکساری کی تصویر تھے۔ یہ سارے واقعات جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں، یہ محض قصہ کہانی نہیں ہے، بلکہ ان واقعات میں ہمارے لئے ایک ایک قدم پر سبق ہے، وہ یہ کہ جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کا ہوجاتا ہے تو اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔

مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ (1)

جواللہ کا ہوگیا تو اللہ بھی اس کا ہوجاتا ہے۔

اللہ کا ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق ڈھال لو، اور اپنی زندگی کو اس کی رضا کے مطابق بنالو، تمہارے ظاہری اعمال، تمہارے باطنی اعمال، تمہارے افکار، تمہارے تصورات، تمہارے خیالات، یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوں، پھر دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کس طرح ہدایت عطا فرماتے ہیں اور کس طرح تمہاری بگڑی بناتے ہیں۔

اور سارا جنگل خالی ہوگیا

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھو کہ وہ اللہ کے ہوگئے تھے، اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی مخلوق بھی ان کے تابع ہوگئی تھی۔ ایک صحابی ہیں، حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ، ان کی سربراہی میں مسلمانوں کا ایک لشکر افریقہ کے گھنے جنگلات میں جارہا تھا، رات کو

(1) تفسیر الرازی ۲۷ / ۵۲۵ ومرقاة المفاتيح ٤ / ١٤٧٠

جنگل میں قیام کرنے کی ضرورت پیش آئی، اب خطرہ ہوا کہ یہاں تو درندے بہت رہتے ہیں، سانپ، بچھو بھی ہیں، اگر ہم یہاں رات کو سوئے تو کہیں درندے ہم پر حملہ نہ کردیں اور کوئی سانپ بچھو نہ کاٹ لئے۔ حضرت عقبہ بن نافع رضی اللہ عنہ نے جنگل کے اندر یہ اعلان کیا کہ:

> ”اے جنگل کے درندو! اور کیڑے مکوڑو! ہم رسول کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہیں اور اللہ کا پیغام لے کر اس جگہ آئے ہیں، آج اس لشکرِ اسلام کو اس جنگل میں رات گزارنی ہے، تم ان کے لئے جگہیں خالی کردو۔“

روایات میں آتا ہے کہ دیکھا گیا کہ شیر اُٹھ کر جارہا ہے، ہاتھی جارہا ہے، بھیڑیا جارہا ہے، سب درندے اس جنگل کو خالی کر کے وہاں سے چلے گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہاں رات گزاری[1] ”مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ“ جو اللہ کا ہوگیا، اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے یہ سبق ہمارے دلوں میں بٹھادے اور ہمیں اپنا بنالے۔

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

یہ دعا کثرت سے کیا کرو کہ یااللہ! ہمیں اپنا بنالے۔ اس لئے کہ جب بندہ اللہ کا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کائنات کو مسخر فرمادیتے ہیں ؎

> کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
> یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۳ / ۵۳۳ ترجمة عقبة بن نافع القریشی

لوح وقلم تیرے ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم تقدیر کو تمہاری بہتری کے لئے مقرر کردیتے ہیں، بشرطیکہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار بن جاؤ۔ اور ''محمد'' صلی اللہ علیہ وسلم سے ''وفا'' کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت کو اپنالو، تم جتنا جتنا آپ کی سیرت اور سنت کو اپناؤ گے اور آپ کی چھوٹی چھوٹی سنت کو بھی اپناؤ گے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا، اور جتنا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا، یہ کائنات تمہارے آگے مسخر ہوجائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ایک ایک سنت اپنی زندگی میں داخل کرو

ہر انسان اپنا جائزہ لے کہ میں کس کس سنت پر عمل کررہا ہوں اور کون کون سی سنت میں نے چھوڑی ہوئی ہے، جس سنت کو چھوڑ رکھا ہے، اس کو عزم کرکے اپنی زندگی میں اپنالے، اور یہ عزم کرلے کہ میری آئندہ کی زندگی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق گزرے گی، مثلاً یہ کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح سوتے تھے، کس طرح جاگتے تھے، کس طرح گھر کے اندر رہ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ معاملہ فرماتے تھے، کس طرح مہمانوں سے معاملہ کرتے تھے، کس طرح میل جول والوں کے ساتھ برتاؤ رکھتے تھے؟ مسجد میں کس طرح داخل ہوتے، اور کس طرح نکلتے تھے؟ وغیرہ۔ ان تمام سنتوں کا مطالعہ کرو۔ حضرت عارف باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم'' میں یہ ساری سنتیں جمع کی ہوئی ہیں۔ پھر جائزہ لے کر ایک ایک سنت کو اپنی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کریں۔

میری اتباع کرو، اللہ کی محبت حاصل ہوگی

اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا:

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۱)

فرمایا کہ جو میرے محبوب کے ساتھ محبت کرے گا، جو میرے محبوب کی سنتوں پر عمل کرے گا وہ حقیقت میں مجھ سے محبت کرے گا۔ اور تم کیا محبت کرو گے، اللہ تم سے محبت کرے گا، اگر تم نے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اپنالیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۱) سورۃ آل عمران: آیت (۳۱)

رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ

فہرستِ مضامین

دعا نمبر ۲۳

رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اَمَّا بَعْدُ!

ایسی دعا ضرور قبول ہوگی

بزرگانِ محترم وبرادرانِ عزیز! کافی عرصہ سے ''مناجاتِ مقبول'' کی دعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے اور کئی دعاؤں کی تشریح گزشتہ مجالس میں بیان ہوچکی الحمدللہ۔ اگلی دعا یہ ہے۔

رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (۱)

یہ دعا بھی لفظ ''قل'' سے شروع ہورہی ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ جو دعائیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو تعلیم اور تلقین فرمائی ہیں کہ ہم سے یوں کہو، ایسی دعاؤں کے ردّ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جود وکرم کی شان سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ ہم سے یہ کہیں کہ ''یوں کہو''، پھر ان کی تعمیل

---

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۲۹)

میں ہم کہیں اور وہ اس دعا کو ردّ فرمادیں۔ ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ بہرحال! یہ دعا بھی ''قل'' سے شروع ہوئی ہے اور حضرت نوح کو تلقین فرمائی گئی ہے۔

کشتیٔ نوح میں جانوروں کا ایک ایک جوڑا

حضرت نوح علیہ السلام وہ پیغمبر ہیں جو ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو دعوت اور تبلیغ فرماتے رہے، لیکن بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے، باقی سب لوگ کفر اور شرک میں مبتلا رہے اور آپ کی تکذیب کرتے رہے ان کے کفر اور تکذیب کے نتیجے میں ان پر طوفان کا عذاب آنا تھا، اس عذاب اور طوفان سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کو حکم دیا کہ تم ایک کشتی بناؤ، اور زمین پر جتنے جانور مقیم ہیں، ان سب کا ایک ایک جوڑا اس کشتی میں سوار کرو، اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں، ان کو بھی کشتی میں سوار کرلو، تاکہ انسانوں، جانوروں کی نسل ختم نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر طوفان نے تمام انسان، جانوروں کو ختم کردیا تو پھر انسانوں اور جانوروں کی نسل ختم ہوجائے گی۔

تمام جانوروں سے وعدہ لیا گیا

عجیب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تمام جانوروں کے ایک ایک جوڑے کو اس کشتی پر سوار کرلیا۔ اس میں سانپ بھی تھا، بچھو بھی تھا، شیر بھی تھا، بھیڑیا بھی تھا، لومڑی بھی تھی۔ اس میں خرگوش بھی تھا اور عام طور پر یہ جانور ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جب یہ سب ایک جگہ پر سوار ہوگئے تو ان میں آپس میں لڑائی ہوتی۔

چنانچہ بعض روایات [1] میں آتا ہے کہ ان جانوروں کو سوار کرنے سے پہلے ان سے وعدہ لیا گیا کہ تمہاری جان بچانے کے لئے تمہیں کشتی میں سوار کیا جا رہا ہے، لیکن کوئی جانور دوسرے جانور کو تکلیف نہیں پہنچائے گا، بلکہ سب جانور ایک جگہ پر رہیں گے۔ واللہ اعلم

جانور کی ایذاء رسانی سے بچنے کا وظیفہ

اس لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ اگر کسی جانور کی ایذاء رسانی سے بچنا ہو تو اس کے لئے یہ وظیفہ بتایا جاتا ہے کہ:

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ [2]

کثرت سے پڑھا جائے اور جب کوئی شخص یہ آیت پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس موذی جانور کو اس معاہدے کی یاد دہانی کے لئے الہام فرما دیتے ہیں کہ جو معاہدہ تم نے حضرت نوح کے ساتھ کیا تھا۔ لہٰذا اب بھی تم اسی معاہدے کی پاسداری کرتے ہوئے ہمارے اسی بندے کو تکلیف مت دو ۔ واللہ اعلم۔ بہرحال! یہ وظیفہ مشہور ہے۔

کشتی پر سوار ہونے کے بعد کی دعا

اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح سے فرمایا کہ جب تم کشتی کے اندر سوار ہو جاؤ تو یہ کہو:

---

(۱) ماخوذ از حلية الاولياء لأبى نعيم ٤ / ٤٣ وتاريخ دمشق لابن عساكر ٦٢ / ٢٥٧

(۲) سورة الصافات: آيت (٧٩)
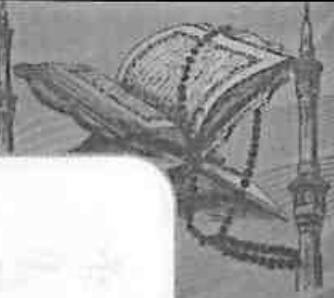
رَّبِّ اَنۡزِلۡنِىۡ مُنۡزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنۡتَ خَيۡرُ الۡمُنۡزِلِيۡنَ

یعنی اے میرے رب! مجھے ایسی جگہ پر اتاریئے جو مبارک ہو اور آپ سب سے بہترین اتارنے والے ہیں۔

یہ اس دعا کا لفظی ترجمہ ہے۔

کشتی پر سوار ہوتے وقت کی دعا

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں حضرت نوح کی دو دعائیں نقل فرمائی ہیں۔ ایک دعا وہ ہے جو حضرت نوح نے خود مانگی ہے، اس وقت جب خود کشتی پر سوار ہونے لگے اور لوگوں کو سوار کرنے لگے تو ان سے کہا کہ یہ دعا کرتے ہوئے سوار ہوں:

بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖٮهَا وَمُرۡسٰٮهَا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ [(۱)]

اس کا چلنا بھی اللہ ہی کے نام سے ہے، اور لنگر ڈالنا بھی، یقین رکھو کہ میرا پروردگار بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کشتی نما جتنی سواریاں ہیں ان میں جب سوار ہوں تو یہ دعا پڑھ کر سوار ہونا چاہئے۔

برکت کا کیا مطلب؟

اس کے علاوہ دوسری دعا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح عَلَیْہِ السَّلَام کو سکھائی کہ:

---

(۱) سورۃ ھود: آیت (۴۱)

رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ

یعنی تم کشتی میں سوار ہونے کے بعد یہ کہو کہ اے میرے پروردگار! مجھے ایسی جگہ پر جا کر اتاریئے جو برکت والی ہو۔ ''مبٰرکاً'' کے معنیٰ ہیں ''برکت والی جگہ'' اب یہ برکت ایسی چیز ہے، جس کی جامع اور مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ ہم لوگ خوشی کے موقع پر ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ ''مبارک ہو'' مثلاً شادی ہوئی تو کہا کہ ''مبارک ہو'' امتحان میں کامیابی ہوئی تو کہا کہ ''مبارک ہو'' کسی نے نیا گھر بنالیا تو کہا کہ ''مبارک ہو'' کسی نے گاڑی خرید لی تو کہا کہ ''مبارک ہو'' خوشی کے موقع پر دعا دی جاتی ہے کہ ''مبارک ہو'' اس کا کیا مطلب ہے؟

''بنگلہ'' ہے اس کی برکت نہیں

آج کی یہ دنیا گنتی کی دنیا ہے۔ ہر شخص گنتی بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے۔ مثلاً میرے پاس پیسے زیادہ ہوجائیں، میری دولت زیادہ ہو جائے، میری جائیداد زیادہ ہو جائے۔ ہر چیز میں گنتی زیادہ ہو جائے، جبکہ ''گنتی'' میں بڑھوتری کا نام برکت نہیں ہے، بلکہ ''برکت'' اس کا نام ہے جو چیز بھی انسان کے پاس ہو، اس کا صحیح فائدہ اس کو پہنچ جائے۔ مثلاً ایک آدمی کے پاس بہت شاندار بنگلہ ہے، ساری دنیا سے لوگ آ کر اس کو دیکھتے ہیں اور اس کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ کتنا شاندار بنگلہ بنایا ہے، لیکن جو اس بنگلہ کا مالک ہے اور جس نے وہ بنگلہ بنایا ہے وہ بیمار پڑا ہوا ہے اور اس میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اس بنگلہ کی سیر کر لے۔ اب دیکھئے کہ ''بنگلہ'' تو ہے لیکن اس کی برکت نہیں ہے۔

گاڑی ہے، اس کی برکت نہیں

اسی طرح دنیا کی ہر چیز میں دیکھ لو، مثلاً ایک شخص نے بہت شاندار گاڑی خریدی، اب دیکھنے میں وہ بہت اعلیٰ ہے، لیکن اس شخص کو اس گاڑی میں سوار ہونا نصیب نہیں، یا وہ اس گاڑی میں سوار تو ہوا، لیکن روزانہ اس گاڑی میں کوئی نہ کوئی نقص پیدا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ''گاڑی'' تو ہے، لیکن اس میں برکت نہیں۔ یا مثلاً ایک شخص نے شادی کر لی، اب بظاہر دیکھنے میں وہ بیوی اچھی ہے، خوبصورت بھی ہے، لیکن مزاجوں میں موافقت نہ ہوئی اور دل نہیں ملے، اب ''شادی'' تو ہوئی، لیکن اس کی برکت حاصل نہ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی چیز برکت ہے

قرآنِ کریم اس طرف توجہ دلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی چیز ''گنتی'' نہیں ہے، بلکہ مانگنے کی چیز ''برکت'' ہے کہ یا اللہ! جو چیز بھی آپ کی طرف سے ملے، اس میں میرے لئے ''برکت'' ہو۔ اس چیز کے نقصان کم ہوں اور اس کے فائدے زیادہ ہوں اور اس چیز کا جو اصل مقصود ہے وہ مجھے حاصل ہوجائے۔ دنیا کے جتنے بھی اسباب اور وسائل ہیں وہ بذاتِ خود ''راحت'' نہیں ہیں، بلکہ ''راحت'' تو براہِ راست اللہ جل شانہ کی عطا ہوتی ہے وہ چاہے تو ''جھونپڑے'' میں راحت دے دے اور چاہے تو بڑے بڑے ''محلات'' سے راحت نہ ملے۔ لہٰذا یہ آیت اور یہ دعا ہمیں یہ سکھا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی چیز ''برکت'' ہے، گنتی پر نہ جاؤ، جب اللہ تعالیٰ برکت عطا فرماتے ہیں تو تھوڑی چیز

میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرما دیتے ہیں اور جب برکت نہیں ہوتی تو وہ چیز مقدار میں زیادہ ہوتی ہے، لیکن اس سے فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور جو مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔

برکت والی جگہ کی دعا کرو

لہٰذا فرمایا کہ تم یہ دعا کرو کہ ''رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا'' اے ہمارے رب! ہمیں ایسی جگہ اتاریئے جو برکت والی ہو، اور جب آپ کی طرف سے برکت ہوگی تو چاہے اس جگہ کوئی مکان نہ ہو، کوئی عمارت نہ ہو، لیکن جب آپ کی طرف سے برکت ہوگی تو کھلے میدان میں بھی ہم خوشگوار زندگی گزار لیں گے۔ اگر برکت نہ ہوئی تو پھر مکان اور تعمیر ہونے کے باوجود اس جگہ پر ہمیں راحت نہیں ملے گی۔

''منزل'' جہاں آدمی خود اترے

اس دعا میں ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ خاص طور پر ہم جیسے طالبِ علموں کے لئے ''رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا'' یعنی کسی مبارک منزل میں اتار دیجئے۔ بلکہ ''مُنْزَلًا'' کا لفظ لائے ''مُنزل'' کے کیا معنیٰ ہیں؟ ''مُنزل'' کے معنیٰ یہ ہے کہ وہ جگہ جہاں پر لاکر اتارا جائے اور ''مَنزِل'' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پر آدمی خود اتر جائے۔ مثلاً ایک آدمی نے ''حیدرآباد'' جانے کا ارادہ کیا تو چونکہ ''حیدرآباد'' کا پہلے سے ارادہ کر رکھا ہے تو اس کی ''مَنزِل'' ہے۔

''مُنزل'' جہاں اتارا جائے

جبکہ ''مُنزل''اس جگہ کو کہتے ہیں جس جگہ کو اللہ تعالیٰ اتارنے کے لئے منتخب فرمائیں۔ جہاں آپ اتار دیں، اس سے اشارہ اس طرح فرمادیا کہ جب کشتی پر سوار ہو گئے تو اب یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ کشتی کہاں رکے گی؟ اور کس جگہ جا کر اترنا ہے؟ لہٰذا یہ دعا کی جا رہی ہے کہ ''یا اللہ! آپ جس جگہ کو اتارنے کے لئے منتخب فرمائیں وہ جگہ برکت والی ہو۔'' اس سے یہ سبق ملا کہ جب آدمی کسی سفر پر جائے تو اس کو یہ دعا پڑھنی چاہئے کہ ''یا اللہ! مجھے ایسی جگہ اتاریئے جو آپ کی پسندیدہ ہو، آپ کی منتخب شدہ ہو، اس جگہ پر مجھے اتاریئے۔''

اتارنے کی جگہ پہلے سے متعین تھی

پھر ایک عظیم بات اس دعا میں اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ خود اللہ تعالیٰ حضرت نوح کو حکم دے رہے ہیں کہ یہ دعا مانگو۔ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ پوری قوم پر طوفان آئے گا اور اس طوفان میں ساری مخلوق ہلاک ہوجائے گی، اور حضرت نوح اور ان پر ایمان لانے والوں کو نجات ملے گی۔ لہٰذا جگہ تو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے طے کر رکھی تھی کہ فلاں جگہ پر ان کو اتارنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ''علمِ ازلی'' میں بھی یہ بات طے تھی۔ آپ کی ''تقدیر'' میں بھی یہ بات طے تھی کہ فلاں جگہ اتارنا ہے اور ظاہر ہے خود حضرت نوح کو بھی پتہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ اسباب مہیا فرمادیئے کہ یہ طوفان ہے اور اس میں موجیں امڈ رہی ہیں اور مجھے اللہ تعالیٰ نے کشتی مہیا فرمادی ہے اور اس کشتی میں سب

ساتھی موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی میرے ساتھ خاص نصرت ہے، جس کی وجہ سے ہماری کشتی پہاڑوں جیسی موجوں میں چلی جارہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو پورا یقین تھا کہ اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں کسی اچھی جگہ پر اتار دیں گے، جو جگہ ہمارے لئے نجات کا ذریعہ اور ہماری بڑھوتری کا ذریعہ بنے گی۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں جن کا یقیناً حضرت نوح علیہ السلام کو احساس تھا، امید تھی اور یقین تھا۔

حصول یقینی ہونے کے باوجود اللہ سے مانگے

لیکن یہ ساری چیزیں جاننے کے بعد اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں لکھنے کے بعد پھر بھی کہا جارہا ہے کہ ہم سے یہ دعا کرو کہ "رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ" اس کے ذریعہ یہ سبق دیا جارہا ہے کہ اگر کسی چیز کا حصول یقینی ہو، تب بھی انسان کو وہ چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ چاہے کسی چیز کے حصول کا کتنا بھی یقین ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور اللہ تعالیٰ سے وہ چیز مانگو۔

توکل کے بارے میں لوگوں کا خیال

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک بات لکھی ہے کہ "توکل" یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا، اس کے بارے میں عام طور پر یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "توکل" اور "رضا بالقضاء" کا موقع اس وقت آتا ہے جس جگہ پر کامیابی یقینی نظر نہ آرہی ہو۔ اس موقع پر "توکل"

اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ [1]

اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یقیناً اللہ سارے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔

جس چیز کے ملنے کا یقین ہو وہ بھی اللہ سے مانگے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''توکل'' اور ''بھروسہ'' کا سب سے اہم موقع وہ ہے جہاں بظاہر دیکھنے میں یقینی طور پر کامیابی نظر آ رہی ہو اور پھر انسان اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ مثال دی ہے کہ مثلاً ایک شخص ایک تھالی میں کھانے کی اشیاء لے کر آپ کے پاس آ رہا ہے۔ اس تھال میں کھانا ہے، پھل ہے، دوسری لذیذ چیزیں ہیں، آپ سے دس گز کے فاصلے پر وہ شخص موجود ہے۔ اب اس وقت آپ کو تقریباً یقین ہے کہ یہ کھانا یقیناً مجھ تک پہنچ جائے گا۔ لیکن اس وقت بھی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان یہ دعا کرے کہ یا اللہ! یہ کھانا مجھ تک پہنچا دیجئے اور مجھے یہ کھانا کھلا دیجئے۔ یہ خاص طور پر ''توکل'' اور دعا کا موقع ہے اس موقع پر بجائے اس کے کہ انسان ان اسباب پر بھروسہ کرے، اس وقت بھی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے کہ یا اللہ! مجھے یہ کھانا کھلا دیجئے۔ اس دعا کے ذریعہ یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ انسان کو جس چیز کے ملنے کا مکمل یقین بھی ہو۔ وہ چیز بھی انسان اللہ تعالیٰ سے مانگے۔

---

(۱) سورۃ الغافر: آیت (٤٤)

سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں خزانہ ہیں

سورۃ البقرہ کی جو آخری دو آیات ہیں، یعنی: ''اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ'' سے لے کر سورت کے اختتام تک۔ ان دو آیتوں کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے جو خزانے ہیں، ان خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں پہلے تو یہ اعلان فرمایا کہ:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا

یعنی اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان کو کسی بھی جاندار کو، کسی بھی متنفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، کوئی ایسا حکم نہیں دیتے جو اس کی برداشت سے باہر ہو، اس کے لئے بوجھ بن جائے اور وہ اس کو انجام نہ دے سکے۔ یہ اعلان تو پہلے کر دیا۔

اعلان کے باوجود تکلیف نہ دینے کی دعا

لیکن اسی آیت کے آخر میں یہ دعا سکھائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس طرح دعا کرتے ہیں کہ:

رَبَّنَا وَ لَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ

(۱) مسند احمد ۳۵ / ۲۷٤ (۲۱۳٤٥) وقال الهيثمی فی "المجمع" ۷ / ۲۲ (۱۰۸۲۲ و ۱۰۸۲۳) رواه كله أحمد بأسانيد و رجال أحدها رجال الصحيح.

یا اللہ! ہم پر ایسا بوجھ مت ڈالئے جیسا بوجھ پچھلی امتوں پر ڈالا تھا اور اے اللہ! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالئے، جس کے اٹھانے کی ہمارے اندر طاقت نہ ہو۔

اب دیکھئے کہ یہ اعلان تو پہلے کردیا کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کہ تمہیں وسعت سے زیادہ ہم تکلیف نہیں دیں گے۔ اب دعا کرانے کی کیا ضرورت؟

ہر وقت انسان اللہ سے مانگتا رہے

درحقیقت اس کے ذریعہ یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ بحیثیت بندے کے تمہارے کام یہ ہے کہ تم ہم سے مانگو اور کہو ''رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ'' حالانکہ جب اللہ تعالیٰ نے اعلان کردیا تو اب اس بات میں ادنیٰ شبہ بھی باقی نہیں رہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا حکم نہیں آئے گا جو ہماری برداشت سے باہر ہو۔ لیکن پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ دعا کرو۔ اس کے ذریعہ یہ سکھایا جا رہا ہے کہ تمہارا ہر وقت اللہ سے رابطہ ہونا چاہئے۔ چاہے تمہیں ایک چیز یقینی نظر آ رہی ہو کہ یہ ہوگی، تب بھی مانگو کہ یا اللہ! مجھے عطا فرما دیجئے۔ یہ بندگی کا لازمی تقاضا ہے کہ بندہ ہر وقت اپنے اللہ کو پکارتا رہے، چاہے وہ جس حالت میں بھی ہو۔

بچے کا ہر تکلیف کے وقت ''ماں'' کو پکارنا

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جیسے ایک چھوٹا بچہ ہوتا ہے، اس بچے کی کل کائنات اس کی ''ماں'' ہے۔ جب بھی اس کو تکلیف پہنچے گی،

اس کو کوئی حاجت پیش آئے گی، فوراً وہ اپنی ماں کو پکارے گا، اگر وہ اپنے گھر سے باہر کھیل رہا ہے، وہاں پر اس بچے کو کسی نے ستایا، کسی نے اس کو مارا تو اگرچہ وہاں ماں موجود نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ ''امی'' کہہ کر پکارے گا۔ حالانکہ اس بچے کو پتہ ہے کہ امی یہاں موجود نہیں ہے اور میری آواز ماں نہیں سن رہی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کی زبان پر یہی لفظ چڑھا ہوا ہے، اس لئے کہ اس کی فطرت میں یہ بات داخل ہوگئی ہے کہ وہ ماں کو پکارے۔

''مانگنا'' تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ

حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ارے بھائی! تم اللہ تعالیٰ سے کم از کم اتنا تعلق تو قائم کرلو جتنا ایک چھوٹے بچے کو اپنی ماں کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بھی تمہیں حاجت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ چاہے وہ حاجت پوری ہوتی نظر آرہی ہو اور یقینی ہو، اس میں ادنیٰ شک نہ ہو، پھر بھی اللہ سے مانگو۔ لہٰذا یہ مانگنا اور مانگتے رہنا یہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ادنیٰ حاجت بھی پیش آئے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی عادت ڈالو۔

مشق کے بعد مانگنے کی عادت

اور جب انسان اس کی مشق کرتا ہے تو پھر اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا، بس دل ہی دل میں وہ اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہوتا ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کس سے مانگا؟ اور کیا مانگا؟ اور کس سے تعلق قائم

کرلیا؟ اور کس کے ساتھ جوڑ بٹھالیا؟ اور جب بندہ مانگنے کی مشق کرتا ہے تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ دل میں مانگ ہی رہا ہوتا ہے۔ چاہے وہ زبان سے کچھ بھی نہ کہہ رہا ہو، اور دیکھنے والے کو پتہ بھی نہ چلے۔

کسی کے سوال کے وقت فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "الحمد للہ" کبھی اس عمل میں تخلّف نہیں ہوتا کہ جب کوئی شخص میرے پاس آتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے تو اس وقت میں فورًا دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں یا اللہ! یہ شخص پتہ نہیں کیا سوال کرے گا۔ اے اللہ! اس کے سوال کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے۔ لہٰذا جب بھی کوئی حاجت پیش آئے کوئی واقعہ پیش آئے تو بندہ کا اللہ تعالیٰ سے اس وقت رابطہ استوار ہوتا ہے۔ مثلاً جب کھانا سامنے آیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! اس کھانے کا کوئی نقصان نہ ہو۔ جب گھر میں داخل ہوں تو یہ دعا کرتے ہوئے داخل ہوں کہ یا اللہ! مجھے اچھی طرح داخل کیجئے اور اچھی طرح خارج کیجئے۔ یا اللہ! گھر کے اندر میں سب کو عافیت کے ساتھ پاؤں۔

"مسنون دعائیں" تعلق مضبوط کرنے کا ذریعہ

یہ دعائیں اس لئے سکھائی جارہی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرے اور ان کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل

کرے۔ ارے جو مانگا ہے وہ ملے گا یا نہیں؟ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر موقوف ہے، اگر حکمت کے موافق ہوگا تو ضرور دیں گے، اگر حکمت کے موافق نہیں ہوگا تو وہ چیز نہیں دیں گے، بلکہ اس سے اچھی چیز دیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لینا ہی بذاتِ خود ایک کامیابی ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک بزرگ کا واقعہ بیان فرمایا، اور یہ واقعہ درحقیقت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی بوستان سے ماخوذ ہے کہ ایک بزرگ پابندی سے تہجد پڑھتے۔ جب تہجد کے لئے اٹھتے تو ان کا ایک مرید ان کو وضو کرایا کرتا تھا۔ وضو کے بعد وہ تہجد میں مشغول ہو جاتے تھے۔ ایک رات جب اٹھے اور وضو کرنے لگے تو ایک غیبی آواز آئی کہ ''نہ تیرا وضو قبول ہے نہ تیری نماز قبول ہے، نہ تیری عبادت قبول ہے'' یہ آواز اپنے کانوں سے سنی، اس کے بعد اطمینان سے وضو کیا اور نماز پڑھ لی۔ جب اگلے دن تہجد کے لئے اٹھے تو پھر وہی غیبی آواز آئی کہ اور اپنے کانوں سے سنی، پھر اطمینان سے وضو کیا اور تہجد کی نماز ادا کی۔ جب تیسرے دن تہجد کے لئے اٹھے تو پھر وہی غیبی آواز آئی، لیکن آپ نے اطمینان سے وضو کیا اور نمازِ تہجد ادا کی۔

وہ مرید بھی تین راتوں سے یہ آواز سن رہا تھا۔ اس مرید نے کہا کہ حضرت! روزانہ یہ آواز آرہی ہے کہ نہ آپ کا وضو قبول ہے نہ تہجد قبول ہے، نہ عبادت قبول ہے۔ پھر آپ کیوں اتنی مشقت اٹھا رہے ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ تم یہ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہو جب مقبول نہیں ہے یہ محنت کرنے کی کیا ضرورت؟ لیکن کوئی

در ہوتو بتادو، میں وہاں چلا جاتا ہوں۔ ''در'' تو صرف ایک ہی ہے وہ چاہے قبول کریں یا نہ کریں، میرا کام یہ ہے کہ اس ''در'' کو کھٹکھٹاتا رہوں ؎

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ ''سجدہ'' جسے تیرے آستاں سے نسبت ہے

تمہاری ہر عبادت قبول ہے

اور جب کوئی ''در'' نہیں ہے بس ایک ہی ''در'' ہے تو میں اسی ''در'' کو کھٹکھٹاتا رہوں گا۔ اس کے بعد پھر غیب سے یہ آواز آئی کہ ؎

قبول است گرچہ ہنر نیستن
کہ جز ما پناہ دگر نیستن

یعنی اگرچہ تمہاری عبادت ہماری شان کے مطابق تو نہیں ہے، لیکن قبول ہے، اس لئے کہ تم نے یہ اعتراف کرلیا کہ ہمارے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ بھی نہیں ہے۔ لہٰذا تمہارا وضو بھی قبول ہے، نماز بھی قبول ہے اور عبادت بھی قبول ہے۔

دعا کے ذریعہ ''عرشِ عظیم'' تک پہنچ ہوگئی

بہرحال! بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ چاہے دعا قبول ہو یا نہ ہو اور وہ کام ہمارا بنتا ہے یا نہیں بنتا، وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ اس میں تفویض پر ہی عمل کرنا ہے کہ جو اس کی حکمت اور مشیت ہوگی، اس کے مطابق ہوگا۔ لیکن تم نے جب ایک مرتبہ ایک پروردگار کو پکارلیا اور اپنی حاجت اس کی بارگاہ میں پیش کردی تو اتنا بڑا معاملہ انجام پاگیا کہ تمہاری پہنچ زمین سے عرش تک ہوگئی۔ اس لئے کہ

جب بندہ اللہ تعالیٰ سے مانگ رہا ہوتا ہے تو اس کی آواز، اس کی سانس، اس کے دل کی سب خواہشات اور حاجات سب عرش تک جا رہی ہوتی ہیں اور یہ کوئی معمولی بات ہے کہ تمہیں اس بارگاہ کا قرب حاصل ہوگیا اور اس عرشِ عظیم تک تمہاری پہنچ ہوگی۔

خاک کے راستے ''عرش'' تلک جانے دے

جس زمانے میں میرے گھٹنے میں بہت تکلیف تھی اور میں وہیل چیئر پر تھا اور نماز کے لئے بھی ''ویل چیئر'' پر جاتا تھا اور بیٹھ کر نماز پڑھتا تھا اور زمین پر سجدہ نہیں ہوتا تھا، اس وقت میرے منہ سے یہ دعا نکلی کہ یا اللہ! اپنے فضل وکرم سے اپنے سجدے سے مجھے محروم نہ فرما۔ ہمارا ایک ساتھی جو دارالعلوم میں دورۂ حدیث میں پڑھتا تھا وہ شاعر قسم کا تھا اس نے اس پر ایک نظم کہہ دی کہ:

مجھ کو سجدوں میں تڑپنے کا مزہ پانے دے

میں نے بھی اس نظم میں دو شعر کہہ دیئے تھے کہ ؎

بندگی عشق بھی ہے سوز بھی ہے، ناز بھی ہے
راز کی بات ہے چپکے ہی سے پہنچانے دے
طالبِ قرب ہوں، لیکن میری کرسی ہے حجاب
خاک کے راستے اب عرش تلک جانے دے

مطلب یہ ہے کہ جب سجدہ میں پڑ گیا اور خاک کے اوپر سر جھکا دیا اور مولیٰ کو پکار لیا تو بس! انسان عرش پر پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی پکار عرش تک پہنچ جاتی ہے۔
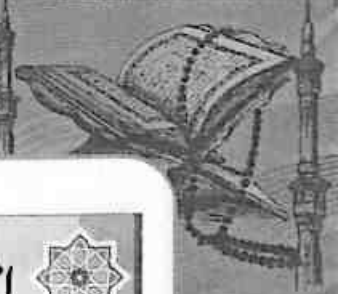
امتحان میں کامیابی کی دعا

مثلاً کسی طالبِ علم نے یہ دعا کی کہ: ''یا اللہ! مجھے امتحان میں کامیاب کردے۔'' اب چاہے امتحان میں کامیاب ہو یا نہ ہو، لیکن جس وقت تو نے اپنے مولیٰ سے یہ بات کہہ دی اور وہ بات اس تک پہنچ گئی تو اس وقت تو کامیاب ہوگیا۔ پھر یہ امتحان میں کامیابی کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کے لئے جب اس ذات کے ساتھ رشتہ جڑ گیا اور اس نے تمہاری بات سن لی اور تو نے اپنی بات اس تک پہنچا دی تو بس تم کامیاب ہو گئے۔

میانِ عاشق ومعشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

پھر تو وہ ''محبوب'' اور ''محب'' کا رشتہ ہے اور ''محبوب'' کو چپکے سے بات کہی جاتی ہے۔

یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ادۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ [1]

مجھے پکارو، میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔

جواب دینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر وہ چیز دینی کی ہوئی تو تمہیں وہ چیز دے دوں گا، لیکن وہ چیز دینے کی نہیں ہوئی تب بھی اس دعا کو قبول کرلوں گا۔ وہ دعا بحیثیت بندگی کے اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوجائے گی۔

---

(۱) سورۃ الغافر: آیت (۶۰)

ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگو

اور بزرگوں کی صحبت سے جو چیز حاصل ہوتی ہے، وہ یہ "تعلق مع اللہ" ہے اور یہ رشتہ ہے اور اس رشتہ کی تقویت حاصل ہوتی ہے اور "دعا" اس تعلق کو قائم کرنے کے لئے بہت آسان، مجرب اور نہایت کامیاب ذریعہ ہے۔ لہٰذا چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو اور جس چیز کا حصول یقینی ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور اس آیتِ کریمہ اور تمام دعاؤں کا یہی سبق ہے اور ہر جگہ یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ انہوں نے فلاں وقت ہم سے مانگا تھا، ہم نے دے دیا۔ فلاں وقت یہ مانگا تھا، ہم نے دے دیا۔

دعا کرنا ہی قبولیت ہے

بعض لوگ یہ اشکال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ سے فلاں چیز مانگی، لیکن وہ چیز نہیں ملی حقیقت میں "ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" کے معنیٰ ہیں کہ اس وقت تمہارا ایک مقصد تو حاصل ہوگیا وہ یہ کہ میں نے تمہاری اس دعا کو بحیثیت بندگی قبول کرلیا اور دوسری یہ جب حکمت اور مصلحت ہوگی ہم وہ چیز بھی تمہیں دے دیں گے اور اگر وہ چیز تمہارے لئے مضر ہوگی تو تمہیں نہیں دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامات آنا شروع ہو جائیں گے

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے دل کو ایسا بناؤ کہ وہ دل ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ

کچھ مانگ رہا ہو اور مشق کرنے سے یہ چیز حاصل ہوجاتی ہے۔ میں نے اپنے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ سرہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب تو کچھ ایسی حالت ہوگئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب یہ کرلو، اب یہ کرلو۔ یعنی وہ رشتہ اللہ تعالیٰ نے اتنا مضبوط کر دیا ہے کہ اب خود دل ہی دل میں پیغامات آرہے ہیں۔ ہم بھی دل سے بات کررہے ہیں اور وہ بھی دل سے بات کررہے ہیں اور ہر وقت ہم بھی ان سے کچھ مانگ رہے ہیں اور وہ بھی بتا رہے ہیں کہ یہ کرلو، یہ کرلو، تو کثرتِ دعا کی مشق سے یہ مقام حاصل ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ مقام عطا فرمادے اور اپنی ذات سے ہمارا تعلق قوی اور مضبوط فرمادے اور ہر وقت منگتا بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دعا نمبر ۲۴ حصہ اوّل

رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيۡنِ، وَاَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ يَّحۡضُرُوۡنِ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۲۴ حصہ اوّل

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! مناجات مقبول کی ان دعاؤں کی تشریح کا سلسلہ چل رہا ہے، جو دعائیں قرآنِ کریم میں ہیں۔ آگے جو دعا ہے وہ یہ ہے:

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (۱)

اس دعا کا ترجمہ ہے کہ:

اے میرے پروردگار! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے کچوکوں سے اور اے میرے پروردگار! میں اس بات کی

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۹۷ و ۹۸)
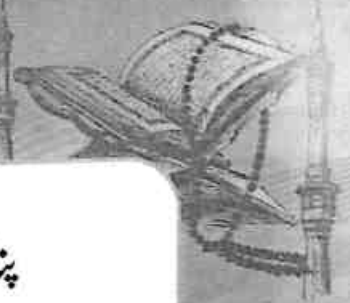
پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس موجود اور حاضر ہوں۔

یہ دعا باقاعدہ نبی کریم ﷺ کو سکھائی کہ آپ یہ کہو، اس لئے اس دعا کے آغاز میں ''قل'' بھی موجود ہے۔ یعنی آپ یہ کہو کہ میں شیاطین کے کچوکوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس موجود ہوں۔

میرا دل چاہا کہ شیطان کو باندھ دوں

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ جو دعا اللہ جل شانہ خود سکھائیں کہ ان الفاظ میں مانگو تو اس کی قبولیت میں کوئی شک نہیں۔ ان شاء اللہ! اور نبی کریم سرورِ دو عالم ﷺ کو تو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا تھا کہ شیطان ان کے آگے بالکل ''بے اثر'' ہوگیا تھا۔ چنانچہ ایک حدیث [1] میں حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ایک شیطان میرے سامنے آگیا تھا اور میرا دل چاہا کہ میں اس کو باندھ دوں، تاکہ صبح اس شیطان کو تم دیکھ لو کہ یہ شیطان کیسا ہے؟ لیکن پھر مجھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آگئی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِي [2]

یا اللہ! مجھے ایسی سلطنت عطا فرمایئے جو میرے بعد کسی اور کو ایسی سلطنت نہ ملے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱ / ۳۸۵ (۵٤۲)

(۲) سورۃ ص: آیت (۳۵)

اس لئے میں نے اس شیطان کو نہیں باندھا۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس تو شیطان پھٹکتا بھی نہیں تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر شیطان کا راستہ بدلنا

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عمر سے فرمایا کہ اے عمر! تم جس راستے پر چلتے ہو تو شیطان دوسرے راستے سے جاتا ہے، اس راستے سے نہیں جاتا۔[1]

حضرت شیخ الہند کی مجلس

مجھے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آگئی وہ فرمایا کرتے تھے کہ عصر کی نماز کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند میں ''مولسری'' کے درخت کے احاطہ میں بیٹھ جایا کرتے تھے اور دار العلوم دیوبند کے بعض اساتذہ اور طلباء بھی آپ کے پاس آجایا کرتے تھے اور مجلس ہوجاتی تھی۔ اس مجلس میں کبھی کسی نے آپ سے کوئی سوال کرلیا اور آپ نے اس کا جواب دے دیا۔ میں اس زمانے میں بچہ تھا اور دارالعلوم میں پڑھتا تھا۔ میری عمر کے بچے سب کھیلنے جایا کرتے تھے۔ میں عصر کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں چلا جایا کرتا تھا۔

شیطان کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ڈرنا، حضور سے نہ ڈرنا

ایک مرتبہ اس مجلس میں کسی نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ

---

(۱) صحیح البخاری، ۵ / ۱۱ (۳۶۸۳)

حضرت! میں نے حدیث میں یہ پڑھا ہے کہ جس راستے سے حضرت عمر گزرتے ہیں، اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا، کوئی اور راستہ اختیار کر لیتا ہے، ان سے ڈرتا ہے۔ لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کسی حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں آئی کہ آپ جس راستے سے گزر رہے ہوں تو شیطان دوسرا راستہ اختیار کر لے اور جب یہ شیطان حضرت عمر سے ڈرتا ہے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور زیادہ ڈرنا چاہئے۔

عظمت اور چیز ہے ''رعب'' اور چیز ہے

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص سوال کرتا تھا تو آپ پہلے تو لطیف انداز کا مختصر جواب دے دیتے اور اس کے بعد پھر تحقیقی اور تفصیلی جواب دیتے۔ جب اس شخص نے آپ سے سوال کیا تو پہلا لطیف جواب تو یہ دیا کہ ''اس بیوقوف سے پوچھو، مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟'' پھر تحقیقی جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ''عظمت'' اور چیز ہے اور ''رعب'' اور چیز ہے۔ بعض حضرات ایسے ہوتے ہیں کہ دل میں ان کی ''عظمت'' تو ہوتی ہے، لیکن بے تکلفی کی وجہ سے ''رعب'' اتنا نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ دوسرے لوگوں کو اپنے سے اتنا بے تکلف کر لیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان کا رعب اتنا نہیں ہوتا۔ بعض حضرات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طبیعت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں پر ان کا رعب طاری ہوتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رعب ایک ماہ کی مسافت تک

ویسے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

"نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ "[1]

یعنی رعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے کہ ایک مہینے کی مسافت پر بھی میرا دشمن ہوتا ہے تو اس پر میرا رعب طاری ہوجاتا ہے اور "دشمن" سے مراد ظاہری دشمن، جہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعلق ہے تو ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ سے اتنا بے تکلّف کر رکھا تھا کہ اس کے نتیجے میں وہ رعب نہیں تھا۔

جنت میں آدم کا شیطان سے مقابلہ کرانا

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی گئی کہ آپ یہ دعا مانگا کریں کہ یا اللہ! شیطان کے کچوکوں سے بچا اور ان کی موجودگی سے مجھے بچا۔ دراصل یہ تعلیم امت کو دی گئی ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو واسطہ بنایا گیا اور شیطان سے بچنے کا ایک طریقہ اور ایک ہتھیار اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اس لئے پیدا کیا تاکہ بندوں کی آزمائش ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تو پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً [2]

یعنی اس زمین میں اپنا خلیفہ بھیج رہا ہوں۔

اس لئے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنا تھا، لیکن پیدائش کے فوراً بعد زمین پر نہیں بھیجا، بلکہ پہلے آپ کو جنت میں رکھا اور وہاں پر شیطان سے ان کا مقابلہ کرایا اور جب شیطان کا کچوکہ لگ گیا اور وہ گندم یا جو چیز بھی تھی وہ

---

(۱) صحیح البخاری ۱ / ۹۵ (٤٣٨)

(۲) سورۃ البقرہ: آیت (۳۰)

حضرت آدم علیہ السلام نے شیطان کے بہکانے کے نتیجے میں کھا لی اور بعد میں جب ندامت اور شرمندگی ہوئی کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے تو اس وقت پریشان ہوئے کہ میں کیا کروں۔

حضرت آدم علیہ السلام کو کلمات سکھائے

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہی حضرت آدم علیہ السلام کو سکھایا کہ یہ کلمات کہو:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۱)

اس کے ذریعہ توبہ اور استغفار کا طریقہ سکھایا اور زمین پر بھیجنے سے پہلے پوری عملی مشق کرائی اور فرمایا کہ جب تم زمین پر جاؤ گے تو یہ شیطان جو تمہارا دشمن ہے، یہ تمہیں پریشان کرے گا اور تمہیں بہکائے گا، تمہیں کچوکے لگائے گا، لہٰذا اس کا سدِّ باب یہ ہے کہ جب یہ کچوکے لگائے تو اس وقت تم ہم سے یہ کہو کہ

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

شیطان زہر، استغفار اس کا تریاق

یہ شیطان بظاہر تو ایسی خبیث چیز ہے کہ اس کو ''وسوسے'' ڈالنے کی طاقت بھی دے دی گئی، اس کو بہکانے کی طاقت بھی دے دی گئی، اس نے انسان کو یہ چیلنج بھی دیا کہ میں تمام انسانوں کو گمراہ کروں گا، ان کو گناہ کرنے کا حکم دوں گا

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۲۳)

اور یہ میرے حکم کی تعمیل کریں گے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کی شکل میں زہر پیدا فرمایا تو ساتھ میں ''تریاق'' بھی بتادیا کہ میں نے تمہارے لئے شیطان کی شکل میں زہر پیدا کردیا ہے، لیکن اس زہر کا ''تریاق'' اتنا آسان ہے کہ اس سے زیادہ آسان نہیں ہوسکتا۔ وہ تریاق ''استغفار'' ہے۔

شیطان کے حملوں سے پہلے کی ہتھیار

بلکہ شیطان کے حملوں سے پہلے بھی تمہیں ایک ہتھیار دے رہے ہیں اور حملوں کے بعد ایک دوسرا ہتھیار بھی دے رہے ہیں۔ حملوں سے پہلے کا ہتھیار یہ ہے کہ تم ہم سے پناہ مانگتے رہا کرو اور ہم سے کہا کرو کہ:

رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ،

لہٰذا جب تک اس نے حملہ نہیں کیا اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ حملہ کرے گا تو اس اندیشہ کے وقت میں تم ہماری پناہ لے لیا کرو اور یہ الفاظ کہا کرو کہ اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں کہیں ڈگمگا نہ جاؤں اور میں کہیں بھٹک نہ جاؤں، کہیں شیطان مجھ پر قابو نہ پالے۔ اے اللہ! مجھے شیطان سے محفوظ رکھئے اور جب تم ہم سے پناہ مانگو گے تو ہم اس کو تمہارے پاس نہیں آنے دیں گے۔

استغفار کرنے والا ''اصرار'' کرنے والوں میں نہیں

اور اگر کبھی تم نے غفلت کرلی اور ہم سے پناہ نہیں مانگی۔ جس کے نتیجے میں

شیطان تم پر حملہ آور ہوگیا تو اس وقت کے لئے ہم تمہیں دوسرا ہتھیار دیتے ہیں وہ ہے ''استغفار'' لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت سے اور اس کی رحمت سے یہ بات ممکن نہیں تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک طاقت ور دشمن پیدا فرمائیں اور اس کے مقابلے کی طاقت نہ عطا فرمائیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَفِيْ الْيَوْمِ سَبْعِيْن مَرَّةٍ(۱)

کہ جو شخص استغفار کرتا رہتا ہے، اس کو ''اصرار'' کرنے والوں میں شمار نہیں کیا جائے گا، چاہے وہ ایک دن میں ستر مرتبہ گناہ کرلے۔

شیطان سے بچنے کا پہلا مرحلہ

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ(۲)

غور سے دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں شیطان

---

(۱) سنن أبی داؤد ۲ / ۳۸۰ (۱۵۰۹) وسنن الترمذی ۵ / ۵۲۳ (۳۵۵۹) وقال:هذا حديث غريب، انما نعرفه من حديث أبی نصيرة، وليس اسناده بالقوی، والحديث ذكره الحافظ ابن حجر فی "فتح الباری" ۱ / ۱۱۲ وقال: واسناده حسن.

(۲) سورة آل عمران:آیت (۱۳۵)

سے بچنے کے تین مرحلے بیان فرمائے ہیں: پہلا مرحلہ وہ ہے کہ ابھی شیطان حملہ آور نہیں ہوا۔ مثلاً آپ نماز پڑھ رہے ہیں، لیکن اندیشہ اس بات کا ہے کہ کہیں شیطان میرے اندر ''ریا'' پیدا کردے یا مجھ سے کوئی گناہ نہ کرالے یا مثلاً آپ کسی ایسی جگہ جارہے ہیں، جہاں پر گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ آج کل کے دور میں جب آدمی کسی اجتماع میں جاتا ہے، کسی تقریب میں جاتا ہے، اس موقع پر اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ وہاں جاکر میں کسی گناہ کے اندر مبتلا نہ ہوجاؤں۔ اس موقع کے لئے فرمایا کہ جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اور یہ الفاظ کہہ دو کہ:

رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ○ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنَ ○

اس دعا کے ذریعہ بتادیا کہ گناہ سے پہلے ہی تم ہماری پناہ میں آجاؤ اور شیطان سے حفاظت حاصل کرلو اور ہم نے یہ بھی کہہ دیا کہ:

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا[1]

کہ شیطان کو تم یہ مت سمجھو کہ کوئی بہت طاقتور مخلوق پیدا کردی گئی ہے جو ہمارے اوپر مسلط کردی گئی ہے۔ نہیں! بلکہ شیطان کا مکر بہت ضعیف اور کمزور ہے، بلکہ شیطان ایک کمینہ دشمن ہے اور ''کمینہ'' آدمی کی یہ صفت ہوتی ہے کہ جو شخص اس کے آگے کمزور پڑ جائے تو وہ اس پر چھا جائے گا اور جو شخص اس کے آگے ڈٹ گیا تو بہت جلد بھاگ جاتا ہے۔ ڈٹنے والے کے سامنے نہیں ٹھہرتا۔

---

(۱) سورة النساء: آیت (۷۶)

کیوں؟ اس لئے کہ

اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا

شیطان کی چالیں درحقیقت کمزور ہیں۔

لہٰذا گناہ صادر ہونے سے پہلے یہ دعا کرلو اور اللہ کی پناہ میں آجاؤ ۔

شیطان سے بچنے کا دوسرا مرحلہ

دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ ایسا وقت تم پر آگیا کہ وہ شیطان تم پر حملہ کر رہا ہے اور تمہارے قدم ڈگمگا رہے ہیں اور تمہارے خیالات منتشر ہورہے ہیں اور گناہ کی طرف میلان ہورہا ہے اور اندیشہ اس بات کا ہے کہ میں گناہ کے اندر مبتلا ہوجاؤں گا۔ اس مرحلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓـئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ وَ اِخۡوَانُهُمۡ يَمُدُّوۡنَهُمۡ فِى الۡغَىِّ ثُمَّ لَا يُقۡصِرُوۡنَ (۱)

یعنی جب متقین شیطان کا کوئی پھیرا آجاتا ہے ''طائف'' لفظ استعمال فرمایا ''طائف'' کے اصل معنیٰ ہوتے ہیں ''گھومنے والا'' اور انسان کے دل میں جو ''خیال'' آتا ہے، اس کو بھی ''طائف'' کہتے ہیں۔ فرمایا کہ جن لوگوں کے اندر تقویٰ ہے، اگرچہ وہ انسان ہیں اور انسان ہونے کی وجہ سے شیطان سے گھبراتے ہیں، لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اللہ تعالیٰ کا رعب اس کے

(۱) سورة الاعراف: آیت (۲۰۱،۲۰۲)

دل پر زیادہ غالب ہے۔ ایسے متقی شخص پر شیطان کی طرف سے کوئی گھیرنے والا خیال دل میں آتا ہے تو اس وقت وہ لوگ ایک دم سے متنبہ ہوجاتے ہیں۔

فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں

فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ

اور متنبہ ہونے کے نتیجے میں فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ جس وقت شیطان کی طرف سے حملہ ہو رہا ہے، اس وقت کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ ذرا سا دھیان کرلو، اور توجہ کرلو کہ یہ شیطان میرے اوپر حملہ اور ہو رہا ہے اور میں اللہ کا بندہ ہوں اور اگر میں نے اس کی بات مان لی تو عذاب میں مبتلا ہوجاؤں گا اور جب اللہ کا دھیان آجاتا ہے تو اس وقت آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ آنکھیں کھل جانے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے شیطان آنکھوں پر پردہ ڈال رہا تھا، کیسا پردہ؟ خواہشات کا پردہ، لذتوں کا پردہ ڈال رہا تھا، لذت اندوزی کا پردہ ڈال رہا تھا کہ اچانک اس کو یاد آگیا کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں۔ میں شیطان کا بندہ نہیں ہوں جو مجھے بہکا رہا ہے۔ تو ایک دم سے آنکھیں کھل جاتی ہیں اور پردہ ہٹ جاتا ہے۔ حقیقت سامنے آجاتی ہے اور وہ اس گناہ سے بچ جاتا ہے۔

اس وقت دھیان اور توجہ سے کام لو

یہ نسخہ سب سے اہم ہے کہ شیطان کے عین حملے کے وقت ہمیں کیا کرنا ہے؟ وہ نسخہ یہ ہے کہ اس وقت میں دھیان کرو اور توجہ کرو کہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے دل میں کیسی خواہش پیدا ہو رہی ہے؟ میرے دل میں کس بات کی لالچ

آرہی ہے؟ یہ شیطان خواہش ڈال رہا ہے، اگر میں اس خواہش کو پورا کرنے میں آگے بڑھ گیا تو میں تباہ ہوجاؤں گا، برباد ہوجاؤں گا۔ صرف ایک لفظ فرمایا: ''تَذَکَّرُوْا ''یعنی توجہ کرلو اور دھیان کرلو، اس بات کا دھیان کرلو کہ ''میرے اللہ نے مجھے اس کام سے منع کیا ہے اور اگر میں یہ عمل کروں گا تو شیطان کی پیروی کروں گا اور میں بھی شیطان کی طرح مستوجبِ عذاب ہوجاؤں گا۔ اس بات کا تصور کر کے اور ہمت کر کے اپنے آپ کو اس گناہ سے روک لو۔

دھیان دو گے تو آنکھیں کھل جائیں گی

آج کل لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کوئی وظیفہ بتا دیجئے۔ جس کے پڑھنے کے نتیجے میں گناہوں کے اندر ابتلاء نہ ہو۔ یاد رکھو! وظیفہ تم چاہے کتنا ہی پڑھ لو، لیکن اگر تمہارے دل میں ہمت اور اہتمام نہیں ہے اور خود تم اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتے تو چاہے تم کتنا بڑا وظیفہ پڑھ لو، کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس گناہ سے بچنے کا وظیفہ صرف یہی ہے کہ یہ دھیان دے دو کہ یہ عمل مجھے جہنم کی طرف لے جا رہا ہے۔ اور جب دھیان دو گے تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ ''فَاِذَاھُمْ مُّبْصِرُوْنَ''

تصوف کا حاصل اور خلاصہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جن کی عمر تصوف کی وادیوں میں گزری اور جنہوں نے تصوف کی بال کی کھال نکالی اور جنہوں نے تصوف کے دقائق اور حقائق کو اس طرح بیان کیا کہ سارے بڑے

بڑے صوفیاء اور تصوف کے بڑے بڑے ماہرین ان کی تردید نہیں کر سکے وہ شخص یہ بات کہہ رہا ہے کہ:

''وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے ''تصوف'' کا، یہ ہے کہ جب کسی اطاعت کی بجا آوری میں سستی ہو۔ اس سستی کا مقابلہ کر کے اس اطاعت کو انجام دے اور جب کسی گناہ کا داعیہ دل میں پیدا ہو تو اس داعیہ کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے۔ بس یہ ''تصوف'' کا حاصل ہے۔ اس سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے باقی رہتا ہے اور اسی سے تعلق مع اللہ ترقی کرتا ہے۔''

اس راہ پر چلنے والا ایسا نہیں کرتا

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ یہ مت سمجھ کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہوں گا اور اپنے آپ کو نفس وشیطان کے دھارے پر چھوڑ دوں گا اور وہ جہاں مجھے لے جائیں گے، میں چلا جاؤں گا اور پھر اپنے بارے میں یہ امید رکھو کہ تم اس راہ کے ''سالک'' ہو اور اس راہ پر چلنے والے ہو۔ نہیں! چلنے والا اس طرح عمل نہیں کیا کرتا۔ اللہ تعالیٰ ہر بندے کے اس کے اختیاری اعمال پر جزا اور سزا کا ترتب فرمائیں گے۔ ''غیر اختیاری'' افعال سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ کے پاس گئے اور اس نے ایک نظر ڈالی اور اس سے انقلاب آ گیا اور بعض مرتبہ ایسا ہوا بھی ہے۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

''حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ابتداء میں بالکل آوارہ، مجذوب تھے اور جنگلوں میں پھرا کرتے تھے۔ ان کے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ایک مرتبہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ ان کے گھر پر آئے۔

ہم پر بھی ایک نظر ڈال دو

جب وہاں آئے اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو دور کھڑے ہو کر ایک شعر پڑھا، شاعر تو تھے:

آں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشم بما کنند

یعنی وہ لوگ جو ایک نظر ڈال کر خاک کو بھی ''کیمیا'' بنا دیتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہو کہ ہم پر بھی ایک نظر ڈال دیں۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شعر سنا تو جواب میں فرمایا ؎

نظر کردم، نظر کردم، نظر کردم

یعنی میں نے نظر کر دی، نظر کر دی، نظر کر دی۔ بس اسی وقت تبدیلی آگئی اور پلٹ گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بہت اونچا مقام عطا فرمایا۔

''نظر ڈالنا'' دھکا لگانے کی طرح ہے

ہمارے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو ہوتا ہے کہ کسی نے

نظر ڈال دی اور نظر ڈالنے کے نتیجے میں ’’غیر اختیاری‘‘ طور پر انقلاب آ گیا۔ یاد رکھیے! ’’غیر اختیاری‘‘ سے کوئی انقلاب نہیں آیا کرتا۔ فرماتے ہیں کہ ’’نظر‘‘ کرنے والے جتنے واقعات ہیں، وہ درحقیقت ابتداء میں ’’دھکا‘‘ لگانے والا عمل ہے۔ جیسے آپ کی گاڑی بند ہوگئی اور وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے، اب اس کو اسٹارٹ کرنے کے لئے دھکا لگانا پڑتا ہے۔ اب دھکے کے نتیجے میں وہ گاڑی تھوڑی سی آگے چلے گی اور چلنے سے انجن کو تقویت ملتی ہے۔ وہ اندر جو اسٹارٹر ہوتا ہے وہ قوت پکڑ لیتا ہے اور انجن اسٹارٹ ہو جاتا ہے۔

’’دھکا‘‘ یہ بھی قیمتی چیز ہے

لہٰذا ’’نظر‘‘ ڈالنے کا حاصل صرف یہ ہے کہ انہوں نے صرف ایک دھکا لگا دیا، لیکن دھکے سے کام نہیں بنتا، اگر گاڑی میں پیٹرول ہی نہیں ہے یا اس کی بیٹری خراب ہے تو ہزار دھکے لگا لو وہ گاڑی نہیں چلے گی۔ لہٰذا کسی بزرگ کی صحبت میں جا کر دھکا تو لگ جاتا ہے۔ اگرچہ وہ دھکا بھی بہت قیمتی چیز ہے۔ اگر دھکا ہی نہ لگے تو چلے گی کیسے؟ لیکن وہ دھکا صرف حرکت دینے کے لئے ہوتا ہے۔ کام آگے خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ خود ہی اس راستے پر چلنا پڑے گا۔ وہ اس طرح کہ اپنے اوپر زبردستی کرنی پڑے گی اور جب یہ تہیہ نہیں کرو گے کہ مجھے اپنے اوپر زبردستی کرنی ہے اور زبردستی کر کے گناہوں کو چھوڑنا ہے اس وقت تک صرف کسی کے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔

شیطان کے سامنے ہتھیار مت ڈال دو

میرے پاس بہت سے متعلقین کے خطوط آتے ہیں جس میں وہ لکھتے ہیں

کہ معمولات کی پابندی نہیں ہوتی، فرصت نہیں ملتی، اوقات ضائع ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھیے! اگر اسی حالت میں رہے کہ تو کبھی بھی فرصت نہیں ملے گی۔ فرصت اس وقت ملے گی جب تم اپنے اوپر زبردستی اور جبر کرو گے۔ جبر کرنے کے نتیجے میں پھر اللہ تعالیٰ آسان فرما دیں گے۔ اس شیطان کے سامنے ڈٹ کر تو دیکھو۔ ہمارا حال یہ ہے کہ شیطان نے ذرا سا کچوکہ لگایا اور ہم پگھل گئے اور اس کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ اس وجہ سے کام نہیں بنتا۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ''تَذَكَّرُوْا'' یعنی توجہ کرو۔ دھیان کرو اور یہ سوچو کہ تم دنیا میں کیوں آئے تھے؟ تمہارے آنے کا کیا مقصد تھا؟ تمہارے مالک نے تمہیں کیوں بھیجا تھا؟ اور تمہارے مالک نے تمہیں کیا ہدایت دی تھی؟ اور اسی مالک کے پاس تمہیں لوٹ کر بھی جانا ہے اور وہاں جا کر مجھے ان جذبات کا جواب بھی دینا ہے جو جذبات میرے دل میں پیدا ہو رہے ہیں؟ ان سب باتوں کی طرف جب دھیان کرو گے تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور شیطان نے جو پردہ ڈال دیا ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔

''ماضی'' یا ''مستقبل'' کی فکر شیطان کا فریب ہے

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بڑی پیاری بات فرمایا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ ''لوگ عام طور پر ''ماضی'' میں یا ''مستقبل'' میں گم رہتے ہیں۔ مثلاً وہ سوچتے رہتے ہیں کہ ماضی میں مجھ سے یہ گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ فلاں گناہ سرزد ہو گیا، فلاں گناہ سرزد ہو گیا۔ میری اصلاح کیسے ہو گی؟ میرے گناہ کیسے معاف ہوں گے؟ میں تو ایسا گناہ گار ہوں، میں تو ایسا خطا کار ہوں۔ دوسرے بعض لوگ ''مستقبل'' کی فکر میں رہتے ہیں، آگے کیسے بڑھوں گا؟ آگے زندگی

کیسے گزرے گی؟ میری اصلاح کیسے ہوگی؟ میرے درجات کیسے بلند ہوں گے؟ حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''ماضی یا مستقبل میں گم رہنا یہ شیطان کا دھوکہ ہے۔''

ماضی کے اعمال کا علاج

ماضی کا علاج یہ ہے کہ ایک مرتبہ دل سے یہ کہہ دو:

''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهُ رَبِّيْ مَن كُلِّ ذَنْب وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ''

جس وقت دل سے یہ کہہ دیا، بس ''ماضی ختم'' اب ماضی کی طرف مت دیکھو، یہاں تک فرمایا کہ ''اگر کسی شخص نے کسی گناہ سے توبہ کر لی ہو تو بعد میں اس گناہ کو یاد بھی نہ کرے کہ میں نے فلاں گناہ کیا تھا، ارے! جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے ''نامۂ اعمال'' سے مٹا دیا، اس لئے کہ توبہ سے صرف یہ نہیں ہوتا کہ بخشش ہو جاتی ہے، بلکہ یہاں ''نامۂ اعمال'' سے مٹا دیا جاتا ہے اور جیسے دنیا کے حسابات میں ''ڈیبٹ اور کریڈٹ'' ہوتا ہے وہاں ''ڈیبٹ اور کریڈٹ'' نہیں ہوگا کہ تم نے اتنی اچھائی کی تھی، اور تم نے اتنی برائی کی تھی اور پھر تمہارا ''بیلنس'' یہ نکلا ہے۔ وہاں ''ڈیبٹ'' نہیں ہے، اس لئے کہ جب تم نے ''استغفار'' کر لیا تو وہ گناہ تمہارے ''نامۂ اعمال'' سے مٹا دیا جاتا ہے۔ لہٰذا کس سوچ میں پڑے ہو؟ ایک مرتبہ دل سے توبہ کر کے فارغ ہو جاؤ اور اس گناہ کو یاد بھی نہ کرو۔ بہر حال! ماضی کا تو اس طرح قلع قمع کر دو۔

''مستقبل'' کا علاج اور ''حال'' کی فکر کرو

''مستقبل'' کا علاج ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جاؤ اور کہو:

رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ

اور اصل میں ''حال'' کی فکر کرو کہ یہ وقت جو گزر رہا ہے یہ ٹھیک گزر جائے۔ یہ ''حال'' اطاعت میں گزر جائے اور معصیت سے بچنے میں گزر جائے، اس کی فکر کرو۔ ''حال'' کی فکر کیا ہے؟ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا (۱)

یعنی جب شیطان تمہیں گناہ کا وسوسہ ڈالے تو ''دھیان کرو فکر کرو یاد کرو'' اور اس گناہ سے بچ جاؤ۔ اس لئے کہ یہی ''حال'' تمہارا ''ماضی'' بن رہا ہے اور جتنے ''مستقبل'' ہیں وہ سب ''حال'' بنتے جا رہے ہیں۔ پھر تمہارا ماضی بھی درست ہو جائے گا اور ''حال'' درست ہو گیا تو ''مستقبل'' بھی درست ہو جائے گا۔

اس لئے اس آیت میں ''تَذَكَّرُوْا'' والی بات ''نکتہ'' کی بات ہے اور عین اس وقت بھی جب شیطان کی طرف سے حملہ ہو رہا ہو اور گناہ کے مواقع سامنے آ رہے ہوں۔ معصیت کے مواقع سامنے آ رہے ہوں، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے مانگ لو اور کہو! یا اللہ! مجھے بچا لینا۔ کم از کم بارگاہ الٰہی میں کہہ تو سکو گے کہ یا اللہ! میں نے آپ سے مانگا تھا اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور مانگتا ہے کہ یا اللہ! میں شیطان سے پناہ مانگتا ہوں اور اس نفس کی شرور سے گناہ مانگتا ہوں اور سچے دل سے مانگتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس گناہ سے بچا لیں گے یا آخرت میں مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۲۰۲،۲۰۱)

صبح اٹھ کر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دو

اور اگر اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنے کے باوجود اور خلوص نیت سے مانگنے کے باوجود بہک گئے اور اپنا ارادہ قوی کرنے کے باوجود بہک گئے تو پھر ان شاء اللہ مواخذہ نہیں ہوگا، کیوں نہیں ہوگا؟ اس لئے کہ پھر ''استغفار'' کی توفیق ہو جائے گی اور ''توبہ'' کی توفیق ہو جائے گی۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ جب صبح دن شروع ہو تو یہ کہو:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱)

اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو اور کہو کہ یا اللہ! میں نے یہ ارادہ تو کر لیا ہے۔ لیکن میں بہت کمزور ہوں۔ پتہ نہیں میں اس ارادے پر قائم رہ سکوں گا یا نہیں؟ یا اللہ! جب گناہ کا موقع آئے تو آپ مجھے بچا لیجئے گا۔

پھر بھی اگر بھٹک جاؤ تو استغفار کر لو

یہ سب کام کرنے کے باوجود پھر بھی بھٹک گیا اور گناہ سرزد ہو گیا تو اس وقت پریشان نہ ہو، اور یہ سوچ کہ تو ''انسان'' بھی تو ہے۔ تجھے غلطی کے لئے ہی تو پیدا کیا تھا، ورنہ فرشتے ہی عبادت کے لئے کافی تھے۔ تو اب تو استغفار کرے گا اور غلطی کا اعتراف کر لے گا اور ہماری طرف لوٹ آئے گا تو ہم تجھے اپنی ''ستاری'' کا اور اپنی ''غفاری'' کا مورد بنائیں گے اور تجھے اس غلطی پر جو غم

---

(۱) ترجمہ: کہہ دو کہ بے شک میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ سورۃ الانعام: آیت (۱۶۲)

ہو رہا ہے، اس کے ذریعہ تیرے درجات اور بڑھادیں گے۔ روایت میں آتا ہے کہ:

"اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ"(۱)

جن کے دل ٹوٹے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔

دل کیسے ٹوٹے ہوتے ہیں کہ وہ یہ سوچتا ہے کہ یا اللہ! میں نے تو ارادہ کیا تھا کہ اب گناہ نہیں کروں گا اور اپنی سی کوشش بھی کر لی، لیکن میں پھر بھی مغلوب ہوگیا۔ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، اے اللہ! مجھے معاف کر دے، جب یہ کہہ دے گا تو پھر اللہ تعالیٰ اس پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ انشاء اللہ! اور اس کو معاف کر دیں گے۔

تمہیں غفّاری اور ستّاری کا مورد بنائیں گے

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (۲)

---

(۱) مأخوذ از الزهد لابن حنبل ص ٦٤ (٣٩١) والمحبة لله لأبی اسحاق الختلی ص ٣٦ (٦٩) والهم والحزن لابن أبی الدنيا ص ٥٦ (٦١)

(۲) ترجمہ: اور یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر کبھی کوئی بے حیائی کا کام کر بھی بیٹھتے ہیں یا (کسی اور طرح) اپنی جان پر ظلم کر گزرتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں کہ اور اس کے نتیجے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہوں کی معافی دے؟ اور یہ اپنے کیے پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے۔ سورۃ آل عمران: آیت (۱۳۵)

اس آیت میں کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمادیا کہ اللہ کے سوا ہے کون جو تیرے گناہ معاف کردے اور جو گناہ کر گزرے ہیں ان پر جانتے بوجھتے اصرار نہ کرے تو پھر تمہیں مخلص بندوں میں شامل کرلیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ہی ''غفاری'' کی صفت کا مورد کسے بنائیں گے؟ ارے بھائی! اس بندے کو بنائیں گے جس سے غلطی ہوئی ہے۔ لہٰذا ایسے بندے کو اللہ تعالیٰ اپنی ''ستاری'' اور اپنی ''غفاری'' کا مورد بنائیں گے۔ اس لئے گناہ ہوجانے کے بعد گھبرانا نہیں، بلکہ توبہ کرلو، استغفار کرلو، ان شاء اللہ معاف ہوجائے گا۔

گناہوں پر ''سینہ زوری'' نہ کرو

لیکن بس! گناہوں پر ''سینہ زوری'' نہ کرو۔ ''وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا'' کے معنیٰ یہ ہے کہ گناہ پر ''سینہ زوری'' نہ کرو۔ سینہ زوری یہ ہے کہ آدمی گناہ کر کے اس کو جواز فراہم کرے کہ سب لوگ یہ گناہ کررہے ہیں، میں بھی کر رہا ہوں۔ دنیا اس راستے پر جارہی ہے، میں بھی جارہا ہوں۔ یہ جواب تقریباً ہر شخص کی زبان پر رہتا ہے کہ: صاحب! ساری دنیا کر رہی ہے، ہم کیوں پیچھے رہ جائیں'' یہ ''سینہ زوری'' ہے۔ لیکن دوسرا شخص وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ''یا اللہ! میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں، تیرا قرب چاہتا ہوں، تیری رضا چاہتا ہوں، اے اللہ! مجھے شیطان سے بچا لیجئے۔ مجھے نفس کے شرور سے بچا لیجئے۔ وہ ذات ''توّاب'' ہے ''ستّار'' ہے وہ ''غفّار'' ہے وہ ان شاء اللہ معاف کردیں گے۔

دعاؤں کا اصل مقصد

بہرحال! یہ جو دعائیں بتائی گئی ہیں، چاہے وہ قرآنِ کریم میں آئی ہوں،

چاہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں آئی ہوں، یعنی دعاءِ ماثور ہوں۔ درحقیقت ان دعاؤں کا اصل مقصد یہ ہے کہ ''بندہ'' کا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق جڑا رہے۔ مثلاً یہی دعا ہے کہ بندہ یہ دعا کرتا رہے کہ:

رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ

دعا کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ بس یہ ایک مرتبہ مانگ کر فارغ ہوجائے، بلکہ اس کے ذریعہ یہ تلقین کی جارہی ہے کہ مانگتے رہا کرو اور جب انسان کو کثرت دعا کی توفیق ہوتی ہے تو پھر اس کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے۔ تعلق مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر اِدھر اُدھر کے خیالات اس کو پریشان نہیں کرتے۔

دل کا مرکز اللہ کی ذات

پھر اصل مرکز یعنی دل کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بن جاتا ہے اور جو دوسرے خیالات کہ مجھے یہ کام کرنا ہے، مجھے یہ کرنا ہے، یہ سب ''تعلق مع اللہ'' کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ:

''اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ وِسَاوِس قَلْبِیْ خَشْیَتَكَ وَذِكْرِكَ''(۱)

اے اللہ! میرے دل میں جو خیالات آرہے ہیں وہ آپ کی

(۱) زهر الفردوس ۲ / ۲٦۰ (٥٧٦)

خشیت اور آپ کے ذکر کے خیالات اور وسوسے آئیں۔

اور جب یہ بنیاد بن جاتی ہے تو پھر اِدھر اُدھر کے خیالات انسان کے دل کا مرکز نہیں بنتے، بلکہ دل کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہی رہتی ہے اور اس کی محبت اور تعلق رہتا ہے اور اس سے دعائیں مانگتا رہتا ہے۔

دل کی سوئی آپ کی طرف

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھانہ بھون جا کر مہینوں رہتے تھے اور رمضان کا مہینہ پورا وہاں گزارتے تھے اور جب کبھی دارالعلوم دیوبند سے چھٹی ہوتی تو آپ تھانہ بھون پہنچ جاتے۔ ایک مرتبہ جب تھانہ بھون سے واپس دارالعلوم آئے تو آپ نے ایک خط میں لکھا کہ: حضرت! کچھ ایسی کیفیت ہوگئی ہے کہ کہیں بھی چلا جاؤں، لیکن دل میں دھیان آپ کی طرف رہتا ہے، جیسے ''قطب نما'' کی سوئی ہمیشہ شمال ہی کی طرف رہتی ہے چاہے اس کو کتنا بھی گھما کر الٹ پلٹ کر لو، میری کیفیت بھی ''قطب نما'' کی سوئی کی طرح ہوگئی ہے۔

بلکہ دل کی سوئی اللہ تعالیٰ کی طرف

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں مبارک باد دی اور پھر فرمایا کہ ''اصل میں یہ رخ میری طرف نہیں، اللہ کی طرف ہے۔'' یہ صورتِ حال ہوجاتی ہے، اب ہمارے دماغ میں خیالات کی ایک رو چل رہی ہے، کبھی اس کا خیال، اور کبھی اس کا خیال۔ لیکن کثرتِ دعا کے نتیجے میں ''خیالات'' کی رو اللہ کی طرف

ہو جاتی ہے اور پھر دل کی سوئی اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے۔

یہ دل اللہ نے اپنے لئے بنایا ہے

یہ دل اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے لئے بنایا ہے، کسی زمانے میں کبھی شعر کہا کرتا تھا تو ایک غزل کا آخری شعر یہ تھا کہ: ''عاصی'' میں نے اپنا تخلص کرتا تھا۔

''عاصی'' متاعِ قلب کو رکھنا سنبھال کے
قسمت سے اس گھر پے دل اس دلربا کا ہے

یہ دل تو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے، اس کو سنبھال کے رکھو، اس کو اِدھر اُدھر نہ لگنے دو۔ دل تو صرف ایک سے لگنا ہے، باقی سب عوارض ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ کیفیت ہمیں بھی عطا فرما دے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

دعا نمبر ۲۴ حصہ دوم

رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيۡنِ، وَاَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ يَّحۡضُرُوۡنِ

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا نمبر ۲۴ حصہ دوم

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ اَمَّا بَعْدُ!

تمہید

بزرگانِ محترم و برادران عزیز! گزشتہ ہفتہ قرآنِ کریم کی ایک دعا کے بارے میں کچھ عرض کیا تھا۔ یہ دعا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھائی، وہ دعا یہ ہے:

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (۱)

اس دعا کے بارے میں کچھ گزارشات گزشتہ مجلس میں پیش کی تھیں۔

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۹۷ و ۹۸)

اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ لیکن اس دعا میں جو معارف واسرار ہیں ان کے سلسلے میں سیری نہیں ہوئی کہ اس دعا میں اللہ تعالیٰ نے کیا ''اسرار وحکم'' رکھے ہیں؟ اور کس طرح ہمیں اس دعا کو سکھایا گیا ہے اور اس میں کیا کیا معنی پنہاں ہیں؟ اس دعا میں آدمی جتنا بھی غور کرے تو اس کے اندر نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

شیطان کا کام ''کچوکے'' لگانا ہے

اس دعا کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اے میرے پروردگار! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان کے کچوکوں سے۔'''' ''ہمزات'' جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے اور وہ شیطان اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ جہاں موقع ملے وہاں کوئی کچوکہ لگا دے۔ ''کچوکہ'' لگانے کا مطلب یہ ہے یا تو انسان کو کسی معصیت اور گناہ کے اندر مبتلا کردے یا کسی نامناسب کام پر آمادہ کردے اور یہ ''کچوکے'' لگتے رہتے ہیں اس لئے کہ شیطان کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ کچوکہ لگائے۔

میں انسان کے منہ میں لگام ڈالوں گا

شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہہ دیا تھا کہ جس آدم (علیہ السلام) کو آپ نے پیدا کیا ہے میں اس کے سامنے سے آؤں گا، اس کے پیچھے سے آؤں گا، اس کے دائیں طرف سے آؤں گا اور اس کے بائیں سے آؤں گا اور ہر طرف سے اس پر حملے کروں گا اور دوسری جگہ یہ الفاظ ہیں:

اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا [1]

بھلا بتاؤ یہ ہے وہ مخلوق جسے تو نے میرے مقابلے میں عزت بخشی ہے۔ اگر تو نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دی تو میں اس کی اولاد میں سے تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب کو جبڑوں میں لگام ڈالوں گا۔

اس آیت میں لفظ ہے ''لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ'' اس کے ایک معنیٰ یہ ہے کہ اس کے منہ میں لگام ڈالوں گا۔ یعنی اس کو اتنا بے بس کردوں گا جیسے اگر گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال دی جائے تو وہ بے بس ہوجاتا ہے اور وہ سوار کے تابع ہوجاتا ہے، اس طرح میں اس کے جبڑے میں لگام ڈال کر اپنے قابو میں کروں گا۔

میں اس سے گناہ کرواتا رہوں گا

اللہ کے سامنے شیطان اتنا بڑا دعویٰ کررہا تھا، اس دعویٰ کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح گھوڑے کے منہ میں لگام ڈال دو تو وہ سوار اس کو جہاں چاہے لئے پھرتا ہے، دائیں طرف موڑنا چاہے گا تو وہ دائیں طرف مڑ جائے گا، بائیں طرف موڑنا چاہے گا تو بائیں طرف مڑجائے گا، اسی طرح میں انسان کو اپنے قابو میں کرلوں گا اور پھر میں اس سے جو چاہوں گا، کراؤں گا۔ مطلب یہ تھا کہ میں ہر وقت انسان کو گناہ اور معصیت کے کچوکے لگاتا رہوں گا، کبھی اس کو گناہ پر

---

(۱) سورۃ بنی اسرائیل: آیت (٦٢)

آمادہ کروں گا، کبھی کسی غلط کام پر آمادہ کروں گا، کبھی کسی نامناسب کام پر آمادہ کروں گا۔

شیطان سے بچنے کا مختصر نسخہ

اللہ تعالیٰ اس کے دعویٰ کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ شیطان تمہیں کیا لگام ڈالے گا۔ میں تمہیں اس کے لگام ڈالنے سے بچنے کا ایک ہتھیار دیتا ہوں وہ یہ کہ تم مجھ سے یہ کہہ دینا کہ:

رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ

یہ ہتھیار تم ہمیشہ ساتھ رکھو اور میری پناہ مانگو، پھر یہ شیطان نہ تمہیں لگام ڈال سکے گا نہ تمہیں گمراہ کر سکے گا۔ بہر حال! شیطان کے حملے سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختصر سا نسخہ بتادیا کہ ہر وقت اپنے پروردگار کی شیطان سے پناہ مانگتے رہو۔ وہ کچوکے تو لگاتا رہے گا، کبھی وہ کسی صریح گناہ کے اندر مبتلا کر دے، تمہارے دل میں ایسی خواہشات پیدا کر دے کہ اس کے نتیجے میں انسان کا دل گناہ کرنے کے لئے مچل رہا ہے اور جب تک وہ اس گناہ کو نہ کر لے، اس وقت تک اس کو چین نہیں آتا۔ یہ سب کرے گا، لیکن جب وہ کرے تو تم کہو: "رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ" صدقِ دل سے کہہ دو۔ انشاء اللہ تم گناہ سے بچ جاؤ گے۔

شیطان کے داؤ کا انداز

کبھی ایسا ہوگا کہ یہ شیطان تمہارے اچھے خاصے نیک اعمال کے اندر تمہیں کچوکے لگائے گا۔ مثلاً تم نماز پڑھ رہے تھے اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لئے پڑھ رہے تھے۔ ایک دم سے یہ کچوکہ لگائے گا کہ فلاں آدمی تمہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ ''رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ''

اچھے عمل پر اپنی تعریف کا خیال

شاید کوئی شخص بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگا کہ اس کے دماغ میں کبھی نہ کبھی یہ خیال آجاتا ہے کہ میں بہت اچھا کام کررہا ہوں۔ یعنی اپنی تعریف اور اپنے کمال کا کچھ خیال دماغ میں آجاتا ہے۔ یہ خیال کہاں سے آتا ہے؟ اگر انسان ذرا بھی عقل سے کام لے تو انسان کی حقیقت کیا ہے؟ چاہے وہ کتنا بڑا متقی ہوجائے، کتنا بڑا عابد اور زاہد ہوجائے، کچھ بھی ہوجائے، لیکن اس کی حقیقت تو ایک ناپاک پانی کا قطرہ ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود اپنے اوپر انسان کو گھمنڈ ہوجاتا ہے کہ ''میں ایسا کام کرتا ہوں'' لوگ میری ایسی تعریف کرتے ہیں۔ یہ جو خیال آرہا ہے، یہ شیطان کا ''کچوکہ'' ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اسی وقت اللہ کی پناہ مانگو، اور کہو:

رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ

مجھے یہ خیال آوے کہ ''میں بھی کچھ ہوں''

اور یہ سوچو کہ یہ اعمال کہاں؟ اور میری حقیقت کیا؟ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو کیا میں یہ عمل کرسکتا تھا؟ اور یہ اپنی بڑائی کا خیال ہر ایک کو آجاتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ بعض اوقات یہ جو دیہاتی لوگ ہوتے ہیں، بعض اوقات ان کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ بڑی سمجھ ڈال دیتے ہیں۔ ایک دیہاتی میرے مرید تھے۔ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک دن آکر مجھ سے کہنے لگے کہ:

حضرت جی! مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ''میں بھی کچھ ہوں'' بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کے نتیجے میں اس کو اتنا ادراک ہوگیا تھا کہ میرے ساتھ کچھ گڑبڑ ہورہی ہے۔ اب وہ ''تکبر'' کا نام نہیں جانتا ''عجب'' اور ''تواضع'' کی اصطلاح سے واقف نہیں۔ لیکن اس دیہاتی کو یہ احساس ہوا کہ مجھے کوئی بیماری لگی ہے، جس کے نتیجہ میں میں اپنے آپ کو کچھ سمجھتا ہوں۔ تو یہ ہر انسان کے دل میں یہ خیال آتا ہے، اس کے مناسب ہوتا ہے۔

مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے'' یعنی شیطان مولوی سے یہ نہیں کہے گا کہ تو فلاں گناہ کرلے یا تو تکبر کرلے ''غرور'' کرلے، ''ریاکاری'' کرلے۔ بلکہ شیطان مولوی کو تاویل سمجھائے گا کہ ارے بھائی! یہ کام ''اخلاص'' ہی سے کررہے ہو۔ اب اگر

اس کام سے تمہارا نام ہوجاتا ہے اور کچھ لوگ اس کام پر تمہاری تعریف کرنے لگتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اگر تم اس کام کا اظہار کرتے ہو تو یہ ''تحدیثِ نعمت'' ہے۔ چنانچہ مولوی یہ سوچتا ہے کہ میں اگر اپنے کسی عمل کی بڑائی بیان کر رہا ہوں تو اس میں کوئی خرابی کی بات نہیں، اس لئے کہ قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۱)

یعنی اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کیا کرو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا نعمت دی ہے، لہٰذا میرا یہ بتانا ''تحدیثِ نعمت'' ہے۔ درحقیقت شیطان نے ''تحدیثِ نعمت'' کی تاویل مولوی کو سمجھا کر ایک ''کچوکہ'' لگا دیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ میں استغفار

میں نے اپنے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ فرما رہے تھے اور حضرت والا کے وعظ عجیب وغریب الہامات ہی ہوا کرتے تھے۔ آپ کے وعظ کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایک ایسی بات ڈال دی جو اس سے پہلے وارد نہیں ہوئی تھی اور اس سے پہلے وہ بات کہیں پڑھی بھی نہیں تھی۔ چنانچہ حضرت والا نے وعظ کے اندر فرمایا کہ:

> ''اب میں ایک ایسی بات کہتا ہوں جو آپ صرف مجھ سے سنئے گا، کسی اور سے نہیں سنئے گا۔ اور میں تحدیثِ نعمت کے

(۱) سورۃ الضحیٰ: آیت (۱۱)

طور پر کہتا ہوں کہ یہ بات آپ صرف مجھ سے سنئے گا، کسی اور سے نہیں۔''

یہ الفاظ کہنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئے۔ اور پھر فرمایا:

''استغفر اللہ! استغفر اللہ! استغفر اللہ! یہ میں نے کیا کہہ دیا یہ تو ''تحدیثِ نعمت'' نہیں ہے یہ تو ''تعلّی'' ہے یہ بڑائی بیان کرنا ہے، میں اس پر استغفار کرتا ہوں۔''

چنانچہ سارے مجمع کے سامنے استغفار کیا اور پھر فرمایا کہ یہ جو کچھ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، میری کیا حیثیت ہے؟ اب دیکھئے! اتنے بڑے صوفی، اتنے بڑے عالم، اتنے بڑے مفسر، فقیہ، محدث، مفتی، لیکن شیطان نے ان کو بھی ''کچوکہ'' لگایا، لیکن انہوں نے اس آیت پر عمل کیا کہ:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ (۱)

کہ ان متقی لوگوں پر جب شیطان وار کرتا ہے تو وہ پھر ایک دم سے متنبہ ہو جاتے ہیں، اور اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اللہ سے تعلق جڑ جانے کے بعد شیطان پسپا ہوجاتا ہے

بہرحال! شیطان کے شر سے اور اس کے کچوکوں سے محفوظ رہنا ہر ایک

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۲۰۱)

بندے کی احتیاج اور ضرورت ہے، اس کے بغیر وہ صحیح طریقے سے زندگی نہیں گزار سکتا اگر وہ اللہ کی پناہ میں نہ آئے، اس لئے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ! شیطان کے کچوکوں سے میری حفاظت فرما۔ ایک انسان اچھا خاصا کام کر رہا ہوتا ہے، لیکن شیطان اس کو ''کچوکہ'' لگاتا ہے، اگر تعلق مع اللہ نہ ہو تو وہ اس کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق انہی اعمال سے جڑتا ہے یعنی دعا سے، شکر سے، استعاذہ سے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض و نیاز سے تعلق جڑتا ہے اور جب یہ تعلق جڑ جاتا ہے اس کے بعد شیطان حملہ بھی کرتا ہے تو وہ پسپا ہو جاتا ہے اور انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

مکّی زندگی میں حضور پر زیادتیاں

یہ آیت اور دعا جس سیاق میں آئی ہے اس کو ذرا اور سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ یہاں پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شیطان کے کچوکوں سے پناہ لینے کے لئے جو فرمایا جا رہا ہے۔ اس کا پسِ منظر یہ ہے کہ مکی زندگی ہے اور کفار کی طرف سے آپ پر اور دوسرے مسلمانوں پر ظلم و ستم ہو رہے ہیں۔ خود نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے کیسے برے ''القاب'' سے پکارا جا رہا ہے، کوئی آپ کو ''جادوگر'' کہہ رہا ہے، کوئی ''شاعر'' کہہ رہا ہے، کوئی مجنون کہہ رہا ہے۔ العیاذ باللہ! پھر وہ کافر معاملہ بھی آپ کے ساتھ اسی طرح کرتا ہے، جیسے کسی مجنون کے ساتھ کیا جاتا ہے یا کسی ''جادوگر'' کے ساتھ کیا جاتا ہے، اوجڑی لا کر رکھ دی یہ سارے معاملات ہو رہے ہیں۔

کفّار کے رویے سے آپ کا دل تنگ ہونا

لیکن آپ بھی آخر انسان ہیں، جو سراپا حق پر ہے، جو حق کی ایک مشعل اور نور ہے، ایسے انسان کو کیسے برے ''القاب'' سے یاد کیا جا رہا ہے اور اس کو کیسی تکلیفیں دی جا رہی ہیں۔ اس موقع پر اس دعا سے پہلے والی آیت نازل ہوئی کہ:

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَةَ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَصِفُوۡنَ، وَ
قُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ (۱)

کفار آپ کو یہ سب تکالیف پہنچا رہے ہیں ظاہر ہے کہ بشری تقاضا سے ان کاموں سے آپ کو تکلیف ہوگی اور ان کاموں سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ یَضِیۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ (۲)

''ہمیں پتہ ہے کہ جب یہ کفار اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو آپ کا دل کتنا تنگ ہوتا ہے۔''

اور بشریت کا تقاضا یہ ہے کہ جو آدمی تکلیف پہنچا رہا ہو اس سے بدلہ لیا جائے اور اس کو بھی کم از کم اتنی ہی تکلیف پہنچا دی جائے اور شریعت نے بھی اتنی تکلیف پہنچانے کی اجازت دی ہے، فرمایا:

فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی

---

(۱) سورۃ المؤمنون: آیت (۹۷-۹۶)
(۲) سورۃ الحجر: آیت (۹۷)

عَلَيْكُمْ (۱)

یعنی جو شخص تمہارے ساتھ زیادتی کرے اتنی ہی زیادتی تم بھی اس کے ساتھ کر سکتے ہو، لیکن اس وقت ہمارا حکم یہ ہے کہ:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةِ

یعنی یہ کفار آپ کے ساتھ جو برائی کر رہے ہیں، آپ ان کا دفاع اچھائی کے ساتھ کیجئے۔ یعنی وہ لوگ آپ کو تکلیف پہنچا رہے ہیں اور آپ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں آپ کو بھی غصہ آنا چاہئے اور غصہ کے نتیجے میں ان کے ساتھ بھی اسی طرح کا سلوک کرنا چاہئے جس سے ان کو تکلیف پہنچے۔ لیکن آپ ایسا نہ کیجئے! بلکہ آپ برائی کا دفاع ''اچھائی'' کے ساتھ کیجئے اور آپ ان کے ساتھ اسی طرح نرمی اور خیر خواہی سے پیش آتے رہیں، جس طرح اب تک آپ پیش آتے رہے ہیں اور ان سے بدلہ نہ لیں، ان پر اپنا ہاتھ نہ اٹھائیں۔ جہاد کی اجازت نہیں، تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں وہ اگر کوڑے مار رہے ہیں تو کوڑے کھا لو اور اگر پتھر مار رہے ہیں تو اس کو برداشت کر لو اور پلٹ کر جواب میں ان کو پتھر مت مارو۔

پہاڑوں کے فرشتے کو آپ کا جواب

اس موقع پر ''ملک الجبال'' پہاڑوں کے فرشتے آپ کے پاس آتے ہیں اور آپ سے عرض کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے آپ پر پتھر برسائے ہیں،

(۱) سورۃ البقرہ: آیت (۱۹٤)

جنہوں نے آپ کے گھٹنے لہولہان کئے ہیں جنہوں نے آپ کو زخمی کیا ہے، اگر آپ فرمائیں تو ہم دونوں پہاڑوں ملا کر ان سب کو تباہ کردیں۔ جواب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں یہ نہیں چاہتا، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرمادے جو دین حق پر ہوں اور ایمان لانے والے ہوں۔ (۱) دیکھئے! اس برائی کا بدلہ اس اچھائی کے ساتھ عطا فرمایا۔

تم ہماری پناہ میں آجاؤ

لہٰذا آپ کو جب کبھی غصہ آئے تو غصہ کے وقت میں برائی کا بدلہ اچھائی سے دیں، غصہ سے نہ دیں، لیکن اس پر عمل کس طرح ہوگا؟ جبکہ سامنے والا شخص تو چڑھا جا رہا ہے اور زبان سے اول فول بک رہا ہے۔ پھر بھی آپ کو غصہ نہ آئے اور آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں یہ کیسے ہوگا؟ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راستہ بتایا کہ تم ہماری پناہ میں آجاؤ اور ہم سے کہو: ''رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ (۲)

ہمیں سب پتہ ہے جو کچھ یہ لوگ آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری ٤ / ١١٥ (٣٢٣١)

(۲) سورۃ المؤمنون: آیت (٩٦)

کوئی ساحر کہتا ہے، کوئی مجنون کہتا ہے وغیرہ اور جب بدلہ لینے کا وقت آئے گا اس وقت ہم دیکھ لیں گے، لیکن آپ کا کام یہ ہے کہ آپ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیں۔

غصہ کے وقت ہم سے پناہ مانگو

جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے اور ساتھ میں یہ دعا سکھائی جا رہی ہے اور پھر اس کا ذکر قرآنِ کریم میں کیا جا رہا ہے تو قرآنِ کریم صرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نازل نہیں ہوا تھا، صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے تو نازل نہیں ہوا تھا بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے پیغامِ ہدایت ہے۔ لہٰذا ان آیات میں ہمیں یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ اگر اس دنیا کے اندر شیطان کے وار اور اس کے ہتھیاروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ تم میری پناہ مانگو اور اس وقت پناہ مانگو جب تمہارے جذبات ابل رہے ہوں، تمہیں غصہ آ رہا ہو اور یہ جذبہ دل میں پیدا ہو رہا ہو کہ میں دوسرے کا منہ نوچ لوں اور دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ میں اس کا ایسا جواب دوں کہ یہ ساری زندگی یاد رکھیں۔

غصہ کے وقت انسان شیطان کے قابو میں

اس لئے کہ جس وقت ''غصہ'' آ رہا ہوتا ہے، اس وقت تم شیطان کے قبضہ میں ہوتے ہو اور شیطان نے جو دعویٰ کیا تھا کہ میں اس انسان کو ''لگام'' ڈال دوں گا ''غصہ'' کے وقت شیطان وہ لگام ڈال دیتا ہے، اس لئے کہ ''غصہ'' میں

انسان اپنے آپے سے باہر ہوجاتا ہے اور شیطان کے قبضہ میں چلا جاتا ہے اور یہ ''غصہ'' درحقیقت شیطان کا ایک زبردست ''کچوکہ'' ہوتا ہے اور اسی وقت بندہ کا امتحان ہے کہ آیا غصہ کی حالت میں اس انسان کے جو نفسانی جذبات ہیں، تقاضے ہیں، مثلاً یہ کہ میں اس کا منہ نوچ لوں، اس کو برا بھلا کہوں، اس کو گالیاں دوں۔ غصہ کے وقت تم ان جذبات کو کسی حد تک قابو کرتے ہو؟ یہی تمہارا امتحان ہے۔ ان جذبات کو قابو کرنے کا راستہ یہ ہے کہ تم میری پناہ میں آجاؤ ۔

غصہ کے وقت ''اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم'' پڑھو

دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (۱)

یعنی جب شیطان کی طرف سے کوئی کچوکہ لگے تو اللہ سے پناہ مانگو۔

یہاں پر بھی غصہ ہی کی بات ہے، اس لئے کہ یہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةِ

کہ برائی کا بدلہ اچھائی سے دو اور اس کا نتیجہ بھی بتا دیا کہ 'فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ''(۲) اس کے نتیجے میں جو شخص تمہارا پکا دشمن تھا وہ بھی ایسا ہوجائے گا، جیسے کوئی گہرا دوست ہو۔ آگے فرمایا:

---

(۱) سورة الاعراف:آیت (۲۰۰)

(۲) سورة الفصلت:آیت (۳٤)

وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا

لیکن یہ صفت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جو ''صبر'' سے کام لے۔

وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ (۱)

ہر ایک کو یہ صفت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیبوں والا ہوتا ہے، لہٰذا تم بھی ''نصیبوں'' والے بن جاؤ۔ وہ اس طرح کہ جب غصہ آئے تو اللہ کی پناہ میں آجاؤ اور کہو کہ یا اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' پڑھو۔

قوم کی بدزبانی کے وقت پیغمبروں کا جواب

کیونکہ ''غصہ'' ایسی چیز ہے کہ اگر یہ اعتدال سے بڑھ جائے تو یہ انسان کو بے شمار بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دیکھئے! تکبر کیوں ہوتا ہے؟ یا تو تکبر منشاء ہے ''غصہ'' کا یا ''غصہ'' منشا ہے ''تکبر'' پیدا کرنے کا۔ جو آدمی متواضع ہوگا وہ کبھی ''غصہ'' نہیں کرے گا اگر وہ بات کرے گا تو دھیمے انداز میں کرے گا۔ پیغمبر سے ان کی قوم کہہ رہی ہے:

اِنَّا لَنَرٰکَ فِیْ سَفَاھَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ (۲)

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ بیوقوف آدمی ہیں اور ہمیں پتہ ہے

---

(۱) سورۃ الفصلت: آیت (۳۵)

(۲) سورۃ الاعراف: آیت (٦٦)

کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔

جواب میں پیغمبر فرماتے ہیں:

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱)

اے میری قوم! میں کوئی بیوقوف نہیں ہوں، لیکن میں پروردگار کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں۔

اس کی گالی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور جب ''غصہ'' آئے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور کہے: یا اللہ! مجھے اس شیطان کے حملے سے بچا لیجئے اور اس کے ''کچوکے'' سے بچا لیجئے۔

غصہ کا علاج

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کو دھیان نہیں رہتا، اس لئے کہا گیا کہ غصہ کے وقت اس جگہ سے ہٹ جاؤ اور اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ، اس لئے کہ غصہ کا معاملہ یہ ہے کہ ''غصہ'' اوپر کی طرف لے جاتا ہے، اگر لیٹے لیٹے ''غصہ'' آگیا تو آدمی ایک دم سے بیٹھ جائے گا اور اگر بیٹھے بیٹھے غصہ آگیا تو وہ ایک دم سے کھڑا ہو جائے گا۔ اس لئے یہ تعلیم دی گئی کہ تم اس کے برعکس کرو اور ''اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ'' پڑھو۔

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۲۰۱)

حضرت کے خادم ''بھائی نیاز'' کا واقعہ

اب یہ غصہ کا علاج میں نے کہہ دیا اور آپ حضرات نے سن لیا۔ لیکن بات تو اس وقت ہے کہ جب یہ موقع آئے تو یہ بات دلنشین ہو اور اس پر عمل کرنے کی نیت بھی ہو، ارادہ ہو اور آدمی اس پر عمل کر کے دکھائے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے بھائی نیاز۔ چونکہ وہ حضرت کے خادم تھے، اس لئے لوگ ان کی ناز برداری بھی کرتے تھے۔ ان کا احترام بھی کرتے تھے، بعض اوقات خانقاہ میں آنے والے لوگوں سے ان کی تلخ کلامی بھی ہوجاتی تھی۔ کسی نے حضرت والا سے ان کی شکایت کی حضرت: یہ بھائی نیاز صاحب، بالکل قابو سے باہر ہیں اور کسی کو بھی اچانک ڈانٹ دیتے ہیں اور آپ کے خادمِ خاص ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو جواب نہیں دیتے۔ ان کے رویہ کی وجہ سے لوگ مشکل میں آجاتے ہیں۔ حضرت والا کو ان پر غصہ آگیا کہ یہ آدمی لوگوں سے لڑتا جھگڑتا ہے۔ حضرت والا نے ان کو بلایا، اور ان سے فرمایا:

''بھائی نیاز! یہ تمہاری کیا حرکت ہے کہ ہر ایک سے لڑتے ہو؟ اور ہر ایک کو ڈانٹ دیتے ہو؟''

بھائی نیاز حضرت کی ڈانٹ سے گڑبڑا گئے اور اس گڑبڑاہٹ میں جواب دیا کہ:

حضرت: جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔

دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے آپ سے شکایت کی ہے، وہ جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں۔ لیکن انہوں نے براہِ راست یہ کہہ دیا کہ

حضرت! جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔ ان کا یہ جملہ سنتے ہی حضرت کا ذہن اس طرف متوجہ ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ وہ یہ کہ میں نے یک طرفہ بات سن کر ان کو ڈانٹنا شروع کردیا۔ پہلے ان سے پوچھنا تو چاہئے تھا کہ مجھے یہ خبر ملی ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ دوسرے فریق کا بیان سنے بغیر میں نے ڈانٹنا شروع کردیا۔ یہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔

اللہ کی حدود کے آگے رک جانے والے

چنانچہ جب بھائی نیاز نے جس وقت یہ کہا کہ ''حضرت! جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو'' آپ ''استغفر اللہ! استغفر اللہ!'' کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

''کان وقافا عند حدود اللہ''

یعنی اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود پر کھڑے ہوجانے والے، جو غصہ آرہا تھا ایک دم سے ختم کردیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ یہ درحقیقت اس ''ریاضت'' کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ہر وقت پناہ مانگنے کی دعا کی تھی کہ یا اللہ! یہ شیطان میرے ساتھ لگا ہوا ہے اور یہ کسی وقت بھی مجھے کچوکہ لگا سکتا ہے، کسی وقت بھی میرے اوپر حملہ کرسکتا ہے میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں، تو آدمی اللہ جل جلالہ سے اس طرح کا تعلق قائم کرتا ہے تو وہ تعلق انسان کو اس قسم کے حملوں سے بچاتا ہے، اور اگر حملہ ہو بھی جائے تو اس کا تدارک کرنے کی بھی توفیق ہوجاتی ہے۔

شیطان کے دو ہتھیار

بات یہ ہے کہ انسان کے اندر دو مادے اللہ تعالیٰ نے ایسے رکھے ہیں جو شیطان کے ہتھیار ہیں : ۱۔شہوت، ۲۔غضب، جن کے ذریعے وہ ہمیں مغلوب کرتا ہے، جب بھی ان میں سے کوئی صفت یا ان میں سے کوئی شیطان کا کچوکا لگے تو پھر فوراً اس کا علاج یہ ہے کہ

رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ، وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ

پڑھ لے، ایسا کرے گا تو انسان ہمیشہ اللہ کی پناہ میں رہے گا۔ پناہ میں رہنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ یا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس برے کام سے بندے کو روک لیں گے، اور اگر فرض کرو مبتلا ہو بھی گیا تو ان شاء اللہ توبہ و استغفار کی توفیق بھی دیں گے اور اس صورت میں جو شیطان کا کچوکا تھا اس کا علاج ہوجائے۔تو آدمی اگر اللہ کی پناہ میں رہے تو گھاٹا کسی میں نہیں، اس حالت میں کسی وقت پاؤں بھی پھسل گیا تو انہوں نے ہاتھ تھاما ہوا ہے، پناہ دے رکھی ہے، ہاتھ تھاما ہوا ہے، پھسلنے کے نتیجے میں پھر اٹھ کھڑا ہوگا۔

لیکن آدمی غفلت میں رہے اور کبھی اللہ کی پناہ نہ مانگے تو شیطان نے تو لگام ڈالنی ہی ہے، وہ آکر کبھی یہ کچوکا لگائے گا، کبھی وہ کچوکا لگائے گا، کبھی خواہشات پیدا کرے گا کہ میں فلاں جگہ نظر لگالوں، سوچ کے گناہ میں مبتلا کردے گا، کبھی زبان کے گناہ میں مبتلا کردے گا، کبھی کان کے گناہ میں مبتلا کردے گا اور جب مانگ مانگ کر اللہ کی پناہ میں آجائے گا تو ان لوگوں کی

فہرست میں داخل ہو جائے گا، جن کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ: ''اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا''[1] کہ جب ان پر شیطان کا حملہ ہوتا ہے تو یہ ایک دم سے ہوش میں آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں انہی میں سے بنا دے آمین۔

اللہ سے تعلق مضبوط کرنے والے چار اعمال

لیکن ہم ان لوگوں میں سے اس وقت بنیں گے جب ہم اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کریں۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے اگر انسان ان چار اعمال کی مشق کرلے اور پابندی کر لے تو یقیناً اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو جائے گا:

① نمبر ایک ماضی پر استغفار۔ یعنی ماضی میں مجھ سے جو کچھ ہوا اے اللہ! میں اس پر آپ سے مغفرت مانگتا ہوں۔

② نمبر دو حال میں شکر یا صبر۔ یعنی اچھا حال ہو تو اس پر شکر ادا کرو۔ چھوٹی خوشی حاصل ہو یا بڑی خوشی حاصل ہو، ہر ایک پر ''الحمد للہ'' کہنے کی آدمی رٹ لگا لے۔ خود شیطان نے کہا تھا کہ میں کسی انسان پر حملہ کروں گا تو اس کے پاس دائیں طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے اور پیچھے سے آؤں گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:

لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ[2]

---

(۱) سورۃ الاعراف: آیت (۲۰۱)

(۲) سورۃ الاعراف: آیت (۱۷)

کہ آپ اکثر بندوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کے حملوں کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو ''شکر گزاری'' سے نکال دے وہ اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا نہ کرے، لہٰذا ہمیشہ اچھی حالت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

③ نمبر تین اور اگر حالت بری ہے، ناگوار حالت ہے تو اس وقت ''صبر'' کرو اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہو۔

④ نمبر چار یہ ہے کہ آئندہ کے لئے ''استعاذہ'' کرے۔ اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔

اگر آدمی یہ چار کام کر لے تو اس کا کوئی لمحہ بھی ان چاروں میں سے کسی ایک کے کرنے سے خالی نہیں جائے گا۔ اگر انسان یہ چار کام کر لے گا تو اس سے اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوگا اور تعلق مضبوط ہونے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل ہوگی اور پناہ حاصل ہونے کے نتیجے میں شیطان آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا

شیطان کی چالیں درحقیقت کمزور ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا بنالے، اپنے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط فرمالے تو ان شاء اللہ کہیں گھاٹا نہیں، اسی کی پناہ میں، پناہ کے شامیانے میں، سائبان میں جب تک اس سے تعلق رکھے ہوئے ہیں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اللہ تعالیٰ اپنی

رحمت سے ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

یہ سب باتیں مشق سے آئیں گی، یعنی کہہ تو میں دیا، سننے والے نے سن لیا، لیکن یہ سب زندگی کا نصب العین بنے گی اس وقت جب آدمی اپنی زندگی میں اس کی مشق کرے، اور مشق کرنے سے ہی یہ چیز پھر پختہ ہوجاتی ہے، شروع میں آدمی سوچے گا ہے تو معاملہ آسان، دل ہی دل کی باتیں ہے نا۔

وہی کر رہے ہیں دل سے دل کی باتیں
انہی کا زباں پر کلام آرہا ہے

ہے تو یہ، لیکن مشق سے ہوتا ہے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اس کی مشق کی جائے، اللہ کے ذکر کی، اللہ تعالیٰ سے تعلق کی، اس کی نعمتوں پر شکر کی، صبر کی، استعاذے کی اور استغفار کی تو ان شاء اللہ یہ ساری چیزیں حاصل ہوجائیں گی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

تصانیف
حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

اصلاحِ معاشرہ

- ☆ اصلاحی خطبات (کامل سیٹ)
- ☆ خطبات عثمانی (کامل سیٹ)
- ☆ اصلاحِ معاشرہ
- ☆ آسان نیکیاں
- ☆ نشری تقریریں
- ☆ ذکر و فکر
- ☆ مواعظ عثمانی (موضوع وار مجموعہ)
- ☆ حقوق العباد و معاملات
- ☆ خاندانی حقوق و فرائض
- ☆ اپنے گھروں کو بچایئے
- ☆ اسلام اور ہماری زندگی
- ☆ The Language of Friday Khutbah
- ☆ Radiant Prayers
- ☆ Spritual Discourses
- ☆ Discourses on Islamic Way of Life
- ☆ اصلاحی مواعظ (کامل سیٹ)
- ☆ اصلاحی مجالس (کامل سیٹ)
- ☆ فرد کی اصلاح
- ☆ پُرنور دعائیں (دورنگہ)
- ☆ نمازیں سنت کے مطابق پڑھئے
- ☆ ارشادات اکابر
- ☆ حدود آرڈیننس ایک علمی جائزہ
- ☆ خاندانی اختلافات کے اسباب اور ان کا حل
- ☆ معاشرتی حقوق و فرائض
- ☆ قتل اور خانہ جنگی کے بارے میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات
- ☆ مناجات مقبول (قرآنی آیاتوں کی تشریح)
- ☆ Easy Good Deeds
- ☆ Perform Salah Correcly
- ☆ The Sanctity of Human Life in the Quran & Sunnah

ردِّ عیسائیت/قادیانیت

- ☆ بائبل سے قرآن تک (کامل سیٹ)
- ☆ بائبل کیا ہے؟
- ☆ قادیانی فتنہ اور ملت اسلامیہ کا موقف
- ☆ Qadianism On Trail
- ☆ عیسائیت کیا ہے؟
- ☆ ما هي النصرانية؟ (عربی)
- ☆ What is Christanity?

سفرنامے

- ☆ جہاں دیدہ (بیس ملکوں کا سفرنامہ) (دورنگہ)
- ☆ دنیا مرے آگے (سفرنامہ) (دورنگہ)
- ☆ سفر در سفر (سفرنامہ) (دورنگہ)
- ☆ البانیہ میں چندروز
- ☆ اندلس میں چندروز

متفرق

- ☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق (دورنگہ)
- ☆ تراشے (دورنگہ)
- ☆ گوشۂ تنہائی
- ☆ یادیں
- ☆ تبصرے
- ☆ تقلید کی شرعی حیثیت
- ☆ Islamic Months
- ☆ The Legal Status of Following a Madhab

سوانح۔تذکرے

- ☆ میرے والد میرے شیخؒ
- ☆ مآثر حضرت عارفیؒ
- ☆ اکابر دیوبند کیا تھے؟ (دورنگہ)
- ☆ نقوشِ رفتگاں (دورنگہ)
- ☆ تذکرے
- ☆ البلاغ عارفیؒ نمبر
- ☆ البلاغ مفتی اعظمؒ نمبر
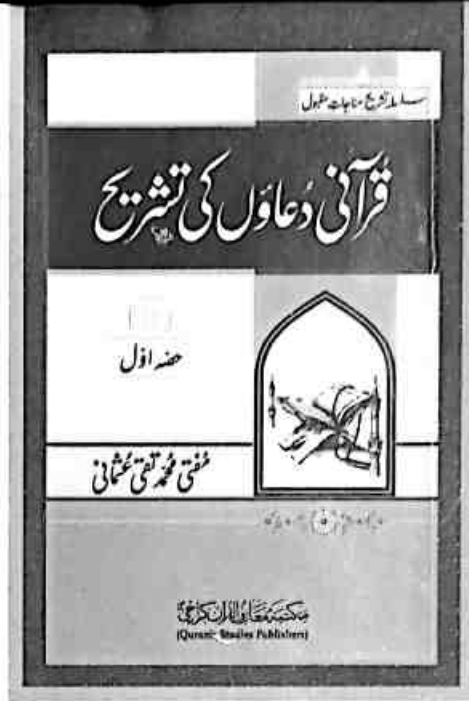
اس کتاب کے بارے میں۔۔۔۔

میرا مالک دعا کو بہت پسند کرتا ہے۔۔۔ اور ہمیں دعا کرنی بھی نہیں آتی، اس لئے دعا کرنے کا سلیقہ اور طریقہ بھی اللہ تعالی سے مانگنا چاہیئے۔ اور ہمیں اس کی بھی تمیز نہیں کہ کیا چیز مانگیں اور کیا چیز نہ مانگیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان جائیے کہ آپ نے ہمیں دعا کرنا سکھا دیا۔۔۔ ان دعاوں میں دنیا اور آخرت کی تمام کامیابیاں مضمر ہیں، یہ دعائیں ایک پیغمبر ہی مانگ سکتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے وحی کے ذریعہ وہ دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی ہیں۔۔۔ ہمارے یہاں دعاوں کے مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہوتے ہیں، جیسے الحزب الاعظم ہے۔ ان میں سب سے زیادہ جامع مجموعہ الحصن الحصین ہے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا مرتب کردہ مجموعہ مناجات مقبول کے نام سے مشہور ہے۔۔۔۔ یہ انہی قرآنی دعاوں کی تشریح پر مشتمل ہے۔